فیضِ عشق
امجد جاوید

فیضِ عشق

امجد جاوید

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون: 37232336 - 37352332

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	....	فیضِ عشق
مصنفہ	....	امجد جاوید
ناشر	....	گل فراز احمد
		علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	....	شیر محمد طاہر
کمپوزنگ	....	اکرم، انیس احمد
سن اشاعت	....	فروری 2013ء
قیمت	....	=/400 روپے

ملنے کا پتہ.........

علم وعرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

حویلی میں سناٹا معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔فضا میں وہی خوف سے بھری ہوئی فرماں برداری کا تاثر گھلا ہوا تھا۔یوں لگ رہا تھا کہ حویلی بھی روایت میں جکڑی ہوئی لرز رہی ہے کہ اگر یہ خاموشی ٹوٹ گئی تو نجانے کون سا طوفان آ جائے گا۔خاموشی دم سادھے ہوئے تھی۔حویلی کے صاف ستھرے در و بام پہ خاموشی خوف سے یوں چپکی ہوئی تھی جیسے سانس بھی لے گی تو مر جائے گی۔انہی حبس زدہ لمحات میں نادیؔ بہت گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ہر آتی جاتی سانس میں نفرتوں، محرومیوں اور اداسیوں کی خراشیں اسے بے چین کیے دے رہی تھیں۔یہ ایسے ہی کھردرے لمحات ہوا کرتے تھے کہ جب زندگی بارے نہ چاہتے ہوئے بھی جمع تفریق کرنے لگتی۔کیا کھویا، کیا پایا کا حساب تو چلتا ہی تھا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ لاشعوری طور پر حویلی کے اندر موجود دنیا اور حویلی سے باہر کی دنیا کے بارے میں تجزیہ کرنے لگتی۔جو اس سے کبھی ہو ہی نہیں سکا تھا۔تجزیہ یا موازنہ تو اسی وقت ہو پاتا ہے نا جب ان ساری چیزوں کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہو جن کا تجزیہ یا موازنہ کیا جانا ہو۔اسے تو باہر کی دنیا کے بارے میں تجربہ ہی نہیں تھا۔وہ اپنی پوری زندگی میں حویلی کی ان اونچی اونچی دیواروں کے پار محض چند بار ہی جا سکی تھی۔یہ آزادی اسے بچپن اور لڑکپن کے درمیانی دور ہی میں کبھی ملی تھی۔جس کی یادیں بہت دھندلی سی تھیں۔پھر جیسے ہی اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا، روایت کی ان دیکھی زنجیروں سے اسے یوں باندھ دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر پاتی تھی۔اس کے اردگرد حصار یوں تن گیا کہ باہر کی خوشگوار فضا بھی اس کے کمرے میں آنے سے گھبراتی تھی۔وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی حویلی کی دیواروں کے درمیان چند مخصوص جگہیں تھیں، جہاں وہ آ جا سکتی تھیں۔مردان خانے کی طرف تو وہ رخ بھی نہیں کر سکتی تھی۔زنان خانہ، جو نچلی منزل کے کمروں، دالانوں اور پائیں باغ پر مشتمل تھا۔یا پھر اوپری منزل پر موجود چند کمرے۔جن کی چھت پر جانے کی قطعاً اجازت نہیں تھی کہ جہاں تک جا کر وہ کھلے آسمان کو محسوس کر سکتی۔ان ساری جگہوں پر حویلی کی دوسری خواتین بھی ہوتی تھیں۔مگر اس کی جائے پناہ تو محض ایک کمرہ تھا، اوپری منزل پر جو کبھی اس کے والدین کا ہوا کرتا تھا۔اس کا زیادہ وقت اپنے ہی کمرے میں گذرتا۔یا پھر کمرے کی وہ واحد کھڑکی جہاں سے کچھ منظر اسے دکھائی دیتا تھا۔

اس دن بھی اس کے اندر حبس بہت بڑھ گیا تھا۔شاید اس کی آنکھوں میں ساون بھادوں اتر آیا مگر ایسے موسم کو خود اس نے آپ روکا ہوا تھا۔وہ نادیؔ کی سالگرہ کا دن تھا۔ہر برس وہ خود اپنی سالگرہ کا اہتمام خود ہی بڑے چاؤ سے کیا کرتی تھی۔لیکن اس بار تو نادیؔ نے خود ہی دلچسپی نہیں لی تھی۔کیونکہ اس بار اس کے اندر ان باغیانہ خیالات نے سر اٹھا لیا تھا۔جس سے وہ کبھی کبھی خود ڈر جایا کرتی تھی۔اس دن سے ہی نہیں پچھلے کئی دنوں سے وہ انہی باغیانہ خیالات سے لڑتی چلی آ رہی تھی۔اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار کر دیا تو وہ ہار جائے گی۔یہ اس کا اپنا آپ بھی ہو سکتا ہے یا زندگی کی بازی ہو سکتی ہے۔روایت کی ان دیکھی زنجیروں میں مزید اضافہ بھی ممکن تھا۔سو وہ اپنے آپ کو یہی دلیلیں دے کر مطمئن کرتی رہی کہ دیکھوں تو سہی کہ حویلی کے دوسرے مکین اس کی سالگرہ کا دن یاد بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اِس حویلی میں اُس کی اہمیت کس قدر ہے؟ یہ تقریب بھی کیا ہوا کرتی تھی محض گنتی کے چند لوگ، کیونکہ حویلی کی روایات میں سالگرہ جیسی تقریب منانا کبھی شامل ہی نہیں تھا۔یہ تو اس کے مرحوم والدین نے ایک بار اس کی سالگرہ منائی تھی۔ممکن ہے اپنی خوشی کی خاطر یا پھر خدا جانے کیوں؟ وہ بھی حویلی کے محدود افراد کے ساتھ۔پھر

وہ تو نہ رہے، اس کی دادی ہر برس اس کی سالگرہ مناتی رہی۔لیکن اس قوت جب اسے شعور نہیں تھا اور شعوری طور پر وہ اپنی دادی اماں کے باعث ہی سالگرہ مناتی آئی تھی۔اتنی سی اجازت بھی اسے کیوں کر مل گئی؟ اس کی سمجھ میں تو یہی وجہ آئی تھی کہ وہ بن ماں باپ کے ان کے ساتھ پرورش پا رہی تھی۔اس کی دادی ہی اس کا سب کچھ تھی۔یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار نہیں کر پا رہی تھی کہ اس کے سامنے اپنی دادی کا معتبر چہرہ تھا۔اس سے تو کسی نے نہیں پوچھنا تھا مگر جوابدہ تو اس کی دادی اماں تھی۔اس کے ذہن میں بے شمار سوال تھے۔جو اس کی باغی سوچوں کی بنیاد بن گئے ہوئے تھے۔دھیرے دھیرے ان پر شکوک وشبہات سے مزین الجھنوں کا محل تعمیر ہوتا چلا جا رہا تھا۔شاید یہ تعمیر رک جاتی اگر اسے ان سوالوں کا جواب کہیں سے مل جاتا۔اس الجھے ہوئے دن میں وہ خود پر قابو پائے ہوئے اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے لگی کھڑی تھی اور مسلسل یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ یہ دن کیسے گذرے گا۔یہ اتنا طویل کیوں ہوگیا ہے؟

نادیٓ کے کمرے سے باہر کے سارے منظر سہ پہر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں ڈوبے ہوئے تھے۔حویلی سے پار، اونچی دیوار سے کافی حد تک ہٹ کر کھیت تھے۔ان سے کچھ آگے کافی فاصلے پر بستی تھی جس کے کچے پکے گھروں کی چھتیں ہی وہ دیکھ سکتی تھی۔نیلا آسمان، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے اور درخت ہی اسے دکھائی دیتے۔بعض درخت تو اس کے ساتھ ساتھ بڑھ کر تناور ہو گئے تھے اور کئی سوکھ کر ختم ہو گئے تھے۔وہ ان مناظر کو اس قدر دیکھ چکی تھی کہ ان میں کوئی نیا پن محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ہاں اگر کوئی تبدیلی ہوا کرتی تھی تو یہ کہ کھیتوں میں فصلیں بدل جایا کرتی تھیں۔اگتی، کٹتی فصلوں کو دیکھتی رہ جاتی یا پھر طلوع آفتاب کا منظر، جو کبھی ایک جیسا نہیں ہوتا تھا۔ہر روز سورج ایک نئے منظر کے ساتھ اُگتا۔یہ اس نے تجربہ کرلیا تھا مگر یہ الجھن ضرور تھی کہ کیا سورج غروب بھی ایک نئے منظر کے ساتھ ہوتا ہے؟ کیونکہ وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو اپنی کھڑکی سے دیکھ نہیں سکتی تھی۔وہ باہر کی دنیا اس کھڑکی سے دیکھ سکتی تھی یا پھر دادی اماں سے ہونے والی گفتگو میں، جس میں ہمیشہ خوف ہی ہوتا۔ڈرا دینے والی نصیحتیں ہوتیں۔اسے تو لفظوں سے دیکھے جانے والی دنیا ہی پیاری لگتی تھی۔لفظ اسے خود میں جذب کر لیتے، ایک ہی منظر کو وہ خود ہی کئی بار دیکھ لیتی جو لفظوں سے بنائے گئے ہوتے تھے۔کتابوں اور رسالوں کے جھروکوں سے وہ ایک نیا جہاں دریافت کر چکی تھی۔جو کچھ ان کتابوں اور رسالوں میں سے دنیا اسے سمجھ میں آئی، وہ اس کے لیے کسی بھی ونڈر لینڈ یا گم گشتہ جنت سے کم نہیں ہوتی تھی۔شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا ذہن حویلی کی روایت بھری زندگی کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مجبور محض ہے، ابھی وقت اس کے ہاتھوں میں نہیں تھا۔

''اے نادیٓ۔!''

فرح کی آواز پر وہ بے ساختہ چونک گئی۔پھر اس کے چہرے پر حیرت دیکھتے ہوئے بولی

''ہاں، کیا بات ہے؟''

وہ اس قدر اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ فرح کے آنے کا احساس ہی نہیں وہ سکا۔

''لو۔!مجھ سے پوچھ رہی ہو۔جیسے خود تو اب زادی کو پتہ ہی نہ ہو۔'' فرح نے حیرت سے پوچھا، پھر اس کی طرف دیکھ کر حیرت ناک انداز میں بولی ''ہائے۔!تم ابھی تیار بھی نہیں ہو؟'' تب وہ اس کے سوال پر خیالوں نے نکلتے ہوئے چونک گئی۔پھر جیسے ہی فرح کے پوچھے گئے سوال پر غور کیا تو وہ خوشگوار حیرت میں ڈوب گئی۔اس لیے نہ سمجھ آنے والے انداز میں پوچھا۔

''کیوں، میں نے کیوں تیار ہونا تھا؟''

''ارے واہ۔! کیا شانِ بے نیازی ہے، حور شمائل کو جیسے معلوم ہی نہیں کہ آج تمہاری سالگرہ کا دن ہے۔تم چاہے بھول جاؤ، مگر میں نے سارا اہتمام کرلیا ہے۔''

وہ یوں چہکتے ہوئے بولی جیسے یہ اہتمام اس نے اپنے لیے کیا ہو۔ تب اس نے حیرانگی سے پوچھا

''تم، فرح تمہیں میری سالگرہ کا دن یاد تھا؟''

''اچھی طرح یاد تھا۔ بلکہ میں تو دعائیں مانگ رہی تھی کہ تمہیں اپنی سالگرہ کا دن یاد نہ آجائے، اس لیے میں نے چپکے چپکے یہ سارا اہتمام کرلیا۔؟''

وہ خوشی سے لہکتے ہوئے بولی تو نادیؔ نے اس کا مان رکھتے ہوئے جھوٹ بول دیا

''ہاں۔! مجھے یاد نہیں تھا۔''

''ہاں نادیؔ۔! یہی تو ایک دن ہوتا ہے، جس میں ہماری اپنی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے تو خیر اجازت نہیں، تمہاری وجہ ہی سے میں خوش ہو لیتی ہوں۔'' فرح کہتے کہتے ایک دم سے اداس ہوگئی۔ پھر تیزی سے اپنا سر جھٹک کر بولی۔ ''بس تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، امی اور دادی اماں دونوں ہی تمہارا نیچے انتظار کر رہی ہیں۔ جلدی سے تیار ہو کر نیچے آجا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرادی۔ فرح کی دھوپ چھاؤں جیسی کیفیت دیکھ کر اس کے من میں خوشی در آئی۔

''تم چلو، میں ابھی آتی ہوں۔''

نادیؔ نے ایک جذب سے کہا تو فرح پلٹ گئی۔ پھر رک کر جاتے جاتے وہ کہتی چلی گئی۔

''میں نے بابا سائیں سے بھی عرض کر دیا تھا۔ وہ بھی آنے والے ہوں گے۔ جلدی سے آجا۔''

''آجاتی ہوں۔''

نادیؔ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ پھر اچانک ہی اس نے فیصلہ کرلیا۔ وہ تو نہیں چاہتی تھی کہ اس بار اپنے خیالات اور سوچوں کا اظہار کرے، مگر قدرت شاید ایسا چاہتی ہے۔ ورنہ اگر اس نے اہتمام نہیں کیا تھا تو فرح یوں نہ کرتی۔ اب تو چاہے بھونچال آجائے یا طوفان، وہ اپنا مطالبہ ضرور کہے گی۔ یہ جو نہ چاہتے ہوئے بھی اہتمام ہو گیا ہے تو یہ اشارہ ہے۔ تاکہ وہ اپنے دل کی بات کہہ دے۔ فیصلہ کرتے ہی وہ کھڑکی سے پلٹ گئی کیونکہ اسے تیار ہو کر پیر سائیں کے آنے سے پہلے پہنچنا تھا۔

پورے برس کے دورانیے میں نادیؔ کے لیے مختص یہی ایک چھوٹی سے تقریب ہوا کرتی تھی، جس میں اس کے چاچا دلاور شاہ المعروف پیر سائیں خصوصی طور پر شرکت کیا کرتے تھے۔ ورنہ تو کئی مہینے گذر جاتے اور وہ ان کی صورت نہیں دیکھ پاتی تھی۔ نادیؔ کا تعلق ایک ایسے پیر گھرانے سے تھا جو اپنی ان روایات پر سختی سے پابند تھا جو انہیں اپنے پرکھوں سے ورثے میں ملیں تھیں۔ یہ روایات کچھ ایسی تھیں کہ جن کے باعث حویلی کی خواتین نہ تو اپنی کوئی حیثیت رکھتی تھیں اور نہ انہیں کسی قسم کا کوئی اختیار تھا۔ حویلی کی چاردیواری کے حصار میں ہی وہ پابند رہتی تھیں۔ پردہ داری کی اس

قدر پابندی تھی کہ سورج کی کرنیں بھی انہیں نہ دیکھ سکیں۔ وہ اگر سانس بھی لیتیں تھیں تو گھرانے کے اس سربراہ کی اجازت سے جو ایک روحانی پیشوا ہوتا تھا۔ وہ دربار شریف کا گدی نشین ہونے کے باعث تمام تر فیصلوں کا مجاز تھا۔ وہ فیصلے حویلی کے ہوں، دربار شریف کے ہوں یا کسی کی زندگی موت کے۔ سارے معاملات کا محور یہی پیر سائیں ہی ہوتے تھے۔ مریدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جن سے وہ ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے۔ کون ان کے پاس آ رہا ہے تو کسی کے ہاں یہ جا رہے ہیں۔ ایک نیٹ ورک تھا جسے وہ بخوبی چلا رہے تھے۔ نادیؔ کے دادا کے بعد اس کے باپ نے گدی نشین ہونا تھا ۔ مگر ایک دن قریبی شہر سے واپس آتے ہوئے وہ اپنی بیوی سمیت کار حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ نادیؔ کے ذہن میں ہمیشہ یہ سوال رہا تھا کہ اس کی والدہ کس کی اجازت سے اور کیوں اس کے باپ کے ساتھ حویلی سے باہر تھی کہ حادثے کا شکار ہو گئی۔ آج تک وہ یہی معمہ حل نہیں کر پائی تھی۔ سوال تو ڈھیروں تھے، جیسے ایک یہ سوال کہ حویلی کی خواتین کبھی جب چاہے دربار شریف پر حاضری کے لیے چلی جایا کرتی تھیں۔ پھر انہیں روک کیوں دیا گیا؟ یہ واحد آزادی بھی ان سے کیوں چھین لی گئی تھی؟ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ کیا تھی؟ اسے آج تک سمجھ نہیں آیا تھا اور نہ ہی معلوم ہو سکا تھا۔ شاید وہ بھی زندہ نہ رہتی اگر وہ کار حادثے والے دن اپنی دادی اماں کے پاس نہ ہوتی۔ ورنہ وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ زندگی ہار جاتی۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ وہ بھی انہی کے ساتھ اس دنیا سے چلی جاتی۔ ایسے وقت میں کہ جب اسے کسی شے کا بھی شعور نہیں تھا۔ قدرت کو اس کی زندگی منظور تھی۔ دادی اماں نے اسے سنبھالا اور جہاں تک ہو سکا، اسے لاڈ پیار سے پالا۔ دادا کے بعد جب اس کے چاچا دلاور شاہ گدی نشین ہوئے تو ان کی بیوی زہرہ بیگم پر پابندیاں کچھ زیادہ ہی ہو گئیں۔ حالانکہ اس وقت وہ ایک بیٹے ظہیر شاہ اور بیٹی فرح کی ماں تھی۔ یوں وہ چاروں خواتین حویلی کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ وہ ایک دوسری کے بارے میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموش تھیں، کیونکہ اسی میں ان کی بقا اور اسی میں ہی ان کی پناہ تھی۔

ظہیر شاہ کی تربیت پیر سائیں اپنی نگرانی میں کر رہا تھا۔ اسے خوب تعلیم دلوائی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا گیا تھا۔ مگر نادیؔ اور فرح کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، یہ تو نادیؔ جب ذرا باشعور ہوئی تو اس نے اپنی دادی سے مطالبہ کر دیا کہ اسے بھی ظہیر شاہ کی مانند تعلیم دلوائی جائے۔ دادی اماں کے لئے یہ مطالبہ کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے باقاعدہ کسی ادارے میں پڑھنے کے لیے تو نہ بھجوا سکی لیکن بہت ساری بحث وتمحیص کے بعد حویلی ہی میں ایک خاتون ٹیچر کا انتظام کر دیا گیا۔ جو انہی کے مریدین میں سے ایک تھی۔ اس نے نہایت سعادت مندی سے اور ثواب سمجھتے ہوئے، ان دونوں کو پڑھایا۔ یوں فرح اور نادیؔ نے حویلی کی ہی چار دیواری میں میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی۔ پیر سائیں اتنی طاقت اور تعلقات رکھتا تھا کہ بورڈ کے پرچے حویلی ہی میں حل کر لیے گئے تھے۔ ایک پورا گاؤں پیر سائیں کی جاگیر تھا۔ نادیؔ نے جتنی دلچسپی سے اپنی کورس کی کتابیں پڑھی تھیں، اتنی ہی پسندیدگی سے دیگر کتابیں اور رسالے بھی پڑھے تھے۔ جن کے پڑھتے رہنے سے اب اسے "ہوکا" لگ چکا تھا۔ اس نے حویلی ہی میں موجود ایک خاتون ملازمہ تاجاں مائی کے ذریعے ایسا راستہ پیدا کر لیا تھا کہ جہاں سے وہ باہر کی دنیا سے جو چاہتی منگوا لیا کرتی تھی۔ اس کی اس جرات کا علم اس کی دادی کو تھا جسے وہ نظر انداز کرتی چلی آ رہی تھی۔ حویلی کی ان چاروں خواتین کی اپنی اپنی دنیا تھی۔ جس میں وہ سمجھوتے کے ساتھ زندگی گذارتی چلی جا رہی تھیں۔ کوئی کسی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

☆☆☆
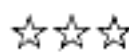
مردان خانے کے صحن میں چند مرد اور خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ان کے چہروں پر عقیدت کے چراغ روشن تھے۔وہ سب پیر سائیں سے دعا کروانے آئے ہوئے تھے۔کسی کی کچھ حاجت تھی، کسی کی کوئی خواہش۔ کسے کوئی مجبوری اس در تک کھینچ لائی تھی اور کوئی اپنے حالات پھر جانے کی تمنا لے کر وہاں آیا ہوا تھا۔صحن کے آگے بڑا سا برآمدہ تھا۔ جہاں وہ مریدِ خاص موجود تھے جو آئے ہوئے عقیدت مندوں کو ایک ایک کر کے اس کمرے میں بھیج رہے تھے۔جس میں پیر سائیں بیٹھے ہوئے تھے۔مردان خانے میں اگرچہ بہت سارے کمرے تھے۔جہاں دور سے آئے مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔باقاعدہ ایک طعام خانہ بھی تھا، جہاں ہر وقت لنگر چلتا رہتا تھا۔لیکن پیر سائیں کا کمرہ ان سب میں خاص کمرہ تھا۔اس میں کسی کو اجازت کے بغیر داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ پیر سائیں جب بھی باہر سے مردان خانے میں آتے تو وہیں ٹھہرتے اور پھر وہیں سے چلے جاتے تھے۔ یہ ان کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ وہاں کتنی دیر تک قیام کرتے ہیں۔ہاں مگر ظہر سے عصر تک کے درمیانی وقت میں وہ وہاں پر ضرور ہوتے تھے۔ جب وہ شہر میں نہ ہوں تب مجبوری ہوا کرتی تھی۔اس کمرہ خاص میں پیر سائیں موجود تھے۔دھیمی روشنی میں بیٹھا دلاور شاہ کوئی ماورائی مخلوق لگ رہا تھا۔اس کا دراز قد، بھاری جثہ،سفید رنگ کا مخصوص کرتا اور چادر، سر پر نسواری رنگ کی بڑی سی پگڑی، گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا، خشخشی داڑھی ، بھاری مونچھیں، لمبی زلفیں اور دائیں کلائی میں سونے کا کڑا تھا۔گورے رنگ پر نقوش کافی حد تک تیکھے تھے۔اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں شربتی سرخی خمار آلود دکھائی دیتی تھی۔ چند لمحے پہلے ایک خاتون اپنے دکھڑے رو کر اور دعا کی درخواست کر کے گئی تھی۔پیر سائیں نے نہ صرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے، بلکہ تعویذ بھی دیئے تھے۔دفعتاً اس کی نگاہ سامنے لگے وال کلاک پر پڑی، تبھی اس نے پاس پڑی ہوئی گھنٹی بجائی۔ایک مرید خاص، پیراں دتہ فوراً ہی کسی چھلاوے کی طرح حاضر ہو گیا۔وہ تقریباً جھکتے ہوئے بڑی عاجزی سے بولا۔

”جی حکم پیر سائیں۔“

”باہر کتنے لوگ ہیں؟“ پیر سائیں نے دھیمے سے بارعب لہجے میں پوچھا۔

”تھوڑے سے ہیں سرکار۔“ پیراں دتہ نے عاجزی ہی سے بتایا۔

”انہیں جلدی جلدی سے بھیج دو، آج مجھے زنان خانے جانا ہے۔“ اس نے کہا اور آنکھیں موند لیں۔

”سرکار، وہ دیوان جی بھی آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ کہہ گئے ہیں کہ اگر آپ اجازت دیں تو وہ آجائیں۔“ وہ اسی عاجزی سے بولا تو پیر سائیں نے تیزی سے کہا۔

”نہیں، انہیں کہنا کہ مغرب کے بعد آجائیں۔ اب جاؤ، جلدی جلدی لوگوں کو بھیجو۔“

پیراں دتہ یہ سنتے ہی الٹے پیروں پر واپس مڑ گیا۔اس نے باہر جا کر لوگوں کو سمجھایا کہ وہ بہت کم وقت لیں۔ پیر سائیں نے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔پھر زیادہ وقت نہیں گزرا، ایک کے بعد ایک کر کے لوگ اندر جاتے اور پھر فوراً ہی واپس پلٹ آتے۔ یہاں تک کہ مردان خانے کے صحن میں کوئی عقیدت مند نہیں رہا۔تب پیر سائیں اپنے خاص کمرے سے نکلے اور مردان خانے کے صحن میں آ گئے۔تازہ ہوا میں تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد وہ زنان خانے کی طرف چل دیئے۔

☆☆☆
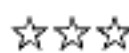
نادیؔ تیار ہو کر نیچے آئی تو دادی اماں، زہرہ بی اور فرح کو اپنا منتظر پایا۔ وہی اس تقریب کے منتظم تھے اور وہی مہمان تھے۔ اور کس نے وہاں نہیں آنا تھا۔ ڈرائینگ روم میں ایک جانب بڑا ڈرائینگ ٹیبل انواع واقسام کے کھانوں سے سجا دیا گیا ہوا تھا۔ کمرے کے درمیان میں پڑے صوفوں اور قیمتی فانوس کے نیچے میز پر بڑا سا کیک دھرا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اپنی دادی اماں کے پاس آ بیٹھی۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ گہرے نیلے رنگ کا سوٹ اور بڑی ساری سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ سبھی خاموش تھیں۔ اب فقط پیر سائیں کا انتظار تھا جو مردان خانے سے آنے والے ہی تھے۔ اس دوران نادیؔ اپنے مطالبے کا اظہار کرنے کے لیے ہمتیں جمع کرتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ ہمیشہ کی طرح کیک کاٹنے سے پہلے پیر سائیں اس سے اسی کی پسند کے کسی تحفے کے بارے میں پوچھیں گے۔ اور وہ ان سے ہمیشہ دعاؤں کی ہی طلب گار رہی تھی۔ مگر اس بار وہ کچھ اور ہی چاہ رہی تھی پہلے تو اسے دعاؤں کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ مل جایا کرتا تھا۔ لیکن اس بار اسے کسی بھی قسم کے تحفے کی اُمید نہیں تھی۔ اسے یہ احساس بھی تھا۔ اس کا مطالبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ جیسے کہنے کے بعد ممکن ہے آئندہ کبھی اُسے سالگرہ منانے کی اجازت ہی نہ ملے۔

مغرب سے ذرا پہلے پیر سائیں حویلی میں آ گئے۔ سلام ودعا کے بعد وہ آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ چاروں ارد گرد بیٹھ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک حال احوال پوچھتے رہے یونہی ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں۔ تب انہوں نے کیک کی طرف دیکھا اور نادیؔ سے پوچھا۔

''نادیہ بیٹی۔! بتاؤ۔ کیسا تحفہ پسند کرو گی۔'' یہ سنتے ہی نادیؔ چند لمحوں کے لیے تو پوری جان سے لرز گئی۔ وہ لمحہ آ گیا تھا جس کے لیے وہ اپنے اندر کی ساری ہمتیں جمع کرتی رہی تھی۔ اس کا دورانِ خون ایک دم سے تیز ہو گیا۔

''بتاؤ بیٹی۔! بولو۔ کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی۔'' زہرہ بی نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو نادیؔ چند لمحوں تک خاموش رہی۔ پھر پوری جان سے حوصلہ کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''پیر سائیں۔! مجھے کالج میں پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ آپ کا یہ تحفہ میرے لئے اب تک کے تمام تحفوں سے بھاری اور قیمتی ہوگا۔''

اس کا یہ کہنا تھا کہ اچانک گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہاں تک کہ سانسیں بھی گم ہوتی ہوئیں محسوس ہوئیں۔ دادی اماں سمیت سبھی نے اس کی جانب یوں حیرت سے دیکھا جیسے سب کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو گیا ہو۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا مطالبہ کر دے گی۔ پیر سائیں نے چونک کر حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ان کے دیکھنے میں انتہائی درجے کی بے یقینی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک ایسے یوں تکتے رہے جیسے انہونی ہونے جا رہی ہو۔ خلا کے جیسے کتنے ہی لمحے گذر گئے۔ جیسے وقت کوئی مالا ہو اور اس کے درمیان سے موتی غائب ہو گئے ہوں۔ تبھی پیر سائیں نے خود پر قابو پایا اور خلاف توقع انتہائی نرم لہجے میں گویا ہوا۔

''تم جانتی ہو نادیہ بیٹی۔! تم نے کیا کہا ہے؟ حویلی کی روایات میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہاں کی خواتین باہر قدم نکال کر سکول، کالج یا کسی ادارے میں جا کر پڑھتی پھریں۔''

''پیر سائیں۔! میری یہ خواہش ایسی نہیں ہے کہ جس سے حویلی کی شان میں خدانخواستہ کمی ہو جائے گی۔'' نادیؔ نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر وہ یہاں کمزور پڑ گئی تو پھر ساری زندگی وہ اپنی کوئی بات نہیں منوا پائے گی۔ پیر سائیں خاموش تھے۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور

تجربے کار شخص تھا۔اس نے نادی کے مطالبے میں موجود بغاوت کی ہلکی سی رمق محسوس کر لی تھی۔وہ ایک روحانی شخصیت ہی نہیں تھا بلکہ دربار شریف سے ملحقہ زمینوں اور جاگیر کے باعث زمینداروں میں بھی ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔دوسرے زمینداوں کی مانند سیاست میں دلچسپی لینا ان کی مجبوری تھا۔مریدین اور زائرین کی نفسیات سے واقف پیر سائیں نے وقت اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر لیا تھا،اس لیے بڑے اطمینان سے بولا۔

''ابھی تم یہ اپنی سالگرہ کا کیک کاٹو،چند دن بعد سوچ کو تمہیں بتاتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔''

''میں انتظار کروں گی پیر سائیں۔''اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا۔پھر کیک کاٹنے کے بعد انہوں نے کیک چکھا،اسے دعائیں دیں اور کھانا کھائے بغیر اٹھتے ہوئے بولے۔

''اس بار میں دس تولے سونے کا زیور تمہیں تحفے میں دیتا ہوں۔زہرہ بی تمہیں وہ زیور دے دے گی۔''انہوں نے کہا اور اٹھ کر جانے لگے تو نادی نے جلدی سے کہا

''آپ مجھے پڑھنے کی اجازت دے دیں،آپ کا یہی تحفہ میرے لئے بہت ہی قیمتی ہوگا۔''

پیر سائیں نے اس کی بات تحمل اور خاموشی سے سنی اور کچھ کہے بغیر چلے گئے۔تب دادی اماں نے اس کی جانب دیکھ کر انتہائی حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ تم نے کس امتحان میں ڈال دیا ہے نادی۔یہ تو مجھے یقین ہے کہ وہ تجھے کبھی کسی کالج میں جانے کی اجازت نہیں دے گا۔مگر تمہاری اس خواہش کے ردعمل میں ہوگا کیا،اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔مجھ سے تو بس یہی سوال ہوگا کہ تمہارے اندر ایسی خواہش پیدا کیسے ہوئی۔''

''انہوں نے اگر انکار کرنا ہوتا نا،تو ابھی کر دیتے۔انہوں نے کچھ سوچ کر ہی۔۔۔''نادی نے کہنا چاہا،مگر دادی اماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اسی خاموشی ہی سے تو مجھے خوف آ رہا ہے۔وہ کہیں کوئی ایسا فیصلہ نہ کر دے،جس سے تم ساری عمر پچھتاتی رہو۔''اس کا لہجہ بھیگ چکا تھا۔جیسے وہ ابھی رو دیں گی۔

''ایسا کیا ہو سکتا ہے۔''اس نے حیرت سے پوچھا

''یہ تو میں نہیں جانتی۔لیکن یہ ممکن ہے کہ اب تمہاری شادی بہت جلد کر دی جائے۔''انہوں نے کہا۔

''میری شادی۔اتنی جلدی۔''اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''وہ ظہیر شاہ سے تمہاری شادی بھی کر سکتا ہے۔یہ مت بھولو کہ وہ لندن سے چند دنوں کے لیے یہاں آ بھی سکتا ہے۔''دادی نے یوں کہا جیسے اسے دکھ محسوس ہو رہا ہو۔

''کیا،وہ میری شادی ظہیر سے کر دیں گے۔؟''نادی کے لئے یہ انکشاف حیرت زدہ کر دینے والا تھا۔

''ہاں۔!اس کا یہی خیال ہے۔بلکہ وہ اس معاملے پر مجھ سے بات بھی کر چکا ہے۔پہلے تو یہی طے تھا کہ جیسے ہی ظہیر شاہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آئے گا،تمہاری شادی اس سے کر دی جائے گی۔لیکن اب۔''دادی نے حتمی انداز میں کہا تو وہ ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

ظہیر شاہ سے شادی کا مطلب تھا کہ باقی زندگی حویلی کی انہی اونچی اونچی دیواروں میں دفن ہو جائے گی۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ شاید ایسے ہی کسی تعلق کے باعث اس کی رہائی ممکن ہو جائے گی۔ لیکن نہیں یہ اس کا وہم تھا۔ پیر سائیں تو اس کے بارے میں کوئی اور ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ زہرہ بی اور فرح تو پہلے ہی مہر بلب تھیں۔ ان کی تو یہ بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کی کسی بات پر کوئی تبصرہ ہی کر دیتیں۔ تبھی نادی نے عجیب سے لہجے میں ایک دم سے کہا۔

''او کے! میں ان کے فیصلے کا انتظار کروں گی۔ فی الحال تو اس وقت کو انجوائے کریں۔ لیں یہ کیک کھائیں۔'' اس نے یوں پوز کیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ لیکن وہ جتنی دیر بھی ان کے درمیان رہی، بہت ہی بدل اور بے چین رہی۔ پھر کسی نے بھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ وہ جلد ہی اپنے کمرے میں آ گئی۔

شادی کے لفظ کے ساتھ جو ریشمی تاثرات بندھے ہوتے ہیں۔ اس سے ہر لڑکی کے من میں ہلچل ضرور ہوتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی مسلسل یہی سوچے چلے جا رہی تھی۔ کالج جانے کا مطالبہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ اپنی شادی ہی کے بارے سوچتی چلی جا رہی تھی۔ جو اس کے لئے ذرا بھی خوشگوار نہیں تھا۔ اسے سب سے بڑا گلہ یہی تھا کہ پیر سائیں کے بعد ظہیر شاہ نے گدی نشین ہو جانا تھا اور اس کی زندگی زہرہ بی کی مانند ہو جانے والی تھی۔ ایک بے جان وجود کی مانند جس کا مقصد فقط حکم کی بجا آوری تھا۔ ان کا خاندان کوئی اتنا بڑا نہیں تھا۔ رشتے داروں میں فقط زہرہ بی کا ایک بھائی تھا، جس کی اولاد ان سے چھوٹی تھی۔ ظاہر ہے اگر اس کی شادی ظہیر شاہ سے نہ ہوتی تو پھر ساری زندگی یونہی گذارنا تھی۔ بن بیاہی قیدی، جیسے فرح تھی۔ اس کے بارے میں بھی یہی گمان تھا کہ اس کی شادی نہیں ہونے والی تھی۔ وہ کسی دوسرے خاندان کی لڑکی بیاہ کر لا سکتے تھے مگر اپنی لڑکی کسی کو نہیں دیتے تھے۔ یہ بھی حویلی کی روایت میں سے ایک روایت تھی۔ وہ گھبرا کر بیڈ سے اُٹھ گئی۔ کیونکہ نادی ایسی زندگی جینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پہلی بار اپنے آپ کو یوں دیکھا، جیسے کوئی اجنبی کسی کو دیکھ رہا ہو۔ وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ جس میں بھرے بھرے بدن والی بوٹے سے قد کی ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ گداز بدن، سفید شہد ملا رنگ، سیاہ گھنگھریالے گھنے گیسو، جو اس کی کمر تک جھول رہے تھے۔ مناسب سی گردن پر گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، رس ٹپکاتے ہوئے سرخ لب، مناسب ناک اور بھاری بھاری گداز گال، جس کے دائیں جانب گہرا ڈمپل پڑتا تھا۔ اس نے اپنے دونوں گداز ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں سے اپنے گھنے گیسوؤں کو باندھا تو عکس نے اس کا پورا سراپا نمایاں کر دیا۔ اس نے اپنا آنچل درست کیا اور خود کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ کالج یونیفارم میں وہ کیسی لگے گی یا پھر دلہن کا لباس اس پر کیسا سجے گا۔ وہ سوچوں ہی سوچوں میں ان ہیولوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اپنے بیڈ پر آ کر سوچنے لگی کہ پتہ نہیں آئندہ دنوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ کیا ہو گا۔ وہ کالج جا بھی پائے گی یا نہیں۔ یا پھر اسی چار دیواری میں وہ نئے رشتوں کی زنجیریں پہن کر سسکتے رہنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس رات نادی نے بڑی شدت سے اپنے والدین کو یاد کیا تھا۔ جن کا چہرہ بھی اسے یاد نہیں تھا۔ چند تصویریں تھیں، جن سے وہ اپنے والدین کے خال و خد یاد رکھے ہوئے تھی۔ اگر وہ ہوتے تو شاید اسے یوں مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ زندگی نجانے اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆☆☆
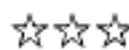
شعیب تیار ہو کر ناشتے کے لئے میز پر آن بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کی والدہ زبیدہ خاتون کچن میں مصروف تھی۔ برسوں سے یہی معمول تھا کہ ناشتہ کرتے ہی وہ گھر سے نکل جایا کرتا تھا، کیونکہ سورج طلوع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد اس کی امی کے پاس وہ لڑکیاں آنا شروع ہو جاتی تھیں جوان سے سلائی کڑھائی سیکھتی تھیں۔ ان ماں بیٹے کے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ نجانے کب سے طے پا چکا تھا، جو چلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بہت چھوٹا تھا ، جب اس کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس کا باپ ایک مناسب عہدے پر فائز سرکاری ملازم تھا۔ اس نے بھلے وقتوں میں ایسی جگہ گھر بنا لیا تھا جو اس وقت تو عام سا علاقہ تھا مگر وقت گذرنے کے ساتھ اب وہ کالونی پوش علاقہ سمجھی جاتی تھی۔ والد کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کی امی نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ چھت کا ہونا غنیمت تھا۔ لیکن پینشن کے روپے اتنے نہیں تھے کہ وہ گھر داری چلانے کے بعد اپنے اکلوتے بیٹے کو وہ اعلیٰ تعلیم دلوا سکتیں ، جس کا خواب ان دونوں میاں بیوی نے کبھی دیکھے تھے۔ اپنے شوہر کے خوابوں کی تکمیل کے لیے ، اس نے سلائی کڑھائی شروع کر دی۔ جس سے ایک طرف اس کی آمدن میں اضافہ ہوا تو دوسری جانب اس کی تنہائی کا مداوا ہو گیا۔ کالونی اور آس پاس کے علاقوں کی لڑکیاں اس کے پاس آنے لگیں۔ جس سے سارا دن ان کے گھر میں میلا لگا رہتا۔ خواتین آ جا رہی ہیں۔ لڑکیاں چہک رہی ہیں۔ سینے پرونے کا کام کر رہی ہیں۔ آنا فانا اس کے گھر کے کام بھی ہو رہے ہیں۔ سہ پہر کے بعد ان کے آنگن میں خاموشی چھا جاتی۔ تب وہ بھی گھر واپس آ جایا کرتا تھا۔ پھر رات سو جانے تک دونوں ماں بیٹا خوب باتیں کرتے۔ ماں اپنی خواہشیں دہراتی اور بیٹا روزانہ بڑا آدمی بننے کا عزم کرتا۔ باپ کا خواب ، ماں کی خواہش بن کر اسے سننے کو ملے تو اسے اپنی زندگی کا مقصد مل گیا۔ وہ اپنی تعلیم میں اس قدر مگن ہوا کہ اردگرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ اس نے خود کو پڑھائی کے لئے وقف کر دیا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا ہوا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کالج دور میں آتے ہی وہ خود بھی تھوڑا بہت کمانے لگا تھا۔ یوں ایک لگی بندھی زندگی تھی جس میں وہ خوش تھا۔ تعلیم مکمل کرتے ہی اس نے سی ایس ایس کا امتحان دیا تو بڑے اچھے نمبروں میں پاس ہو گیا۔ انٹرویو پاس کیا اور ٹریننگ مکمل کر لی ان دنوں وہ تعیناتی کے احکامات کا منتظر تھا۔ لیکن پھر بھی وہ معمول کے مطابق تیار ہو کر ناشتے کی میز پر تھا۔ کیونکہ اس نے گھر سے نکل جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

’’شعیب پتر۔ ! یہ تمہیں تعیناتی کے آرڈر کب ملیں گے۔؟‘‘ ناشتہ کر چکے تو چائے پیتے ہوئے اس کی امی نے پوچھا۔

’’بس جلد ہی مل جائیں گے۔۔ مجھے خود بڑا انتظار ہے۔‘‘ وہ ہولے سے بولا

’’میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ اگر کہیں نزدیک تعیناتی ہوتی ہے تو پھر میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ لیکن اگر کہیں دور تجھے جانا پڑا تو پھر میں تیرے ساتھ ہی جاؤں گی۔۔‘‘ اس کی ماں نے جذب سے کہا۔

’’اور یہ جو آپ کی اتنی ساری فوج ہے ، اس کا کیا کیا ہو گا۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

’’میں نے کر لیا ہے بندوبست ، ایک غریب بیوہ ہے۔ اس کے حوالے کر جاؤں گی۔ اب تو ویسے بھی مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ تجھے بہت ساری ترقیاں ملیں ، میری تو اب یہی دعا ہے۔‘‘ اس نے پھر اسی جذب ہی سے کہا تھا۔

’’آپ ہی کی دعاؤں کے سہارے چلتا چلا جا رہا ہوں۔ میری ماں دعا کرے اور وہ قبول نہ ہو ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔‘‘ اس نے خالی پیالی واپس رکھتے ہوئے کہا تو اس کی ماں کا دل بھر آیا۔ تبھی وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آئے خوشی کے آنسو اس کا بیٹا دیکھ

لے اور یونہی پریشان ہو جائے۔ شعیب اٹھا اور اپنی پرانی بائیک لے کر باہر نکل گیا۔

اس کا رخ بھاء حمید کی ورکشاپ کی طرف تھا۔ وہ ورکشاپ ریلوے اسٹیشن کی پچھلی جانب پھیلی ہوئی آبادی میں موجود ایک بڑی سی چار دیواری کے اندر تھی۔ وہاں بھاء حمید اور دوسرے چند لوگوں کی ٹیکسیاں اور رکشے کھڑے رہتے تھے۔ وہیں مکینک اور اس کام سے وابستہ دوسرے لوگ ہوتے تھے۔ بھاء حمید نے اپنا چھوٹا سا دفتر بنایا ہوا تھا۔ جہاں وہ سارا دن لوگوں سے گپیں لگاتے اور ملتے ملاتے گذار دیتا تھا۔ وہ انہی کی کالونی میں رہتا تھا۔ رکشے ٹیکسیاں ہونے کی وجہ سے خود کو ٹرانسپورٹر خیال کرتا تھا۔ بنیادی طور پر شریف آدمی تھا لیکن جس دنیا سے تعلق رکھتا تھا، اس میں تھوڑی بہت غنڈہ گردی کرنا ہی پڑتی تھی۔ شاید شعیب اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے کچھ اور کرتا اگر اسے بھاء حمید جیسا ہمدرد شخص نہ ملتا۔ اس نے شعیب کو حساب کتاب لکھنے کے لیے رکھ لیا تھا اور باقاعدہ اس کی تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ کبھی شعیب کے والد نے اس کی بہت مدد کی تھی اور وہ اب تک اس کا احسان چکا رہا تھا، اور ایسا کرتے ہوئے وہ بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔ شعیب بھی اس کے لئے کئی کام کر دیتا تھا، کبھی کسی دفتر کے اور کبھی کسی دفتر کے۔ وہ اس ماحول میں پوری طرح رچ بس گیا تو ڈرائیور نہ ہونے یا پیسوں کی ضرورت کے باعث وہ خود ٹیکسی یا رکشہ لے کر نکل جاتا۔ کچھ نہ ہوتا تو ورکشاپ ہی کے ایک کمرے میں پڑا پڑھتا رہتا یا پھر قریبی پارک میں چلا جاتا۔ اگرچہ اس کا مقصد ایک بڑا آفیسر بننا تھا تاہم اسے شعور آگہی زمانے ہی کو برتنے سے ملی تھی۔ روزانہ مختلف لوگوں سے ملنے، ان سے واسطہ پڑنے کے باعث نہ صرف وہ زمانے کے تیور سمجھ چکا تھا بلکہ رویّے اسے بہت کچھ سمجھا چکے تھے۔ ٹریننگ کے دوران وہ کئی کئی دن ورکشاپ نہیں آسکا تھا۔ اس دن جب اس نے ورکشاپ میں اپنی بائیک روکی تو بھاء حمید اسے دیکھتے ہی کھل گیا۔

''اوئے آؤ شعیب، کیا حال ہے تیرا۔ اب تو کبھی کبھی دکھائی دے جاتا ہے۔ افسر بن گیا تو پھر کہاں آسکے گا۔''

''کیوں پھر کیا ہو جائے گا۔'' شعیب نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''او نہیں یار، بندہ مصروف ہو جاتا ہے نا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تو ہمیں بھول جائے گا۔'' بھاء حمید نے جلدی سے اپنی بات کی تصیح کر دی۔ پھر اپنے سامنے دھری اخبار اٹھا کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''لے چل پکڑ اخبار اور سنا خبریں، پتہ چلے کہ ملک کے حالات کیا چل رہے ہیں؟''

''بھاء مجھے یہ بتا، آپ کے اس طرح اخبار سننے سے ملک کے حالات درست ہو جائیں گے۔'' اس نے اخبار پکڑتے ہوئے کہا۔

''بات تیری ٹھیک ہے۔ پر یار ہمیں معلومات ہوں گی نا حالات کے بارے تو ان کے درست ہو جانے کی امید بھی کر سکتے ہیں نا اور جس شے کے بارے میں پتہ ہی نہیں، اس کی اُمید کہاں، چل تو سنا جلدی سے موٹی موٹی سرخیاں، اتنے میں چائے آجاتی ہے، پھر لگاتے ہیں گپیں۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں کہا اور چھوٹے کو چائے لانے کے لئے آواز دے دی۔ پھر بھاء خبریں سنتا رہا اور اپنی طرف سے ان پر تبصرے کرتا رہا۔ شعیب نے وہاں چائے پی اور اپنی آئی ہوئی ڈاک دیکھنے لگا۔ ان میں کچھ ادبی رسالے تھے یا پھر لوگوں کے خط، جنہیں پڑھ کر وہ جواب دینے لگا۔ اس کی ایک یہی دلچسپی تھی جسے وہ چھپا کر رکھتا تھا۔ وہ شاعری کرتا تھا لیکن قلمی نام سے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اس کی ایک الگ سے شخصیت بھی ہے۔ یہ دلچسپی بھی اسے یونہی ہو گئی تھی۔

شعیب جس پارک میں جا کر پڑھتا تھا۔ وہیں ایک ادھیڑ عمر لکھاری تجمّل شیرازی بھی آ جایا کرتے تھے۔ دوپہر سے کچھ دیر پہلے پارک تقریباً سنسان ہوتا تھا۔ ایسی خاموشی جو اس کی پڑھائی کیلئے بہت موزوں ہوتی تھیں۔ وہ تجمّل صاحب کو دیکھتا تھا جو اکثر تنہا آتا، خود میں الجھا رہتا اور پھر چلا جاتا۔ پہلے پہل تو شعیب نے اسے فاتر العقل ہی سمجھا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ دونوں میں علیک سلیک بڑھی تو تجمّل صاحب ایک زبردست شاعر نکلے۔ پھر معاملہ شناسائی سے بڑھا اور اس حد تک آ گیا کہ شعیب کو بھی شاعری میں دلچسپی ہونے لگی۔ ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

''سر جی۔! وہ کہتے ہیں نا کہ شاعری تب ہوتی ہے، جب بندہ عشق میں ناکام ہو جائے۔ تو تجمّل صاحب جذبات اور احساسات۔۔۔۔''

''ارے میاں، کہاں کی لے بیٹھے ہو آپ، محبت میں ناکامی ہی وجہ شاعری نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی اپنی وسعت نگاہ ہے کہ آپ کہاں تک دیکھ سکتے ہیں۔ قدرت کے مناظر ہیں، فطرت ہے، کائنات ہے۔۔۔ اور پھر یہ خود انسان، جو اپنے اندر ایک کائنات ہے۔۔۔ اس کے رویے، اس کو ہی آپ شاعری میں لے آئیں تو آپ ساری زندگی مختلف چند پہلو بھی غالباً پوری طرح بیاں نہیں کر پائیں گے۔'' انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''چلیں، یہ تو طے ہو گیا نا کہ کوئی نہ کوئی ٹارگٹ، وجہ یا مقصد تو ہو گا نا ذہن میں، جس کے گرد شاعری گھومتی ہے۔ لیکن ایک شے ہے ہی نہیں اور اس کے لئے شاعری کرتے چلے جانا۔۔'' اس نے باقاعدہ بحث چھیڑ دی۔

''ارے میاں، روایتی باتیں کرتے رہیں، کس نے روکا ہے، لفظ جوڑنا اور ان سے مصرعے ترتیب دینا، روایتی خیالات کو نئے نئے پیرہن دے دینا، یہ الگ بات ہے، آپ نے دریافت کیا کیا؟ یہی دریافت ہی آپ کی شاعری کو انفرادیت بخشے گی۔''

شعیب کو بنیادی نکتہ کیا ملا، وہ اس پر بہت کچھ سوچنے لگا، یہاں تک کہ ایک دن اس نے ایک نظم کہہ ڈالی، پھر جھجکتے ہوئے وہ نظم تجمّل صاحب کو لا دکھائی۔ انہوں نے بڑے شوق سے وہ نظم دیکھی اور پھر اونچی آواز میں پڑھنے لگے۔

خوابوں میں اتری ہوئی ایک موم بدن سی لڑکی نے

رات کے پچھلے پہر خاموش اور برف زدہ سے لمحوں میں

سردیوں میں دھوپ کے جیسے لہجے میں یوں خواب کہے

نہر کنارے بیٹھ کے پتھر پھینکوں میں بس پانی میں

تکتی رہوں ان دائروں کو جو بن جاتے ہیں پانی میں

چھوٹی سی دیواروں والے گاؤں کے کچے گھر میں، میں

بیٹھ کر چوتھی سیڑھی پر وا مکن بجاتی تھک جاؤں میں

تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھوں پیڑ صنوبر کے نیچے میں

سفید گلاب کی پتی پتی دیر تلک کرتی رہوں میں

سبزے والے بڑے سے گھر میں، کاسنی رنگ کا جوڑا پہنے

گوندھ کے لمبی ساری چوٹی، آنکھیں خوب سجاؤں میں

سرخ سرخ سے گالوں والے بچوں کے سنگ کھیلوں میں

کھلی ہوئی کھڑکی میں بیٹھوں، بادل دیکھوں اجلے اجلے

چاند شرارت سے آنکھ مارے، ہنستی رہوں کتنے پہروں میں

اپنے خواب سنہرے کہہ کر کتنی دیر وہ روئی تھی

میں تو کچھ نہیں کہہ سکا اس کو، میری کیا لگتی تھی وہ

جسم کے بازار میں بیٹھی لذت بیچنے والی تھی وہ

میں تو دیکھ رہا تھا، اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں

نظم پڑھنے کے بعد تجمل صاحب نے شعیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ وہ خواب ہیں جو ہر ایک لڑکی دیکھتی ہے۔ یہ نیا پن ہے کہ ایک لڑکے نے لڑکی کے خوابوں کو محسوس کیا۔ لیکن اس میں جو آخری والے مصرعے میں بات کہی گئی ہے۔ یہی ساری نظم کی بنیاد بن گیا یعنی جبر، جو خوابوں کی تکمیل میں حائل ہوتا ہے۔ یہ جبر جتنا زیادہ ہوگا، خواب اتنے ہی سنہری ہوں گے۔ احساس و جذبات میں بھیگے ہوئے خواب زندگی کو تازگی دینے کا سبب بنتے ہیں۔ جسم بیچنے والی کے پاس کچھ نہیں خواب ہیں۔ وہ بھی اندر سے ایک عورت ہے۔ چاہے وہ جتنی غلیظ ہے اور اس لڑکی کے خواب، جو معصوم اور پاکیزہ ہیں۔ ذرا اسے سوچو، تمہیں زندگی کی اصل روح دکھائی دے جائے گی۔''

وہ نظم جو تجمل صاحب نے جذب سے پڑھی اور پھر اس پر تبصرہ کیا۔ اسی نظم نے شعیب کی آئندہ شاعری کا رخ متعین کر دیا۔ وہ سوچتا کہ لڑکیاں کیسے کیسے خواب دیکھتی ہیں۔ کس طرح کی لڑکی کے خواب کیسے ہوتے ہیں۔ وہ خوابوں کی باتیں اپنی شاعری میں کرنے لگا تھا۔ پھر اس نے ایک خیالی پیکر تراش لیا۔ کئی ساری لڑکیوں کی خوبیاں اس ایک پیکر میں اکٹھی کر لیں۔ چند دن اسے سوچتا رہا تو اس کا جی ایک دم سے اُوب گیا۔ اس نے اس خیالی محبوبہ کو یوں ختم کر دیا جیسے بچے ریت کا گھروندہ توڑ دیتے ہیں۔ اسے ایک عام سی لڑکی سے ہمدردی تھی جو اپنے اردگرد کے حالات سے فرار حاصل کر کے خوابوں میں پناہ تلاش کر لیتی ہے۔ شاید اس کے ذہن میں بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی موجود تھی، جس میں ایک شہزادی، ایک ظالم دیو کی قید میں ہوتی ہے۔ کہانی پڑھ کر اسے بڑا غصہ آیا تھا کہ یہ دیو جو ہوتے ہیں، شہزادیوں کو ہی کیوں قید کرتے ہیں۔ اسے شہزادی سے بڑی ہمدردی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اب اسی شہزادی کے لئے شاعری کرے گا۔ وہ شعر کہتا اور تجمل صاحب کو دکھاتا، وہ پسند کرتا اور بڑے مزے سے مشورے دیتا۔ ایک خیالی دنیا انہوں نے تراش لی تھی۔ شعیب نے اپنا قلمی نام اختر رومانوی رکھ لیا اور اسی نام سے شائع بھی ہونے لگا۔ پھر قارئین کی طرف سے تعریف و تنقید بھرے خطوط اور فون ملنے لگے۔ کئی لوگ اس سے باتیں کرتے۔ یوں ایک دلچسپ مشغلہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ شعیب ایک نیا کردار تخلیق کر کے اس کے مزے لینے لگا۔ چند لوگوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شعیب ہی اختر رومانوی ہے۔ شاید وہ بھاء حمید سے بھی اپنی شاعری

چھپا جاتا لیکن تجمل صاحب، جن سے وہ شاعری سیکھا کرتا تھا، ورکشاپ آنے لگے۔ وہاں بیٹھ کر چائے پیتے، گپ شپ لگاتے اور شاعری کے پر باتیں ہوتیں۔ بھاء حمیدان دونوں کی باتوں پر ہنسا کرتا تھا۔ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر باتیں ہوتیں تھیں۔ شاعری سے متعلق ساری ڈاک ورکشاپ کے پتے پر آتی تھی۔ یوں شاعری شعیب کے گھر سے باہر ہی رہی۔ ٹریننگ کے ان دنوں میں شعیب نے بہت لکھا اور پھر اسی مناسبت سے شائع بھی ہوا۔ اس کی زندگی میں جو ٹھہراؤ تھا۔ خیالی دنیا میں پہنچ کر وہ بہت ہلچل محسوس کیا کرتا تھا۔ یوں اس کی زندگی بڑے پرسکون انداز میں گذرتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن کی شام ہی کو پیر سائیں کی طرف سے نادیہ کے لیے بلاوا آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو سمیٹے، اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے گول کمرے میں جا پہنچی۔ پیر سائیں کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ سلام کر کے ایک جانب کھڑی ہوگئی۔ وہاں صرف دادی اماں بیٹھی ہوئیں تھیں۔ کسی نے اسے وہاں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا بلکہ اس کے سلام کرنے کے فوراً بعد ہی پیر سائیں گویا ہوئے۔

''مجھے افسوس ہے بیٹی کہ میں تمہیں، تمہاری خواہش کے مطابق تحفہ نہیں دے پا رہا ہوں، میں تمہیں کالج جانے کی اجازت نہیں دے سکتا، کیونکہ میں اپنی خاندانی روایات کے خلاف نہیں جا سکتا اور نہ ہی کسی کو یہ روایات توڑنے کی اجازت دوں گا۔ آئندہ تم بھی سوچ سمجھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا کرو۔ اب تم جا سکتی ہو۔''

لمحوں میں سنایا گیا فیصلہ سن کر وہ وہاں نہیں رکی۔ سیدھی اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عورت ہونا کوئی جرم ہے کیا۔ ہماری کوئی خواہش، کوئی ارمان یا کوئی اُمید نہیں ہوتی۔ ہمیں یہاں دیواروں کے بیچ قید کر کے آخر کیوں رکھا جا رہا ہے۔ سوچ کا یہی سرا بنیاد بن گیا اور پھر نجانے وہ کتنی دیر تک روتی رہی۔ کافی دیر بعد اس کی دادی اماں اس کے پاس آئی اور دھیرے دھیرے تھپکنے لگی۔

''یہ ہماری قسمت ہے بیٹی کہ ہم اس خاندان کا حصہ ہیں۔ ہمیں اس حویلی میں اسی طرح ہی جینا ہے۔ اسی طرح زندگی گذارنے سے سمجھوتہ کر لو، اسی طرح جینے کی عادت ڈالو، ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔'' انہوں نے بھیگے ہوئے لہجے میں اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ نادیہ چونک گئی۔ اس نے دادی اماں کے لہجے میں اتنی حسرت پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ نادیہ نے اپنے آنسو صاف کئے اور بڑے درد بھرے لہجے میں کہا

''دادی اماں۔ ! میں اب کوئی خواہش نہیں کروں گی اور نہ کوئی گلہ میری زبان پر آئے گا۔ کوئی شکوہ نہیں سنیں گی آپ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ان کے گلے لگ گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے لاشعور میں بغاوت زدہ سوچ کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔

دن گذرتے چلے گئے۔ اگرچہ نادیہ بددل تھی لیکن وہ پہلے سے زیادہ کتابوں میں کھوگئی۔ وہ ہوتی، اس کا کمرہ ہوتا، اس کی تنہائی ہوتی اور کتابوں کا ڈھیر اس کے اردگرد جمع رہتا۔ اس کی اپنی مخصوص ملازمہ پر نوازشیں بہت ہونے لگیں، جو باہر کی دنیا سے اس کا واحد رابطہ تھا۔ وہی اسے نئی نئی کتابیں اور رسالے لا کر دیتی تھی یا پھر وہ چیزیں جن کی اسے ضرورت ہوتی تھی۔ ایک دن ایسے ہی وہ ایک ادبی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ شاعری کے حصے میں ایک صفحے پر دو غزلیں ایسی تھیں جو اس کے دل کو چھو گئیں۔ کیا اچھوتا پن تھا ان میں۔ اسے لگا جیسے کوئی اس کے خوابوں کو بڑے حسین انداز

میں، لفظوں کے ریشمی غلاف میں سجا کر اسے پیش کر رہا ہو۔ اس نے جتنی بار وہ شاعری پڑھی۔ اتنی بار ہی وہ نئے نئے خیالوں میں کھو گئی۔ کوئی شے کتنی پیاری ہو جاتی ہے۔ یہ دل کو چھو جانے کے بعد کی کیفیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ شاعری اس کے دل کو چھو گئی تھی۔ اس نے شاعر کا نام پڑھا۔ ''اختر رومانوی، کیسا شاعرانہ نام ہے اس کا۔ میں نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں پڑھا؟'' اس نے خود سے سوال کیا پھر اس کے جواب میں نادیؔ نے پرانے رسالوں میں اس کی شاعری تلاش کرنے لگی۔ نادی کو کہیں کہیں اس کی شاعری دکھائی دی، جسے پڑھنے سے اس کی تشنگی مزید بڑھ گئی۔ وہ پہلے انہیں نظر انداز کر گئی تھی۔ اب کی بار پڑھا تو اس کی کیفیات وہی ہونے لگی جو اس کی شاعری پڑھ کر پہلے دن ہوئی تھی۔ ایک دم سے وہ شاعر اسے بہت اچھا لگنے لگا۔ چند دنوں میں اسے جتنی شاعری ملی، وہ سب اس نے اکٹھی کر لی۔ زندگی کا ایک نیا پہلو اس کے سامنے وا ہو گیا تھا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ کوئی اس کے خوابوں کو یوں کھول کھول کر بیان کر دے۔ وہ اپنی تنہائیوں میں اسے سوچنے لگی۔ یہاں تک کہ نادیؔ کے دل میں یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کہ وہ اختر رومانوی سے رابطہ کرے۔ دیکھیں تو سہی کہ گفتگو میں بھی وہ اس کے خوابوں کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے مگر۔! فون کا حویلی میں آنا اور رکھنا اتنا ہی ہولناک تھا، جتنا وہ تصور کر سکتی تھی۔ خط وغیرہ کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اختر رومانوی سے رابطے کی خواہش نہ صرف بڑھتی چلی جا رہی تھی بلکہ اسے بے چین کیے ہوئے تھی، وہاں سیل فون رکھنے کا جرم بھی اسے دہلائے دے رہا تھا۔ پھر خواہش جیت گئی۔ شاید اس جیت میں اس کے لاشعور میں پڑی بغاوت نے بڑا ساتھ دیا تھا۔ اس کی مخصوص نوکرانی نے ڈھیر ساری نوازشوں کے عوض اسے فون لا کر دے دیا۔ ملازمہ ہی کے بیٹے نے فون پر اسے سیل استعمال کرنے کے سارے طریقے سمجھا دیئے۔ پھر اس دوپہر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان رسالے والوں کو فون کر دیا۔ جس میں اختر رومانوں کی شاعری چھپی ہوئی تھی۔ کافی دیر باتوں کے بعد اسے اخترؔ کا نمبر مل گیا۔ احساسِ جرم میں اسے یوں لگا جیسے وہ پل صراط سے گذری ہو، مگر رابطہ نمبر مل جانے کی خوشی میں وہ سب کچھ نظر انداز کر گئی۔ جس وقت وہ اختر رومانوی کے نمبر ملا رہی تھی، اس وقت جہاں ہاتھ کانپ رہے تھے، وہاں دل بھی بڑی بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''ہیلو۔! کون بات کر رہا ہے۔'' دوسری جانب سے بھاری مردانہ آواز میں پوچھا گیا تو اس کے بدن میں پھیلتی ہوئی لہر نے اسے ساکت کر دیا۔ خیالوں ہی خیالوں میں نجانے کتنی بار دہرائی گئی باتیں یوں صاف ہو گئیں جیسے کبھی لفظ اس کی دسترس ہی میں نہیں تھے۔ ''ہیلو۔ بھئی بولیں کون بات کر رہا ہے؟'' دل چیر کر اتر جانے والے لہجے میں کوئی بڑے ماورائی انداز میں پوچھ رہا تھا۔ تبھی اسے ہوش آ گیا۔ نادیؔ نے پورے وجود کی ہمتیں اکٹھی کیں اور پوچھا۔

''کیا آپ اختر رومانوی بات کر رہے ہیں؟'' اس نے محسوس کیا کہ اس کے کانپتے ہوئے لہجے میں لفظ تھرتھرا رہے ہیں۔

''جی۔ میں اختر رومانوی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟'' پھر اسی پرکشش لہجے میں پوچھا گیا۔

''میں آپ کی ایک فین بات کر رہی ہوں۔ آپ کی شاعری مجھے بہت پسند ہے۔'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے تیزی سے کہہ دیا۔

''زہے نصیب۔! کہ ہمارا بھی کوئی فین ہوا اور اس سے بڑی بات کہ میری شاعری آپ کو پسند آ گئی۔ اس پر میں آپ کا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔'' وہی دل کھینچ لینے والی آواز میں شوخی در آئی تھی۔

''اس وقت میں آپ سے فقط دو باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔'' نادیؔ نے اعتماد سے کہا تھا۔

''جی، کہیے۔ پوچھیے۔'' اس نے کہا۔

''ایک بات تو یہ ہے کہ آپ کہاں کہاں شائع ہوتے ہیں۔ میں آپ کی ساری شاعری پڑھنا چاہتی ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا میں آپ سے کبھی کبھی بات کر سکتی ہوں۔'' اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

''جی، میں ابھی آپ کو ان رسالوں کی فہرست بتائے دیتا ہوں، جہاں جہاں میرا کلام شائع ہوتا ہے۔ اور رہی دوسری بات تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ آپ مجھ سے بات کریں گی۔ ہاں، جب میں مصروف ہوں گا تو آپ کی کال ریسو نہیں کر پاؤں گا۔'' اس نے بڑے خوبصورت انداز میں کہا اور چند رسالوں کے نام گنوا دیئے۔

''جی ٹھیک ہے۔ باقی باتیں پھر بعد میں ہوں گی۔'' اس نے جلدی سے کہا اور کسی قسم کا کوئی الوداعی جملہ کہے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ نادیؔ نے محسوس کیا کہ وہ پسینے میں بھیگ گئی ہے۔ اسے خود پر قابو پاتے ہوئے کتنا ہی وقت لگ گیا۔ وہ شام اور پھر رات سرشاری میں گذر گئی۔

پھر نادیؔ کا معمول بن گیا۔ پہلے پہل وہ تھوڑی سی بات کرتی رہی تھی۔ پھر بات پھیلی تو باقاعدہ موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔ رات کی تنہائیوں میں لمبی لمبی باتیں خوشگوار مسرتوں کا باعث بننے لگیں۔ رنگوں اور خوشبو جیسی باتوں میں وہ اکثر بہک جایا کرتی تھی۔ اسے خیال ہی نہ رہتا کہ وہ کس طرح کی باتیں کرتی چلی جا رہی ہے۔ ایسے میں اخترؔ اسے سنبھال لیتا۔ دن کے وقت جب وہ ان باتوں کو یاد کرتی تو عجیب سے احساس اس سے لپٹ جاتے۔ صرف ایک بات اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اپنی پہچان اور تعارف نہیں دیا تھا۔ اختر پر یہ واضح نہیں ہو پایا تھا کہ وہ کون ہے؟ نام تو اس نے نادیہ ہی بتایا لیکن کہاں سے بات کر رہی ہے یہ گول کر گئی۔ یوں باتیں کرتے ہوئے انہیں کئی دن ہو گئے تھے۔ نادیؔ کے لیے زندگی کا یہ پہلو اس قدر حسین بن گیا کہ اسے لگا جیسے یہی پہلو حاصل زندگی ہے۔

ایک رات اس کے من میں ایک خواہش در آئی۔ جس پر اس نے چند لمحے سوچا اور پھر فوراً ہی اس کا اظہار اختر سے کر دیا۔ یہ بڑی خوبصورت سی خواہش تھی۔ چلتی ہوئی باتوں کے دوران اچانک اس نے پوچھا۔

''اختر۔! آپ دیکھنے میں کیسے ہیں؟''

''کیا مطلب۔! دیکھنے میں انسان ہی لگتا ہوں۔'' اس نے بات کو سمجھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

''نہیں، میرا مطلب۔ آپ اتنی خوبصورت اور پیاری شاعری کرتے ہیں کہ دل کو چھو لیتے ہیں۔ اب یہ خواہش کچھ غلط بھی نہیں ہے کہ دیکھنے میں آپ کیسے ہیں؟'' اس نے بھی اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ بھئی ویسا ہی ہوں۔ جیسے عام انسان ہوتے ہیں۔ ہاں اگر ناک نقشے کی بات کرتی ہو تو میں ٹھیک ہوں۔ کم از کم کہیں سے بے ڈھنگا نہیں ہوں۔'' اس نے پھر اسی شوخی میں جواب دیا تھا۔

''میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے حتمی انداز میں اپنے دل کی خواہش کہہ دی۔

''کیسے دیکھ سکیں گی۔تم اتنی دور رہتی ہو۔نہ تم مجھے مل سکتی ہو اور نہ میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں۔''اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''آپ کی تصویر بھی تو کہیں شائع ہوئی ہوگی نا۔۔آپ کسی میگزین میں اپنی تصویر شائع کروادیں۔میں دیکھ لوں گی۔''اس نے فیصلہ کس انداز میں صلاح دے دی۔

''ایسا ممکن تو ہے،لیکن آج تک میں نے تصویر شائع کروائی ہی نہیں۔''اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیوں،کوئی مذہبی معاملہ۔۔۔؟''اس نے پوچھا

''نہیں،ایسی کوئی بات نہیں،بس یونہی۔۔۔''اس نے پھر سنجیدگی ہی سے کہا۔اب وہ کیا بتائے کہ اس نے خود کو پہلے ہی چھپا رکھا ہے اور قلمی نام سے لکھ رہا ہے۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔''اس نے حیرت ملی ناراضگی سے کہا،تب اس نے یونہی بہانہ بناتے ہوئے کہہ دیا۔

''میں اپنا مجموعہ کلام شائع کراؤں گا۔تب اس پر تصویر بھی لگادوں گا۔تب تم دیکھ لینا۔''

''کب۔۔کب۔۔۔شائع ہوگا مجموعہ۔۔۔''اس نے بے چینی سے کہا۔

''جب میرے پاس پیسے ہوں گے۔تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ بے چارے شاعروں کو اپنی کتابیں خود چھپوانا پڑتی ہیں۔پھر خود ہی بیچنا بھی پڑتی ہیں۔میں اتنا معروف شاعر تو ہوں نہیں کہ کوئی پبلشر مجھے مفت میں چھاپ دے۔میرے جیسا غیر معروف بے روزگار شاعر کتاب چھپوا کر اپنے ہی ہاتھوں ذہنی اذیت نہیں سہہ سکتا۔یہ خودکش حملے والی بات ہے نا۔۔۔''اس نے یونہی اوٹ پٹانگ ہانکتے ہوئے ایک حقیقت بیان کردی،جو بہت تلخ تھی۔

''کتنا خرچ آئے گا کتاب پر،وہ میں دے دیتی ہوں۔جتنی جلدی ممکن ہوسکے آپ کتاب لے آؤ۔''وہ پھر سے اچانک فیصلہ کن انداز میں بولی تو وہ چونک گیا۔اس لیے نادی کی بات کو نظرانداز کرتا ہوا بولا۔

''اچھا،ہم اس موضوع پر پھر کسی وقت بات کریں گے۔ہاں اس سے پہلے کیا موضوع چل رہا تھا۔''اس نے پہلوتہی کرتے ہوئے کہا تو وہ خواہ مخواہ میں ضدی ہوگئی۔اس لئے اپنی رو میں بولی۔

''نہیں۔!آپ مجھے بتاؤ۔کتنا خرچ ہوگا۔اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ۔میں اس میں رقم بھجوادوں گی۔''

''تم یہ سب رہنے دو۔میں نے کتاب شائع کروانی ہوگی تو وہ ہوجائے گی۔''اس نے بڑے سکون سے کہا۔

''میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''اس نے بچوں جیسی ضد کرلی۔

''تو ٹھیک ہے۔آجاؤ اور آکر مجھے مل لو۔''وہ سکون سے بولا،اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے نہیں مل سکتی۔یہ مجبوری خود نادی نے اسے بتائی تھی۔

''آپ کو معلوم ہے کہ میں نہیں مل سکتی۔آپ کی تصویر دیکھنے کے لیے میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ اپنی تصویر کسی میگزین ہی میں چھپوالیں۔مگر اب جبکہ میں کتاب شائع کروانے کی بابت کہہ چکی ہوں تو آپ میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کرسکتے۔''نادی نے پورے خلوص نے کہا تھا اس لئے اس کا لہجہ تھوڑا بھیگ بھی گیا۔

''نہیں۔!میں ایسا نہیں کرسکتا۔ مجھے یہ قطعاً پسند نہیں کہ کوئی مجھے یہ احساس دلائے کہ میں اپنی کتاب بھی نہیں چھپوا سکتا۔اس لئے اپنی بے جا ضد چھوڑ دو اور اس موضوع کو بدل دو۔ہم کوئی اور بات کرتے ہیں۔''اس نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''اس طرح تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے میرے خلوص بھرے جذبات کو ٹھکرا دیا ہے۔میں ایک اچھے دوست کی طرح کام آنا چاہتی ہوں اور آپ۔۔۔۔''

''صرف اپنی اس خواہش کے لئے کہ مجھے دیکھ سکو۔خیر۔ہم پھر بات کریں گے۔اس وقت فون بند کر دینا ہی بہتر ہوگا''اس نے کہا اور کچھ سنئے بغیر فون بند کر دیا۔نادی بے جان فون کو دیکھتی ہی رہ گئی۔اس نے پلٹ کر اختر کو کال کی تو اس کا فون بند ملا۔اسے یقین ہوگیا کہ اب وہ بات نہیں کرے گا۔اس نے یہی سوچا کہ کل تک اس بات کا اثر زائل ہو جائے گا۔دوبارہ وہ ایسے کسی موضوع پر بات نہیں کرے گی۔جس سے اس کی انا مجروح ہو۔سو اس رات اختر کی باتوں میں بھیگی سو گئی۔لیکن اگلی رات اختر نے کوئی رنسپانس نہیں دیا۔کال جاتی رہی مگر اس نے ریسو نہ کی۔کیا وہ ناراض ہوگیا ہے؟ یا پھر کوئی اور معاملہ ہے۔میں نے اتنی بے جا ضد تو نہیں کی تھی۔یہی سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی واحد کھڑکی سے آن لگی۔جہاں آکر وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی۔

کھڑکی سے باہر کے سارے منظر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔چاند بھی جیسے اس سے روٹھ گیا ہوا تھا۔حویلی کی دیوار پر لگے برقی قمقمے جہاں تک روشنی پھیلا سکتے تھے،وہاں تک کے سارے منظر اسے اپنے ساتھ جاگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ورنہ اس سے آگے کھیتوں اور درختوں پر اندھیرا اترا ہوا تھا۔دور گاؤں کے کچے پکے گھروں میں کہیں کہیں دیے کی مانند روشنی جھلملا رہی تھی۔نجانے کتنی دیر تک وہ یونہی ان تاریک منظروں کا حصہ بنی رہی تھی۔شاید وہ ان منظروں سے اُکتا کر سو چکی ہوتی اگر وہ اپنے آپ سے نہ الجھتی۔اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اختر اس کی فون کال نظر انداز بھی کرسکتا ہے؟وہ مسلسل کال کر رہی تھی اور وہ ریسو نہیں کر رہا تھا۔سیل فون بند ہوتا تو اسے چین آ جاتا۔اگر وہ مصروف ہے تو محض ایک پیغام بھیج دے کہ وہ مصروف ہے۔پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے اتنی بار کوشش کی ہو۔پہلی بار پلٹ کو اس کا رنسپانس نہیں دیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اسے طرح طرح کے خیال آنے لگے تھے۔نجانے اس کے ساتھ کیا وجہ ہے؟کیا وہ ناراض ہے؟ان سوالوں کے جواب میں نجانے کیسے کیسے خیال اس کے من میں اتر آئے تھے۔اس نے اپنے اندر ہی سے اٹھنے والے وہم اسے ڈراتے رہے۔کوئی ایسا متبادل ذریعہ بھی نہیں تھا کہ جس سے وہ کسی بھی معاملے کی تصدیق کرسکتی۔

نادی خود میں الجھی ہوئی تھی۔اختر ایک فون کال کی دوری پر تھا۔یہی یقین تھا اور یہی ایک رابطہ،وہ اس کے لیے محض ایک آواز ہی نہیں تھا بلکہ نجانے کتنے خوابوں کی بنیاد بن گیا تھا۔اس کا لہجہ نادی کے من میں سپنوں کا شہر آباد کر چکا تھا۔صرف اسی آواز نے اس کے ایوان ذہن میں کتنے چہروں کی تصویریں لگ چکی تھیں۔ہر چہرہ مکمل تھا مگر وہ کسی سے بھی مطمئن نہ تھی۔وہ نت نیا چہرہ تخلیق کرتی چلی جا رہی تھی۔بس اختر کی آواز تھی جو اس کی ذات کے گرد حصار بن کر چھا گیا تھا۔اور وہ لفظ لفظ اسے اپنی ذات میں یوں اتارتی چلی جا رہی تھی،جیسے بارش میں بھیگی ہوئی کوئی لڑکی،شفاف پانی کی ٹھنڈک اپنی روح تک محسوس کرے۔

نادی کی الجھن ایک خیال کی وجہ سے تھی جو اس کے ذہن میں دھوئیں کی مانند پھیل گیا تھا اور اس نے نادی کی ساری سوچیں مفلوج کر دی ہوئیں تھیں۔ اسے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اگر اختر گم ہو گیا اور اس سے رابطہ نہ ہو سکا تو پھر وہ اسے کیسے تلاش کر پائے گی۔ آواز کی کچی ڈور ٹوٹ گئی تو پھر وہ کس کے سہارے اس تک رسائی پا سکے گی؟ وہ کس طرح کے صحرا میں آ گئی ہے۔ جہاں نہ کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی منزل۔ غیر مادی سراب، جیسے وہ چھو نہیں سکتی۔ فقط اس کا احساس ہے۔ یہ بھی نہ رہا تو وہ کیا کرے گی؟ انہی لمحات میں کوئی شے چھن سے اس کے اندر ٹوٹ گئی تو وہ بے ساختہ چونک گئی، کیا وہ اختر کے لیے اتنا ہی جذباتی ہو گئی ہے؟ کہیں وہ اس سے محبت تو نہیں کرنے لگی۔ کیا وہ ایک رائیگاں سفر پر چل نکلی ہے؟ وہم، حیرت اور انکشاف نے اس کے اندر ہلچل مچا دی۔ وہ خود کو یقین دلاتے دلاتے تھک کو چور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کسی پری کی مانند خوبصورت منظروں میں اڑتی چلی جا رہی ہے۔ رائیگاں سفر کی تھکن اور اس کی آبلہ پائی کی دُکھن اس نے پورے وجود میں محسوس کی۔ تب اس کی آنکھوں سے چشمے ابل پڑے۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی ان تاریک منظروں میں جھانکنے لگی جو اس کے من میں بھی اتر آئے تھے۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب صبح کی اذان اس کے کانوں میں پڑی۔ تب وہ مایوس ہو کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

شعیب بائیک لے کر گھر سے نکلا تو اپنے ذہن پر خاصا دباؤ محسوس کر رہا تھا۔اس کا ارادہ تھا کہ وہ بھا حمید کی ورکشاپ جائے گا لیکن پارک سے سامنے سے گذرتے ہوئے اس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔اس نے بائیک پارکنگ میں کھڑی کی اور خود دھیمے قدموں سے چلتا ہوا ایک سنگی بینچ پر آ بیٹھا۔وہ ایک فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔کیونکہ رات جب وہ کھانا کھا چکا تو اس کی امی کچن سے چائے بنا کر لے آئی۔انہی لمحوں میں نادیہ کی کال آنا شروع ہوگئی۔اس نے دو بار نظر انداز کیا، پھر تیسری بار اس نے فون ''خاموشی'' پر لگا دیا۔اس کی امی بڑے غور سے اس کی الجھن دیکھ رہی تھی۔ان کے چہرے پر سنجیدگی تنی ہوئی تھی۔اس لیے شعیب نے مگ اٹھالیا اور کوئی بات نہیں کی۔تب اس کی امی نے ہی پوچھ لیا۔

''کون تنگ کر رہا ہے تمہیں؟''

''کوئی نہیں، امی بس یونہی۔۔۔''اس سے اپنی ماں کے سامنے جھوٹ بولا ہی نہیں گیا۔اس لئے ادھوری سی بات کر کے گرم چائے کا سپ لے لیا۔

''دیکھ۔!اب تو ایک انتظامی آفیسر بن جانے والا ہے۔جس کی اپنی ایک الگ سے منفرد حیثیت ہوتی ہے۔تمہیں عام لوگوں سے ذرا ہٹ کر رہنا ہوگا اور یہ لمبی لمبی کالیں تمہیں اب زیب نہیں دیتیں۔جان چھڑا لے ان سے جو تمہیں رات رات بھر سونے نہیں دیتیں۔''امی نے ڈھکے چھپے انداز میں اسے سرزش کی تھی۔

''بس امی، یہی ایک فون کال سنتا ہوں۔یہ فارغ دن ہیں نا۔۔جب مصروفیت ہوگئی تو یہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔''اس نے یونہی بے جا سی دلیل دے دی تھی۔

''میں جانتی ہوں بیٹا کہ تم کردار کے بہت اچھے ہو۔لیکن بعض اوقات معاملات اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ بندہ پھر چاہے بھی تو ان سے اپنا دامن نہیں بچا پاتا۔جذبات انسان کے بہکاوے کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔اس احتیاط بہتر ہوتی ہے۔باقی تم خود سمجھ دار ہو۔''امی نے بڑے دکھی لہجے میں اسے نصیحت کر دی تا کہ وہ محتاط رہے۔

''ٹھیک ہے امی، جیسا آپ چاہیں۔''اس نے مزید بحث نہ کرنے کی غرض سے فوراً بات مان لی۔

اصل میں شاعری کی وجہ سے بہت سارے لوگ اسے فون کالز کرتے تھے۔اسی تبصرہ وتنقید کے باعث اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کی شاعری پڑھنے والوں کا ردعمل کیا ہے۔نجانے کتنے لوگ آئے اور گئے۔کسی سے ایک آدھ بار بات ہوتی تھی، کسی سے چند دن یا پھر کوئی چند ہفتے بات کرتا رہتا۔یہ لوگ جس طرح آتے اسی طرح اندھیری دنیا میں غائب ہو جاتے۔یوں جیسے کبھی ملے ہی نہ ہوں۔کسی نے خود تعلق توڑ لیا اور کسی سے خود اس نے بات کرنا پسند نہ کی۔بات شاعری کے محور سے ہٹ کر، کسی اور راستے پر ڈالنے کی کوشش ہوتی، شعیب وہیں رک جاتا۔یہ فقط نادیہ ہی تھی، جس کے ساتھ تعلق کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔اس نے فقط شاعری پر بات کی تھی اور اسی حوالے سے زندگی کو سمجھنا چاہا تھا۔خود شعیب کے لیے یہ کردار بہت دلچسپ بن گیا تھا۔

''کیا سوچنے لگے ہو بیٹا۔''امی نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ چونک گیا۔

''کچھ نہیں۔''اس نے ایک ہی سانس میں چائے کا مگ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔امی نے مزید کوئی بات نہ کی اور خالی مگ اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔اسے معلوم تھا کہ سارے دن کی تھکی ہوئی ماں اب سو جائیں گی۔اس رات وہ نادیہ سے بات نہیں کر سکا۔اس نے فون بند کیا اور سو جانے کی کوشش کرنے لگا مگر ساری رات وہ یونہی بے چین رہا۔سوتے جاگتے اس نے وہ رات بتا دی تھی۔

وہ پارک کے پرسکون ماحول میں نادیہ ہی کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔صبح جب اس نے فون کھولا تو پیغامات کی بھرمار تھی جو رات بھر وہ وقفے وقفے سے بھیجتی رہی تھی۔اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ کسی سے تعلق نہیں رکھے گا۔لیکن کیا وہ نادیہ کو بھی چھوڑ دے گا؟ سوال اسے خود بے چین کیئے دے رہا تھا۔اس کی زندگی میں آنے والی وہ واحد لڑکی تھی جو بے ضرر ثابت ہوئی تھی۔وہ جتنی بھی باتیں کرتی بھی بھی،اس کے یا اس کی شاعری کے بارے ہی میں ہوتی تھیں۔کہیں بھی کسی لالچ کا شائبہ نہیں تھا۔وہ صرف اور صرف زندگی کے بارے میں باتیں کیا کرتی تھی۔نادیہ نے اپنی ذات کے اردگرد ایک حصار بنا رکھا تھا۔اور اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو اس حصار میں جھانکنے کی اجازت دے رہی ہو۔اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنی ذات کو الگ کر کے رکھا ہوا تھا۔وہ بینچ پر بیٹھا بہت دیر تک سوچتا رہا۔اس کے اپنے من میں کوئی ایسا تھا کہ سارے دلائل ہی نادیہ کے حق میں جا رہے تھے۔یہ الگ بات تھی کہ وہ اس سے ناطہ توڑے مگر اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔انہی لمحات میں نادیہ کا پیغام اس کے سیل فون پر آ گیا۔جس میں یہی سوال تھا کہ آخر وہ اپنی خاموشی کی وجہ تو بتا دے؟ تب جواز نہ ہونے کی کم مائیگی مزید بڑھ گئی۔شعیب نے لاشعوری طور پر اس کے نمبر پش کر دیئے۔چند لمحوں بعد ہی رابطہ ہو گیا۔

''اختر۔!ایسی کیا وجہ ہو گئی تھی جو آپ نے فون نہیں سنا۔''نادیہ کے لہجے میں انتہائی تجسس ملا خوف تھا۔

''بس یونہی،رات میری طبیعت خراب تھی۔اب ٹھیک ہوں۔''اس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ۔!مجھے ڈر تھا کہیں آپ گم ہی نہ ہو جائیں۔''وہ جھجکتے ہوئے خوشگوار لہجے میں صاف گوئی سے بولی تو شعیب کو اس کی معصومیت بہت اچھی لگی۔

''اور اگر میں کسی دن واقعی ہی گم ہو گیا تو۔۔؟''اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی کہ میرے ساتھ کیا ہو گا۔لیکن اتنا احساس ہے کہ میں زندگی کے خوبصورت ترین احساس سے محروم ہو جاؤں گی۔جو میری زندگی میں خوشگواریت لے آیا ہے۔''وہ جذب سے بولی

''کیا میرے ساتھ تعلق کو تم اتنی ہی اہمیت دیتی ہو۔''اس نے حیرت سے پوچھا۔انہی لمحات میں اسے اپنی امی کا خدشہ درست معلوم ہوا۔

''ہاں۔!ایسا ہی ہے۔اور یقین جانیں یہ انکشاف مجھے رات ہی ہوا تھا۔آپ کے تعلق سے اب میں اپنی تنہا اور سپاٹ زندگی میں خوبصورت اور من موہنے خیالوں کا ہجوم اپنے ہمراہ پاتی ہوں جو مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتے اور یہ بھی کہ اب مجھے سپاٹ زندگی کی اذیت سہنا پڑتی ہے۔''وہ پتہ نہیں کس حد تک جذباتی ہو چکی تھی۔

''فرض کیا میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں تو پھر۔۔؟''اس نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''جب وہ وقت آئے گا تو دیکھ لوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ پھر فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی ''تو میں آئندہ آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گی۔''

''بات یہ ہے نادیہ۔! میں بے روزگار بندہ، نوکری کی تلاش میں ہوں۔ مجھے ان چند دنوں میں ایک نوکری کی امید ہے۔ اگر یہ نوکری لگ گئی تو پھر وقت بے وقت کی مجبوری تو ہو جائے گی نا۔۔۔ راتوں کو دیر دیر تک کیسے باتیں کر سکیں گے۔۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اختر۔! آپ شاعر ہیں۔ آپ تو اس بات کو ضرور سمجھتے ہوں گے۔ بعض تعلق ایسے ہوتے ہیں اگر ان سے برسوں بات بھی نہ ہو تو بھی تعلق کے برقرار رہنے کا احساس رہتا ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں آپ کی کسی کامیابی میں آڑے نہیں آؤں گی۔'' وہ پرسکون انداز میں بولی۔

''ٹھیک ہے۔۔ اگر ہم بات نہ بھی کر سکے تو ہمارے درمیان خوشگوار تعلق کا خوبصورت احساس ضرور رہے گا۔'' اس نے کہا اور ایک دم سے پرسکون ہو گیا۔ رات سے جو لاشعوری پریشانی اس سے لپٹی ہوئی تھی وہ ایک لمحے میں اس سے آزاد ہو گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ چند دنوں میں نادیہ اسے بھول جائے گی۔ جس طرح وہ بہت سارے لوگوں کو بھول گیا ہے۔ نادیہ کے لیے فقط یہی تھا کہ دھیرے دھیرے اسے چھوڑ دیا جائے۔ بہانہ تو اس کے ہاتھ لگ ہی چکا تھا۔ انہی لمحات میں ایسا کچھ من میں در آیا تھا کہ جس سے پورے وجود میں انجانا غبار پھیل گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا، خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ پارک سے اٹھا اور بھا حمید کی ورکشاپ چل دیا۔

اگلے دو دنوں میں وہ بہت مصروف رہا تھا۔ نادیہ سے بات ہی نہ کر سکا۔ اسے سلامت نگر نامی قصبے میں جا کر ڈیوٹی کرنے کا حکم نامہ مل گیا تھا۔ سلامت نگر تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا اور وہاں کا سب سے بڑا انتظامی آفیسر متعین ہوا تھا۔ وہ قصبہ لاہور سے بہت دور تھا۔ شعیب سوچ میں پڑ گیا کہ پتہ نہیں وہاں کا ماحول کیا ہوگا۔ اس نے پہلے وہ علاقہ نہیں دیکھا ہوا تھا۔ ایسے میں وہ اپنے ساتھ امی کو لے کر جائے یا نہیں۔ اسی شش و پنج میں اس نے یہی فیصلہ کیا کہ شروع کے دنوں میں وہ خود وہاں کا ماحول دیکھے گا، پھر بعد میں حالات دیکھ کر اپنی امی کو بلا لے گا۔ وہ گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ اس کی امی نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔! پھر کہاں ملی تمہیں ڈیوٹی، میں بھی تمہارے ساتھ جا سکوں گی یا نہیں؟''

''امی۔! ابھی تو سوچ رہا ہوں۔ میں نے معلومات لی ہیں۔ وہ علاقہ بہت دور ہے یہاں سے، پتہ نہیں کیسا ماحول ہوگا سلامت نگر کا۔۔۔''

''کیا۔۔ کیا کہا تو ہے۔۔ کون سی جگہ ہے۔۔؟'' اس کی اماں نے ہذیانی انداز میں پوچھا تو شعیب چونک گیا۔ یہ اس کی امی کو کیا ہوا ہے ایک دم سے۔ اس نے جگہ کے بارے میں دوبارہ بتایا تو اس کی امی کی حیرت اتنی شدید تھی کہ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ جیسے وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی ہوں۔ شعیب کے لیے یہ ردعمل حیرت انگیز تھا۔ سلامت نگر کے نام سے ان کی یہ حالت ایسی کیوں ہو گئی تھی۔ تبھی اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اماں، کیا ہوا ہے آپ کو۔۔ آپ کی حالت ایسے کیوں ہو گئی ہے؟''

''ہیں۔! کچھ نہیں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔ تم اپنی ڈیوٹی بدلوا لو۔۔ کہیں اور چلے جاؤ۔۔'' وہ بے ربط سے لہجے میں بولی

''لیکن کیوں اماں؟''اس نے شدت سے پوچھا تو اس کی امی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم سے خود پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

''اتنی دور۔۔اگر نہ جاؤ تو بہتر ہے۔پہلی بار مجھ سے جدا ہو کر اتنی دور جا رہے ہو نا۔۔تو عجیب سی حالت ہو گئی ہے میری۔۔اتنی دور اگر نہ جاؤ تو بہتر ہے۔۔''اس کی امی نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔تب وہ اٹھا اور اپنی ماں کو اپنے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے بولا

''میں کوشش کروں گا کہ وہاں نہ جاؤں۔۔لیکن یہ سرکاری احکام ہیں۔لیکن پہلی بار اچھا نہیں لگتا۔میں جلدی وہاں سے تبادلہ کروا لوں گا۔۔یا پھر آپ کو بہت جلدی وہاں بلوا لوں گا۔۔۔اور اگر آپ میرے ساتھ ہی جانا چاہتی ہیں تو چلیں۔''اس نے حتمی انداز میں کئی سارے آپشن اپنی ماں کے سامنے رکھ دیئے۔

''تم بیٹا، جلدی سے تبادلہ ہی کروا لینا۔پھر کسی اچھی سی جگہ پر میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔۔۔''امی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔''اس نے کہا تو امی وہاں سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

''میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔''

امی کچن میں چلی گئی تو شعیب سوچ میں پڑ گیا۔امی نے کبھی بھی ایسے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔اگر ماں اپنے بچوں کے بارے میں جانتی ہے تو بچوں کو بھی ماں کی بدلی ہوئی معمولی سے حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔سلامت نگر کے نام پر وہ یوں جذباتی کیوں ہو گئیں تھیں۔یہ محض اس کی دوری کی وجہ سے تھا پھر کوئی اور بات تھی؟ کچھ تھا، ورنہ وہ یوں ایک دم سے کھو نہ جاتیں۔ایسا کیا تھا؟ کافی دیر تک سوچتے رہنے کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔پھر اس کی امی چائے لے آئی۔وہ اس موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی امی کی حالت دیکھ کر وہ ہمت ہی نہ کر سکا۔یونہی ادھر ادھر کی باتوں میں چائے ختم کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔اسے بہر حال سلامت نگر جانے کی تیاری کرنا تھی۔

☆☆☆

زبیدہ خاتون اپنے کمرے میں اندھیرا کیئے جاگ رہی تھی۔وہ بستر پر پڑی مسلسل سوچتی چلی جا رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔اس کے سامنے ایک اور امتحان آ گیا تھا۔زندگی کا ایک طویل حصہ جو اس نے ریاضت میں گذارا تھا، وہ رائیگاں جانے والا تھا۔وہ ماضی، جس سے وہ خود آنکھیں چرا جایا کرتی تھی۔شعیب سے کیسے بیان کر سکتی تھی۔ اگر بتاتی ہے تو اس کا بیٹا ٹوٹ کر رہ جاتا۔کتنی مشقت بھری محنت سے اس نے شعیب کو پروان چڑھایا تھا۔اپنے بیٹے کو وہ جس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی۔وہ اس مقام تک پہنچ گیا تھا۔اب اگر اس کے ماضی کی جھلک بھی اس پر عیاں ہو جاتی ہے تو وہ اپنے مقام کی اونچائی سے پستیوں میں جا گرتا۔یہی وجہ تھی کہ وہ سلامت نگر کا نام سنتے ہی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔مگر اسے اپنا آپ سنبھالنا پڑا۔وہ ماضی بے نقاب ہو جانے کے خوف سے خاموش ہو گئی تھی۔ورنہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شعیب کسی طور بھی وہاں جائے۔یہ وہی دیار تھا جہاں اس کا ماضی بکھرا پڑا تھا۔نجانے اسے کیوں یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر وہ سلامت نگر چلا گیا تو کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ماضی عیاں ہو جائے گا اور پھر جو طوفان اٹھے گا، اس کا سراسر نقصان ان دونوں ماں بیٹے کا تھا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شعیب کو سلامت نگر جانے سے روک لے۔اس کا وہاں جانا اسے قطعاً قبول نہیں تھا۔مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔زندگی اسے کس موڑ پر لے آئی تھی یہ تو اس

نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پھر سے اسے سلامت نگر سے واسطہ پڑسکتا ہے، جہاں پیر سائیں کی حویلی تھی۔ جس میں اس کا بچپن ہی نہیں، جوانی کے ایام بھی گذرے تھے۔

ان دنوں زبیدہ بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ عام لڑکیوں کی مانند اس کے من میں بھی خوابوں، خواہشوں اور امیدوں کا جہان آباد ہو چکا تھا۔ یقیناً ان میں اتنی شدت نہ ہوتی اگر وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح حویلی کے اردگرد بسی بستیوں میں سے کسی ایک بستی میں رہتی ہوتی۔ حویلی میں آباد پیر گھرانے کی وہ بھی ایک فرد تھی۔ لیکن عورت ہونے کے ناطے اس کی ذرا سی بھی حیثیت نہیں تھی جو ایک عام سی لڑکی کی ہوتی ہے۔ وہ روایات کی زنجیروں میں بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ ایک عام سی لڑکی کی طرح سانس لینے کی آرزو کی تھی۔ وہ پرندوں کی طرح آزاد فضاؤں میں اُڑنا چاہتی تھی۔ نیلے آسمان کو چھونے کی خواہش کرتی تھی۔ بادلوں میں تیرنے کی آرزومند تھی۔ مگر جیسے ہی خود کو دیکھتی، اسے اپنے پر بندھے ہوئے ملتے اور وہ بے بسی سے حویلی کی چار دیواری میں پھڑ پھڑا کر رہ جاتی۔ اس کی دنیا محض اتنی سی تھی کہ وہ ہر جمعرات کو دربار شریف پر اپنی ملازماؤں کے ساتھ چلی جاتی۔ وہ پورے جسم پر حجاب اوڑھے ہوتی۔ اس کی آمد پر وہاں موجود خواتین اس کے اردگرد جمع ہو جاتیں۔ وہ فاتحہ خوانی کے لیے تھوڑی دیر ٹھہرتی اور پھر پلٹ کر واپس حویلی آجاتی۔ بس یہ اس کی کل کائنات تھی۔

پھر ایک دم سے اس کی زندگی میں طوفان آگیا۔ اس نے کاشف کو پہلی بار دربار شریف پر ہی دیکھا تھا۔ وہ مزار کے اندر کھڑا پورے جذب سے محوِ دعا تھا اور زبیدہ مزار کے باہر کھڑی جالیوں میں سے اندر دیکھ رہی تھی۔ کاشف کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو گئی۔ یہاں دربار شریف پر آتے جاتے اس نے نجانے کتنے چہروں کو دیکھا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے من کے موسم میں ذرا سی بھی تبدیلی آجائے۔ اس کے اندر تو ایک طویل خزاں کا موسم بس چکا تھا۔ کاشف پر نگاہ پڑتے ہی موسم اچانک بدل گیا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ خزاں کے بعد اب بہار کی آمد آمد ہے۔ اس نے یوسفؑ اور زلیخا کا قصہ بڑی دفعہ سنا تھا۔ اسے کبھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ زنانِ مصر نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹ لیے تھے۔ اگر چہ وہ نہ تو زلیخا تھی اور نہ ہی سامنے کھڑا کاشف یوسف تھا مگر زبیدہ کو سمجھ آرہی تھی کہ زنانِ مصر کی انگلیاں کس طرح کٹ گئیں تھیں۔ اونچا لمبا قد، گلابی لشک مارتا ہوا سفید رنگ، بھرا بھرا جسم، بھاری مونچھیں، چھوٹے چھوٹے سیاہ بالوں پر سفید جالی دار ٹوپی، براؤن کرتے اور سفید گھیرے دار شلوار میں وہ کسی اور ہی جہاں کا فرد لگ رہا تھا۔ زبیدہ نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ کاشف نے فاتحہ خوانی کی، کچھ دیر مودب کھڑا رہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ زبیدہ کو یوں لگا جیسے اس کا اپنا آپ بھی اسی کے ساتھ چلا گیا ہے۔ وہ وہاں سے حویلی پلٹ آئی لیکن اسے یوں لگا جیسے وہ اپنا سب کچھ وہیں دربار پر چھوڑ آئی ہے۔ انسان کا ایک اپنا پن ہی تو ہوتا ہے اس کے پاس۔ وہ ہی نہ رہے تو پھر باقی کیا بچتا ہے۔

موسم خزاں میں جذبات کی ہلکی ہلکی پھوار میں جب ہجر کے بادل چھا جائیں تب پھوار تیز بارش میں بدل ہی جایا کرتی ہے اور بہار آنے کی نوید مل جاتی ہے۔ ایسے میں سوچوں کی نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ ابھی خوشبو نہیں پھیلی تھی مگر خوشبو کے احساس ہی سے وہ مدہوش ہونے لگی تھی۔ جذبات کی بارش میں بھیگی، خوشبو کے احساس سے مدہوش اور محدود سوچوں کے حصار میں قید وہ خود کو ایک نئے جہاں کا باشندہ تصور کرنے لگی۔ ساری دنیا ایک کاشف کی ذات میں سمٹ آئی تھی۔ جیسے یہ شائبہ تک نہیں تھا کہ کوئی اسے اتنا ٹوٹ کر چاہنے لگا ہے کہ اس کا اپنا آپ بھی نہیں

رہا۔وہ اگلی جمعرات دربار شریف پر گئی تو کاشف اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔وہ معمول سے کہیں زیادہ وقت وہاں رہی۔لیکن دیدار نہ پاسکی اور مایوس لوٹ آئی۔وہ دل ہی دل میں اسے دیکھنے کی حسرت لیے نجانے کتنی بار دعا کر چکی تھی۔پھر ایک دن اسے یوں لگا جیسے اس کی ساری دعائیں قبول ہوگئیں۔وہ حیرت سے بت بن گئی۔وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھی، جہاں سے حویلی کے مردان خانے کا تھوڑا سا صحن دکھائی دیتا تھا۔کاشف وہاں کھڑا اسے دکھ رہا تھا۔وہ ایک دم پسینے میں نہا گئی اور بے ترتیب سانسیں لیے کتنی ہی دیر تک اپنے بیڈ پر پڑے سوچتی رہی۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔۔۔

کاشف محکمہ انہار میں دوسرے درجے کا آفیسر تھا۔وہ محکمے کی طرف سے سلامت نگر آیا تھا۔اس وقت زبیدہ کے والد پیر سائیں تھے۔جنہوں نے اپنی زمینوں کے لیے نہر کے بندوبست کی خاطر عملے کو بلوایا تھا۔اسی لیے کاشف اور دیگر اہلکاروں کو مردان خانے میں رہنے کے لیے جگہ دی گئی۔وہیں سلامت نگر میں ان کا تین مہینے رہنے کا پراجیکٹ تھا۔وہ سب لوگ صبح کے نکلے، شام ڈھلے واپس آتے۔زبیدہ اور کاشف کی پہلی بار نگاہیں چار ہوئیں تو پھر یہ آنکھ مچولی چل نکلی۔وہ سارا دن اس کے انتظار میں گذار دیتی۔صبح کا ذرا سا وقت یا پھر شام کو تھوڑی سی دیر کے لیے وہ اسے دیکھ سکتی تھی۔اس سے بات کرنے کی خواہش دن بدن بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔لیکن حویلی میں رہتے ہوئے ایسا ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔زبیدہ کی خاص ملازمہ شرماں مائی کو اس کی دلچسپی کے محور کے بارے معلوم ہوگیا۔وہ اس راز سے واقف ہوئی تو ایک راستہ نکل آیا۔ان دونوں کے درمیان پیغام رسانی کا وہ واحد ذریعہ بن گئی۔جس کے باعث دونوں میں تعلق پروان چڑھنے لگا۔شرماں مائی پر تو نوازشات کی بارش ہونے لگی۔تقریباً دو مہینے یونہی گذر گئے۔شرماں مائی کا کچا گھر پکا ہوگیا اور زبیدہ کو احساس ہی نہیں ہوا کہ دن کس طرح گذر گئے۔ورنہ تو اس حویلی میں دن گذارنا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔ان دونوں میں تعلق اس عروج پر آ گیا کہ ملنے کی خواہش انہیں بے جان کرنے لگی۔

ایک شام زبیدہ کو یہ پیغام ملا کہ مردان خانے میں کوئی نہیں ہے۔سارے ساتھی اہلکار اپنے اپنے گھروں کو گئے ہوئے ہیں۔اگر کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو آ جائے۔موقعہ ہے۔پیغام ملتے ہی وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگی۔رات ذرا گہری ہوئی تو شرماں مائی کی وساطت سے وہ مردان خانے میں جا پہنچی۔پورے جسم کو وہ بڑی سی چادر میں لپٹائے اندھیرے ہی کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔دالان میں کھڑا کاشف اس کا منتظر تھا۔وہ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو کتنی دیر تک وہ ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔بس نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو اپنے من میں اتارتے رہے۔زبیدہ کا دل پورے وجود سمیت دھڑک رہا تھا۔کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے۔تب کاشف نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''زبیدہ۔!میں جانتا ہوں کہ ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔جسے نہ تم پار کر سکتی ہو اور نہ میں۔کیوں نہ ہم اپنے بڑھتے قدموں کو روک لیں، ورنہ پچھتاوا ہمارا مقدر بن جائے گا۔

''میں تو یہ فاصلہ کب کا پار کر چکی ہوں۔ہاں، اگر آپ نہ پار کر سکتے ہوں تو یہ الگ بات ہے۔اسے میں اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لوں گی۔'' اس نے مایوسی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''جذبے اگر سچے ہوں نا تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔میری بات چھوڑو، اپنی کہو، صرف باتوں سے یا خیالوں میں فاصلے پار نہیں ہوا کرتے۔حقیقت کچھ اور ہے۔میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی عتاب نازل ہو'' اس نے پورے خلوص سے کہا۔

''آپ مجھے اپنے مضبوط سہارے کا احساس دلا دیں۔ میں آپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کو تیار ہوں۔ اس سفر میں چاہیں جتنی مشکل آئے۔'' وہ محبت سے سرشار لہجے میں بولی۔

''اگر ایسی بات ہے تو چلو، اس دنیا سے نکل چلتے ہیں اور دور کہیں اپنی دنیا بسا لیتے ہیں۔'' کاشف نے اچانک فیصلہ کن انداز میں کہا تو وہ پوری جان سے چونک گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ حویلی سے باہر کی دنیا میں بھی سانس لے سکتی ہے۔ کوئی نئی دنیا بھی بن سکتی ہے۔ اُسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی شادی نہیں ہو پائے گی۔ اس کا احساس بہت پہلے اسے دلا دیا گیا تھا اور اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ ساری زندگی اسی حویلی میں گذرنی ہے۔ یہی وہ لمحات تھے جب زبیدہ نے بھی فیصلہ کر لیا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' اس نے ایک دم سے اپنے فیصلے کا اظہار کر دیا۔

''تو جاؤ، واپس چلی جاؤ اور اس لمحے کا انتظار کرو، جب میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔'' کاشف نے اس یقین واعتماد سے کہا کہ پورے وجود سے بھیگ گئی۔ وہ انہی قدموں پر پلٹ کر اپنے کمرے تک آن پہنچی اور اسی وقت سے اس لمحے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ پھر وہ کبھی نہیں ملے۔ بس ایک دوسرے کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ دن یونہی انتظار میں گھلتے رہے۔ تب ایک شام شرماں مائی نے زبیدہ خاتون تک یہ پیغام پہنچایا کہ آج رات یہاں سے نکل جانا ہے۔ وہ لمحہ لمحہ انتظار کرتی ہوئی اس لمحے تک آن پہنچی، جب اس نے حویلی سے باہر قدم رکھ دیا۔ وہ کاشف کے ساتھ، حویلی سے بہت دور لاہور کی گنجان آبادی میں آ گم ہوئی۔ کاشف اسے اپنے گھر نہیں رکھ سکا۔ کیونکہ وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بعد میں ہوا بھی ایسے ہی تھا۔ وہ تو نکاح کے بعد ایک الگ گھر میں رہنے لگے اور حویلی والے کاشف کو تلاش کرتے اس کے گھر والوں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے محکمانہ دفتر ہی کو ذریعہ بنایا تھا۔ کاشف نے چھٹی لے رکھی تھی۔ حویلی والوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ زبیدہ اور کاشف نکاح کر چکے ہیں اور زبیدہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے تو خاموشی چھا گئی۔ کاشف ان کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔ کاشف ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کا بڑا بھائی ظاہر شاہ ان دونوں کے حق میں تھا لیکن چھوٹا دلاور شاہ ان کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔ یہ تو کاشف کے آفیسر درمیان میں پڑ گئے اور قانونی چارہ جوئی کے بعد بات عدالت تک جانے والی تھی کہ اچانک ایسی خاموشی چھائی تھی کہ جیسے اس کا وجود حویلی والوں کے لیے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہاں حویلی میں کیا ہوا، کیا نہیں ہوا؟ اسے کوئی خیر خبر نہ ملی تھی۔ وہ ان سے دور کیا ہو گئی کہ سب کچھ بھول کر اپنی دنیا میں کھو گئی۔ یہاں تک جب شعیب چند سال کا ہوا تو کاشف اس دنیا میں نہ رہا۔ زبیدہ نے وہیں بسیرا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سامنے اپنے بیٹے کی پرورش تھی۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب ٹھہری تھی۔ زندگی بڑے سکون سے گذر رہی تھی کہ اس کی زندگی میں پھر سے سلامت نگر آ گیا۔ وہ ساری رات اپنی بے بسی سے الجھتی رہے تھی۔ جس وقت اذانیں ہونا شروع ہوئیں تو اسے اپنے ماضی سے پلٹنا پڑا۔ انہی لمحات میں اس نے ایک دم سے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے پر اس وقت تک یہ راز افشا نہیں کرے گی، جب تک حالات ایسا نہیں چاہیں گے۔ ممکن ہے بہت جلد اس کا تبادلہ ہو جائے۔ اس کا راز، راز ہی میں رہے اور اس کا مان یونہی برقرار رہے۔ تب اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ نہ جانے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ کہیں کوئی جذباتی لمحہ اس کا ماضی کھول کر نہ رکھ دے اس نے یہ سب طے کیا اور پرسکون ہو کر اٹھی اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی۔

☆☆☆
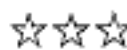
نادی بڑے اضطراب میں دن گذار رہی تھی۔ جیسے تپتے صحرا میں کوئی آبلہ پا اور تشنہ لب مسافر اچانک نخلستان دیکھ لے اور پھر جیسے ہی نخلستان کے قریب پہنچے تو یہ معلوم ہو کہ یہ تو سراب تھا۔ اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اس تشنہ لب و آبلہ پا مسافر کی کیفیت کیا ہوگی؟ نادی بھی ان دنوں ایسی ہی کیفیت سے گذر رہی تھی۔ اسے شعیب کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ نجانے اسے کیا ہوگیا تھا؟ وہ تو ایسا سوچ رہی تھی کہ جیسے دو چلتے ہوئے مسافر بہت خوشگوار ماحول میں جا رہے ہو تو اچانک ایک مسافر بنا کوئی وجہ بتائے بے دلی سے اپنا راستہ بدل لے۔ شعیب کے بے مروت ہو جانے کی وجہ اس کی سمجھ میں آ جاتی تو شاید اسے سکون آ جاتا۔ مگر نہ تو وہ کوئی وجہ بتا تا تھا اور نہ ہی کوئی بات کرتا تھا۔ اسے بات کرنا تو نہیں کہتے نا کہ ذرا سی گفتگو جو فقط حال احوال تک محدود ہو۔ کہاں گھنٹوں انجان جزیروں کی سیر کرتے رہنا اور کہاں محض آمنے سامنے آ کر ایک درسرے کو دیکھ کر راستہ بدل لینا۔ وہ تو اس کے لہجے اور آواز کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ اب کہیں سکون ہی نہیں ملتا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ لفظ کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور پھر ایسے لفظ جو خوبصورت آواز کے ریشمی لہجے میں لپٹے ہوئے ہوں۔ اس کے سیل فون میں فقط ایک شعیب ہی کا نمبر تھا اور وہ کئی دنوں سے اجنبی بن گیا تھا۔ وہ ایک بار اس کی شاعری کے مجموعے بارے بات کر کے بہت پچھتائی تھی۔ شاید وہ تجویز اسے اتنی بری لگی تھی کہ اس کا رویہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ اس کچے دھاگے جیسے تعلق کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جس سے یہ نازک سا تعلق ٹوٹ جائے۔ بے مروتی والا ہی سہی، تعلق تو ہے نا؟ شعیب نے تو یہی کہا تھا کہ اسے نوکری مل گئی ہے اور اب وہ مصروف ہوگیا ہے۔ ان کے درمیان یہی مختصر سی گفتگو ہوا کرتی تھی اور وہ اسی پر قناعت کر چکی تھی۔ چند منٹ کی گفتگو کے لیے وہ پورا دن انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن ایک بے چینی تھی جو مسلسل اس کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ جس کی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اور پھر اس دن اسے سمجھ آ گئی جب دادی اماں سے باتیں کرتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ ظہیر شاہ دو ہفتوں کے لیے پاکستان آ رہا ہے۔

''تو کیا پیر سائیں اپنی بات منوانے کے لیے ظہیر شاہ کو پاکستان بلوا رہے ہیں یا مجھے سزا دینے کے لیے؟'' نادی نے حیران ہوتے ہوئے اپنی دادی سے سوال کیا۔ جس کے جواب میں وہ انتہائی دکھ سے بولیں۔

''اس نے کیا اپنی بات منوانی ہے یا تجھے سزا دینی ہے۔۔ وہ تو جو کچھ کر رہا ہے، اپنے لئے کر رہا ہے۔ اس کی تو بس یہی خواہش ہے کہ ہر انسان اس کی مرضی کے مطابق چلے۔۔۔''

''دادی اماں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہر کوئی ان کی مرضی سے کیسے زندگی گذار سکتا ہے۔ میں اگر ان کی بات ماننے سے انکار کر دوں تو پھر کیا ہوگا؟'' وہ جذبات میں آ کر اپنی رو میں کہہ گئی تو دادی اماں چونک گئیں۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو، وہ تمہیں جیتے جی مار دے گا۔ تمہاری آواز تک نہیں نکلے گی۔۔۔'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولیں۔

''پہلے ہی ہمارا شمار زندوں میں کہاں ہوتا ہے۔ ہم تو ان کے لیے کٹھ پتلیاں ہیں۔ روایات کی ڈور سے وہ ہمیں اپنی مرضی سے حرکت کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔ میں اگر اپنی زندگی ختم کر لوں۔ تو پھر وہ کیا کریں گے۔'' نادی نے غصے میں کہا تو دادی نے پھر سے چونک کر دیکھا۔ پھر نرم لہجے میں بولیں۔

''ہم اپنی قسمت کا لکھا ہوا بھگت رہے ہیں نادی۔۔۔اور۔۔۔''

''نہیں۔۔نہیں دادی اماں۔۔۔میں کم از کم اسے قسمت کا لکھا ہوا نہیں مانتی۔یہ تو ظلم ہے سراسر ظلم۔'' اس کی آواز میں بغاوت کی مہک تھی۔تب دادی اماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ بیٹی۔!اس حویلی کی چاردیواری سے باہر کی جو دنیا ہے نا۔وہ بھی کوئی اتنی حسین نہیں ہے۔چونکہ تمہیں اس کا تجربہ نہیں ہے۔اس لئے وہ تمہیں حسین لگتی ہے۔اس چاردیواری میں کم از کم تحفظ کا احساس تو ہے نا۔۔سمجھ لو کہ ہماری دنیا فقط حویلی کی چاردیواری تک محدود ہے۔اب تم اسے قسمت سمجھو یا نہ سمجھو، یہ تو تمہارا اختیار ہے نا۔۔''

''پنجرہ چاہے سونے کا بھی ہو نا دادی اماں، اس میں رکھا گیا پرندہ قیدی ہی ہوتا ہے۔کھلی فضاؤں میں اڑنے کی لذت، قید میں پڑا پرندہ کیا جانے۔'' اس نے دلیل دی۔

''تمہیں اس حقیقت کا احساس نہیں ہے نادی کہ آزادی کی قیمت بہر حال ادا کرنی پڑتی ہے۔یہ کبھی مفت میں ہاتھ نہیں آتی۔کھلی فضاؤں میں اڑنے والے پرندے کی اُڑان بڑی پرکشش ہوتی ہے۔لیکن گھونسلہ ہوا میں نہیں بنایا جا سکتا۔کھلی فضا کے خطرات کیا ہیں، تم ان کے بارے میں کیا جانتی ہو۔ہمارے معاشرے میں عورت کی قسمت یہی ہے کہ وہ گھر کی چاردیواری میں قید ہو کر رہے۔اسے یہاں کی آزاد فضائیں راس نہیں آتیں۔باہر کی دنیا میں ان گنت شکاری ہیں۔اگر وہی پر کاٹ کر قید کر لیں تو۔۔؟ آزادی تو پھر بھی نصیب نہ ہوئی؟'' دادی اماں نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا یہ دنیا ہمارے لئے اتنی ہی تنگ ہے، کہیں بھی اماں نہیں۔'' اس نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

''ہاں شاید ان کے لیے نہیں، جن کے سہارے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔یہاں کم از کم اتنا تحفظ تو ہے نا کہ کوئی ہے جو ہمارا محافظ ہے۔اگر باہر آزادی کی قیمت چکانا پڑتی ہے تو یہاں تحفظ کے عوض بھی تو کچھ دینا پڑتا ہے اور! میرے خیال میں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔'' دادی اماں نے اپنی دانست میں حویلی کی وکالت کرتے ہوئے کہا تو نادی سوچ میں پڑ گئی۔دادی اماں نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی تھی۔کیا وہ ظہیر شاہ سے شادی کے لئے مجھے ذہنی طور پر تیار کر رہی ہے؟ کیا اب اسے اپنے فیصلے خود ہی کرنا پڑیں گے۔یا پھر حالات کے آگے سر جھکاتے چلے جانا چاہیے؟ کیا زندگی اتنی ہی تلخ ہے کہ قدم قدم پر اس کی قیمت چکانا پڑتی ہے؟ نادی کی سوچ کا محور بدل گیا۔جیسے جیسے ظہیر شاہ کی آمد والا دن قریب آ رہا تھا، اسے حویلی کی فضا سے خوف آنے لگا تھا۔وہ تو اس سے شادی کا بندھن باندھ کر چلا جائے گا اور پھر وہ اسی چاردیواری میں یونہی پڑی رہے گی۔جیسے پہلے تھی۔نکاح کے چند بولوں کے عوض وہ اپنی زندگی ظہیر شاہ کے ہاتھوں ہار دے گی اس کے من میں غبار بڑھتا ہی چلا گیا اور اس غبار کی واحد نکاسی کا راستہ آنسو ہی، جو وہ بہادیا کرتی تھی۔

اس رات اختر نے فون کیا تو اس کا دل شدت سے چاہا کہ اپنی ہر بات اس سے شیئر کر لے۔اسے اپنے بارے میں ایک ایک بات بتا دے لیکن وہ اپنا دکھ ہونٹوں پر لاتے لاتے ایک دم سے خاموش ہو گئی۔نجانے اس کا رویہ کیا ہو؟ وہ جو اپنے دکھ اس کے سامنے لے کر بیٹھ جائے گی، وہ خود تو دکھی ہے ہی، اسے خواہ مخواہ کیوں پریشان کرے۔ایسا کرتے ہوئے اپنا آپ بارے بھی بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے؟ ممکن ہے وہ یہ سوچے کہ پہلے

کیوں جھوٹ بولا تھا؟ یا پھر اب وہ جھوٹ بول رہی ہے؟ یہ تو حقیقت ہے نا کہ اس نے اپنے بارے سچ نہیں بتایا تھا۔ سچ سامنے آنے پر ہوسکتا ہے وہ متنفر ہو جائے۔ اگر وہ متنفر نہ بھی ہوا تو اس کا اعتبار نہیں رہے گا۔ تعلق تو فقط اک آواز ہی کا ہے نا، جو کچھ وہ کہہ چکی ہے اب اسی پر قائم رہنا ہوگا۔

''کیا بات ہے نادیہ آج تم بڑی مایوس سی لگ رہی ہو، تمہارا لہجہ وہ پہلے والا نہیں ہے۔'' اختر نے یونہی عام سے لہجے میں پوچھا تو وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے، آج یونہی دل اداس سا ہے۔''

''میں نہیں مان سکتا۔ کیونکہ میری باتوں پر تمہاری توجہ بالکل نہیں ہے۔ میرے خیال میں تجھے نیند آرہی ہے۔ اب تمہیں سو جانا چاہئے۔'' اختر نے اس کی حالت بارے تجزیہ کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

''سچ پوچھیں نا، تو میں آج واقعی ہی ڈسٹرب ہوں۔'' اس نے منتشر لہجے میں کہا۔

''بات کیا ہے۔'' وہ تجسس سے بولا

''بس یونہی، آج سوچ رہی تھی کہ یہ کتابوں، رسالوں، قصے کہانیوں کی جو دنیا ہے نا، یہ بالکل الگ تھلگ سی کیوں ہے۔ ایسا ہماری دنیا میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ فرق کیوں ہے؟ حقیقی زندگی کیا ہے؟'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

''میں تمہیں بتاؤں، دنیا سرے سے حقیقت ہے ہی نہیں۔ زندگی جیسے دکھائی دیتی ہے نا، ویسی ہے ہی نہیں۔ افلاطون وسقراط سے لے کر آج تک کے دانشوروں نے اس دنیا کے بارے میں نجانے کیا کچھ کہا ہے۔ لیکن کوئی بھی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکا، کیونکہ سب میں اختلاف ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تو پھر اصل حقیقت کیا ہے؟'' نادی الجھتے ہوئے بولی۔

''تمہارا اپنا پن۔ تم اپنے اندر سے کیا ہو۔ جیسی تم ہوگی۔ یہ دنیا بھی ویسی ہی بنتی چلی جائے گی۔ تم اندر سے بدل جاؤ گی تو یہ دنیا بھی بدل جائے گی۔ تمہیں فقط اپنا آپ دیکھنا ہوگا'' وہ پرسکون انداز میں بولا۔

''اختر۔! مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آرہیں۔ اور نہ ہی میں ان میں الجھنا چاہتی ہوں۔ میں تو فقط اتنا چاہتی ہوں کہ آپ کے حالات ہی آپ کی دنیا ہے۔ جس سے لڑتے لڑتے ہمیں ختم ہو جانا ہے۔ یہی زندگی ہے اور یہی اس کی حقیقت۔۔۔'' اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تمہاری سوچ اور نکتہ نگاہ سے اختلاف نہیں کروں گا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ حالات سے نبرد آزمائی زندگی کی مختلف طرح سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر ہم اتنی بھاری باتوں میں کیوں الجھ گئے۔ جس کا کوئی نتیجہ ہمارے ہاتھ نہیں آنے والا۔۔۔'' اس نے کافی حد تک چہکتے ہوئے کہا تو نادی سب کچھ بھول کر اس کی باتوں میں کھو گئی۔ اس رات وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یونہی زندگی کے رنگوں کی باتیں، نادی کو یوں لگا جیسے وہ بہت دنوں کے بعد آسمانوں کی سیر کے لیے نکلی ہو۔ رات گئے فون بند ہوا تو سارے خیالوں کو ذہن سے نکال کر اختر کی باتوں کی بارش میں بھیگتی رہی اور پھر نجانے کب سو گئی۔ اس رات نادی نے خوابوں میں وہ کچھ دیکھا جو کبھی وہ کھلی آنکھوں سے سوچتی رہتی تھی۔ اسے لگا زندگی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے۔

☆☆☆
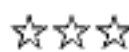
شعیب کو سلامت نگر آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ اسے وہ تمام سہولیات مل گئیں تھیں جو شہر کے بڑے انتظامی آفیسر کو مل جایا کرتی ہیں۔ یہ سہولیات تو گویا اس کے انتظار میں تھیں لیکن یہاں آکر اسے شدت کے ساتھ تنہائی کے احساس نے گھیر لیا۔ اگرچہ یہ دونوں ہی دن شہر کے لوگوں اور ماتحت عملے سے تعارف کرتے ہی گذرا تھا تاہم رات کے سناٹے نے اسے بہت ڈسٹرب کیا۔ اس نے آتے ہی کام کی نوعیت کو دیکھا سمجھا اور پرکھا بھی۔ مصروفیات میں دن ختم ہونے کا پتہ بھی نہیں چلا تھا مگر رات ہوتے ہی اکیلا پن بھی اتر آیا۔ پہلی رات اسے جب اپنی امی یاد آئیں تو اس نے جھٹ فون کر لیا۔ سارے دن کی روداد سنائی۔ امی نے بہت حوصلہ دیا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ اس کی ممتا اس کے ساتھ ہی ہے۔ پھر نادیہ بہت یاد آئی، اس کی کومل اور نرم باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی چلی گئیں۔ مگر یہ ساری یادیں، اس کی آواز کا نعم البدل نہ بن سکیں۔ کروٹوں میں گذری ہوئی رات تو اپنا اثر دن میں ہی دکھاتی ہے۔ اگلا دن بھی یونہی مصروفیت میں ختم ہوتے پتہ ہی نہ چلا۔ کب دن ڈھلا اور رات سر پر آ گئی۔ اس کے لئے تو یہ کھٹن لمحات تھے جو گذارے نہیں گذر رہے تھے۔ فطری طور پر تو اسے آرام کرنا چاہئے تھا۔ مگر وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ نیند اور محبت میں بھلا کب بنی ہے، اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی بندے کو بھوک تو لگی ہو مگر کچھ بھی کھانے کو جی نہ چاہے۔ ایسا کن حالات میں ہوتا ہے، یہی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے بار بار نادیہ ہی کی یاد آ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر میں نے فون کر لیا تو پھر میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔ وہ میری عادت بن جائے گی۔ کیا کروں، رابطہ کر لوں اور پھر اسے نبھاؤں یا پھر خود پر جبر کر لوں۔ وہ رات بھی یونہی بیت گئی اور وہ کشمکش ہی میں رہا۔ اسے فون تو نہ کر سکا لیکن الجھن تھی کہ بڑھ گئی تھی۔

نادیہ کو فون نہ کرنے کے لئے اسے خود سے لڑنا پڑ رہا تھا۔ کیا نادیہ اس کی مجبوری بن گئی ہے؟ یہی سوال اسے سارا دن تنگ کرتا رہا۔ دن بھر کا وہی معمول اور رات کا وہی سناٹا اپنے ہمراہ کشمکش بھی لے آیا۔ اس وقت وہ دالان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا نے خوشگواریت کا احساس دے دیا ہوا تھا۔ ایسے میں نادیہ کی یاد نے انتہائی شدت سے مجبور کر دیا کہ وہ اسے کال کرے۔ اس نے سیل فون اپنے ہاتھوں میں لیا اور کتنی دیر تک سوچتا رہا کہ اسے فون کرے یا نہیں۔ پھر اس نے فون کر دیا جو فوراً ہی ریسو کر لیا جیسے کوئی اسی کے فون کا منتظر ہو۔

”کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ نادیہ نے یوں پوچھا

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بھی اختصار سے جواب دیا۔

”کوئی کام ملا“ نادیہ نے سوال کیا تو ایک دم سے شعیب نے اپنی پوزیشن کے بارے میں بتا دینا چاہا۔ لفظ لبوں تک آئے بھی مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ وہ کیا سوچے گی، کیا میں اب تک اس سے جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ کیا وہ پھر مجھ پر اعتماد کرے گی؟ اور پھر میں نے اسے بتانا ہی کیوں ہے؟ ”میں نے کیا پوچھا ہے؟“ نادیہ نے پوچھا تو ایک دم سے چونک گیا اور بولا۔

”نہیں۔“

”ابھی تک اسی ورکشاپ میں کام کر رہے ہو؟“

”ظاہر ہے، جب تک کوئی ڈھنگ کا کام نہیں مل جاتا۔ یہ تو چلے گا،“ اس نے آہستہ سے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہل جائے گا کام، موڈ خوشگوار کریں۔'' نادیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو ان میں باتوں کا سلسلہ چل نکلا، جو دراز ہوتا چلا گیا۔ وہ رات میٹھی باتوں میں گذر گئی۔ اسے لگا جیسے تنہائی کا بہت ہی پر خلوص ساتھی مل گیا ہو۔ جس کا ساتھ ہو تو وقت گذرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اس صبح جب وہ بیدار ہوا تو بہت ہی خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس دن آفس میں دوپہر سے ذرا قبل اس کے ایک ماتحت نے نہایت پر تکلف چائے کا اہتمام کیا۔ خوشگوار ماحول میں چائے پینے کے بعد اس نے خاصے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''سر! یہ ایک فائل ہے میرے پاس۔ مگر یہ آپ کو پیش کرنے سے پہلے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی بولیں۔ ایسی کیا بات ہے؟'' شعیب نے انتہائی تحمل سے کہا۔

''یہ فائل یہاں کے سب سے بااثر معتبر شخصیت کی ہے، ان کا شمار بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے اتنے سرگرم نہیں لیکن ووٹ بنک کی وجہ سے سیاست میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مریدین کا ایک وسیع حلقہ رکھتے ہیں۔ نام ان کا ولاور شاہ المعراف پیر سائیں ہے۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے اس تحمل سے پوچھا تو ماتحت اہلکار نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''میں نے جو اتنا تعارف کروایا ہے، اس سے آپ نہیں سمجھے کہ ان کا کام ہمیں بہر حال کرنا پڑتا ہے۔ جس آفیسر نے بھی ان کے ساتھ بنا کر رکھی ہے۔ انہوں نے بڑا پر سکون وقت گذارا ہے۔ اور جب گئے ہیں تو بہت خوش گئے ہیں۔ ایک طرح سے ان کا تحفظ مل جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں اس علاقے میں کر سکتے ہیں۔''

''ہونہہ۔!'' شعیب نے ہنکارا بھرا تو وہ بولا

''میں نے ان کے بارے میں آپ کو معلومات دے دی ہیں اور اس کے ساتھ ایک مشورہ بھی دینا چاہتا ہوں۔''

''کیسا مشورہ؟'' اس نے سکون سے پوچھا۔

''اس فائل میں ان کا ایک چھوٹا سا کام ہے۔ آپ یہ فائل لے کر ان کے پاس حویلی چلے جائیں۔ تعارف بھی ہو جائے گا اور۔۔۔'' ماتحت نے کہنا چاہا مگر اس نے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں، ماضی میں اگر ایسا ہوتا رہا ہے تو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مگر شاید اب ایسا نہ ہو۔ کم از کم میں یہاں جب تک ہوں۔ آپ پھر مجھے کبھی ایسا مشورہ مت دیجئے گا۔ ان کا اگر کوئی جائز کام ہے تو وہ کرنے کے لئے ہی ہم یہاں ہیں۔ عام آدمی کے کام کی طرح ان کا کام بھی ہو گا۔ ناجائز کام کی فائل میرے سامنے مت رکھئے گا۔ مجھے ان کی حویلی میں نہیں جانا۔ چاہے وہ جتنے بڑے آدمی ہیں، یا وہ جتنا زیادہ اثر رکھتے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' اس نے بڑے آرام سے اپنے ماتحت کو سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ ماتحت حیران رہ گیا۔ وہ چند لمحے اسی حیرت میں رہا، پھر بولا۔

''سر۔! بہت مشکل ہو جائے گی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ۔۔۔''

''مجھے اندازہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گیا، وہ اپنا آپ خود مجھے دکھادے گا۔ مجھے ایک مجبور اور بے بس انسان کا کام کر کے زیادہ خوشی ہو گی۔اب آپ جاسکتے ہیں۔ چائے کا بل مجھے بھجوا دیں۔''شعیب کا تحمل وہی رہا تھا۔تب ماتحت وہاں بیٹھا نہیں رہا بلکہ فائل سمیت وہاں سے چلا گیا۔

شعیب ان تین دنوں میں اندازہ کر چکا تھا کہ اسے کس سے اور کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔جس کے لئے وہ ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔وہ دفتری اوقات کے آخری لمحے تک بیٹھتا اور پھر اپنی سرکاری رہائش گاہ چلا جاتا۔سہ پہر کے وقت وہ فون پر اپنی والدہ سے بات کرتا اور یہ تاثر دیتا کہ وہ یہاں آکر بہت خوش ہے۔اگر چہ یہاں کوئی مسئلہ نہیں پھر بھی وہ جلد از جلد تبادلہ کروانے کی کوشش کرونگا۔پھر دفتر سے لایا ہوا کام دیکھتا، وہ اپنی تنہائی اسی طرح ختم کرسکتا تھا۔رات ہوتے ہی جب وہ بیڈ پر آتا تو نادیہ کی یاد بھی خوشبو کی مانند مہک اٹھتی۔تب وہ شعیب سے اختر رومانوی بن جاتا۔نادیہ سے گفتگو کرتا جو طویل ہو جاتی۔تنہائی دور کرنے کی غرض سے کی گئی گفتگو اسے خود بہت اچھی لگی تھی۔یوں چند دن آگے سرک گئے۔

اس شام وہ پرانے طرز کی اسی سرکاری رہائش کے دالان میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔آسمان پر سرمئی بادل چھا گئے ہوئے تھے۔یوں لگ رہا تھا کہ موسم بھیگ جائے گا۔پھر وہی ہوا، ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔اسے نادیہ بہت یاد آنے لگی۔اس کا من چاہنے لگا کہ اسے فون کرے۔ایسے میں نادیہ کی فون کال آگئی۔

''ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے؟''اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ پوچھو کہ ڈسٹرب ہونے سے کس حد تک بچایا۔''اس نے شوخی سے کہا۔

''کیا مطلب۔؟''وہ حیران ہوتے ہوئے بولی

''مطلب کہ میں اس وقت خاصا بور ہو رہا تھا اور کچھ کچھ تھکن بھی محسوس کر رہا تھا۔''اس نے اپنی حالت کا اظہار کر دیا۔

''اُوہ۔!''اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، پھر وہ بھی شوخ لہجے میں بولی۔''اس طرح کے حال میں ہو آپ۔ویسے میں تو بوریت کی وجہ سے ڈسٹرب ہو رہی تھی۔اس لئے سوچا آپ کو تنگ کروں۔ممکن ہے میری گفتگو سے کوئی شعر ہی نازل ہو جائیں۔''

''ممکن ہے، ایسا ہو جائے۔۔ویسے میرا بھی جی چاہ رہا تھا باتیں کرنے کے لئے۔''اس نے صاف انداز میں کہہ دیا۔

''کیا میری ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ ان سے کسی شعر کے لیے بنیاد مل جائے؟''وہ حیرت سے بولی

''ہاں! یہ جو لفظ ہوتے ہیں نا، ان کی ایک روح ہوتی ہے۔پھر جس طرح کے جذبے میں بھیگ کر یہ لفظ زبان سے ادا ہوتے ہیں تو اپنا تاثر ویسا ہی رکھتے ہیں۔جذبوں میں بھیگے ہوئے لفظ جب مخاطب پر اثر انداز ہوتے ہیں، تب پھر ردعمل تو ہوتا ہی ہے نا۔۔''اس کا لہجہ کافی حد تک خمار آلود ہو گیا تھا۔

''یہ تو ہے جس طرح آپ کے لفظ مجھے یوں محسوس ہوتے ہیں۔جیسے صحرا میں اچانک بارش ہو جائے۔یقین جانیں میری بے رنگ زندگی میں رنگ بھر جاتے ہیں۔تتلیوں کے جیسے لفظ پکڑتے پکڑتے مجھے ہوش ہی نہیں رہتا کہ میں کانٹوں بھری راہگذر پر ہوں۔بہت حوصلہ دیتے ہیں مجھے آپ کے لفظ۔''وہ جذب میں کہتی چلی گئی۔

''اب دیکھو نا، تم بھی شاعری کرنے لگی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اب دیکھیں۔ یہ کتنی غیر شاعرانہ سی بات ہوگئی کہ اگر میں یہ کہوں کہ خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔'' اس نے یہ کہہ کر قہقہہ لگا دیا تو وہ ایک دم سے چونک گیا۔ پہلی بار اس نے نادیہ کا قہقہہ سنا تھا۔ کیسا جلترنگ کے جیسا قہقہہ تھا اس کا۔

''ہیلو، آپ خاموش کیوں ہوگئے۔ بری لگی میری بات۔۔۔؟'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''ارے نہیں۔! میں تو تمہارے قہقہے میں کھو گیا تھا، پہلی بار سنا ہے نا۔'' اس نے واضح لفظوں میں اپنی کیفیت کہہ دی تو دونوں میں کتنی ہی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ تبھی نادیہ نے آہستگی سے کہا۔

''اچھا، رات کو بات کریں گے۔''

''ہاں، تب سکون ہوگا۔'' وہ بولا تو نادیہ نے فون آف کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے فون رکھا اور موسم کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ بہت عرصے بعد یوں پرسکون انداز میں موسم سے لطف اندوز تو ہوا ہی تھا، تاہم نادیہ سے باتوں کا خمار عجیب سی کیفیت بیدار کر چکا تھا۔ اس دن اسے احساس ہوا کہ بارش میں مور کیوں ناچتا ہے۔

اگلے دن جب وہ آفس آیا تو فریش تھا، فائلیں آ، جا رہی تھیں۔ وہ پوری تندہی سے کام میں مصروف رہا۔ اسے احساس ہو گیا کہ عملے کے رویے میں بہت حد تک تبدیلی آ چکی ہے۔ یوں اچانک جیسے سارے حیران اور خاموش ہوں۔ اس نے توجہ تو دی لیکن کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایمانداری کی اپنی ایک قوت ہے جو بلاشبہ اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ دوپہر سے کچھ پہلے وہ کام ہی میں مصروف تھا کہ دفتر میں ہلچل سی ہوئی اس کا وہی ماتحت تیزی سے اس کے پاس آیا اور تیز سانسوں کے درمیان عجلت سے بولا۔

''سر۔! وہ پیر سائیں کے دیوان آ رہے ہیں۔ آپ پلیز۔! یہ وہی ہیں جو پیر سائیں کے معاملات دیکھتے ہیں۔''

''آنے دو۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ مزید کوئی بات کیے بغیر پلٹ گیا۔ اگلے چند لمحوں میں پیر سائیں کا دیوان اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ قیمتی بوسکی کا کھلا کرتا، سفید لٹھے کی گھیرے دار شلوار، سر پر سفید عمامہ نما پگڑی، گندمی رنگ پر تیکھے نقوش، چھوٹی چھوٹی خشخشی داڑھی اور بھاری مونچھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں مختلف رنگوں کے نگینے جڑے ہوئے انگوٹھیاں تھیں۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی تیز خوشبو کا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا جو کمرے میں پھیل گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میرا تعارف تو ہو ہی گیا ہوگا آپ سے۔ دیوان بدر دین نام ہے میرا۔''

''دیوان ہیں پیر سائیں کے؟ تشریف رکھیں۔'' اس نے بیٹھے بیٹھے ہی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ تب وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ آپ یہاں کے بڑے انتظامی آفیسر ہو لیکن عمر میں مجھ سے بہت ہی چھوٹے ہو۔ میل ملاقات میں اگر احترام ہونا تو تعلق خوشگوار رہتا ہے۔'' اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ سمجھ گیا کہ اسے، اس کا بیٹھا رہنا اچھا نہیں لگا۔ تبھی وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

''جی فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''میں یہاں کوئی خدمت کروانے نہیں آیا۔ بس آپ کو دیکھنے آیا تھا۔ سنا تھا کہ ایک نوجوان اپنی سرکاری نوکری کی پہلی پوسٹنگ پر یہاں آیا ہے۔ سوچا، چند کام کی باتیں بتا آؤں، جو آگے چل کر نوکری کرنے میں بڑی کام آئیں گی۔'' اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لفظ چبا چبا کر پرسکون انداز میں کہا۔

''جی ہاں۔! ہم جیسے سرکاری ملازم آپ جیسے لوگوں ہی سے تو سیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہی تجربہ بڑھتا ہے۔'' اس نے انتہائی تحمل سے جواباً کہا تو دیوان کروٹ بدلتے ہوئے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔

''سمجھدار لگتے ہو۔ مگر ہماری فائل روکنا سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ آپ کو حویلی آنے کی بھی دعوت مل چکی تھی۔''

''حویلی بھی آ جاؤں گا۔ لیکن میں نے آپ کی فائل ابھی دیکھی نہیں۔ اسے دیکھ کر ہی فیصلہ کروں گا نا کہ اس پر کس قسم کی کاروائی کرنی ہے۔'' شعیب نے قلم میز پر رکھتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگا کر کہا۔

''ہماری فائل ہو یا کوئی بھی کام، وہ آج تک نہیں رکا۔ آپ نہیں کرو گے، آپ جیسا کوئی اور کر دے گا۔ لگتا ہے کہ آپ کو یہ جگہ پسند نہیں آئی۔'' اس بار دیوان کے لہجے میں ہلکی سی درشتگی در آئی تھی۔

''میرے جیسے سرکاری ملازم کے لئے ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے۔ آپ کو یہ تو معلومات ہوگی کہ ویسی ہی سہولیات، ویسی ہی تنخواہ، ویسا ہی عہدہ ہر اس جگہ ملتا ہے جہاں ہمیں جانا ہوتا ہے۔ ہاں، بس مشکلات کم یا زیادہ ہو سکتی ہیں اور انہی مشکلات سے نبرد آزمائی ہی کی ہم تنخواہ لیتے ہیں۔ میں جہاں بھی جاؤں گا۔ ایسے ہی رہوں گا۔'' شعیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ ہر نوجوان آفیسر بڑے بڑے آدرش لے کر آتا ہے۔ لیکن پھر ہمارے ساتھ تعلق بنانا اس کی مجبوری بن جاتا ہے۔ سسٹم ہی ایسا ہے نا۔۔۔ چاہو تو یہی جگہ بہت خوبصورت ہو سکتی ہے۔ ورنہ بہت سارے سرکاری ملازمین او ایس ڈی بھی بن جاتے ہیں۔''

''تو کیا او ایس ڈی کو تنخواہ نہیں ملتی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر بڑے سکون سے کہا۔ ''خیر۔! چھوڑیں اس پرانی معلومات کو، سنا ہے کہ آپ بھی یہاں کی بڑی معزز شخصیت کے ملازم ہیں، چائے پئیں گے یا۔۔۔'' ادھورے فقرے میں اور اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ دیوان چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چند لمحے اسی حیرت اور خاموشی میں گذر گئے۔ پھر خود پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''یا پھر آپ چائے پینے کی شدید طلب لے کر حویلی آ جاؤ گے۔۔ میں انتظار کروں گا آفیسر۔۔ جب آپ پیر سائیں سے ملنے کے لئے مجھ سے رابطہ کرو گے۔۔ تب میرا رویہ کیا ہوگا۔ یہ وقت بتائے گا۔'' دیوان یہ لفظ کہتا ہوا کرسی سے اٹھ گیا۔ اس بار مصافحے کے لیے اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا، بلکہ چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر باہر چلا گیا۔ شعیب نے انتہائی خوشگواریت سے اس کی طرف دیکھا اور پیون بلانے کے لیے بیل دے دی۔ جو فوراً ہی آ گیا۔

''جی سر۔!'' اس نے ہونق انداز میں کہا۔

''یہ شخص جو باہر گیا ہے، کس موڈ میں تھا۔'' اس نے پوچھا۔

''سر جی، بہت غصے میں گیا ہے۔'' وہ منمناتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم اتنی ہی کڑک اور مزیدار سی چائے لاؤ، جتنا اس شخص کا غصہ دیکھا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ پیون چلا گیا۔ وہ ان لمحات کو انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ بہت مدت بعد اسے موقع ملا تھا کہ ان جیسے لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کرے، جس کے یہ مستحق تھے۔ وہ ایسا کرنے کے لئے بہت پہلے سوچ چکا تھا۔

☆☆☆

پیر سائیں اپنے حجرے میں موجود تھا۔ اس کے سامنے ایک خاتون اور بڑی عمر کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ پیر سائیں آنکھیں بند کیئے کوئی دم پڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر ایسا گذر گیا، پھر لڑکے پر پھونکیں مار کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اسی دوارن دیوان کمرے میں آموجود ہوا۔ اس نے کمرے کا منظر دیکھا اور پھر خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں لگ کر کھڑا ہو گا۔ دعا ہو گئی تو خاتون نے ایک بڑا نوٹ پیر سائیں کو نذرانے کے طور پر دیا۔ اس نے وہ نوٹ پکڑا اور ایک طرف رکھ دیا۔ خاتون اٹھ کھڑی ہوئی اور تقریباً جھکتے جھکتے کہا۔

''پیر سائیں۔! بس آپ اپنی نظر کرم رکھیں، میرا بچہ ٹھیک ہو جائے۔''

''اللہ سب بھلی کرے گا۔'' پیر سائیں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تو خاتون اپنے لڑکے کو لیکر پچھلے پیروں باہر چلی گئی۔ تب پیر سائیں نے دیوان کی جانب دیکھا تو غصے ملے لہجے میں عاجزی سے بولا۔

''نیا آفیسر تو بڑا ٹیڑھا بندہ ثابت ہوا ہے۔ اس کی تو بات کرنے کا انداز ہی بڑا غلط ہے۔''

''کیا ہوا؟'' اس نے پر سکون انداز میں پوچھا تو دیوان نے من وعن ساری روداد سنا دی۔ وہ بڑے سکون سے سنتا رہا۔ پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ ابھی بچہ ہے، تو اس کی آفیسری نہ دیکھ، بلکہ اس سے کسی بچے کی طرح سلوک کر۔ نیا نیا ہے نا، سیدھی طرح اس نے ماننا ہی نہیں ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بچوں سے کیسے کام لیا جاتا ہے۔''

''مگر پیر سائیں، وہ مجھے بچہ نہیں لگتا، بڑا اپختہ کار اور خرانٹ قسم کا ہے۔'' دیوان نے اپنا غصہ اتارا۔

''تو پھر معلوم کرو، وہ کون ہے، کس خاندان سے ہے۔ اس کی جڑیں کہاں ہیں۔'' پیر سائیں نے سکون سے کہا۔ پھر اچانک چونکتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں بچوں سے بڑے بڑے کام نہیں لیے جاتے اور نہ ہی کوئی ایسا کام کہا جاتا ہے، جو ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ وہ فائل جو اسے دی ہے۔ اس میں بڑا بھاری اور اہم کام ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آنے والا اس لئے فائل فوراً وہاں سے غائب کرو، اس بندے سے ڈیل ہو جائے تو ٹھیک، ورنہ کوئی نیا بندہ تلاش کرتے ہیں۔''

''سرکار۔! یہ ایم پی اے، ایم این اے کس دن کام آئیں گے۔'' دیوان نے کہا۔

''مطلب۔!'' پیر سائیں نے پوچھا۔

''مطلب یہی سرکار کہ انہوں نے کیسا بندہ قبول کرلیا۔ جو ہمارے۔۔۔''

''سنو۔! جو تم سے کہا گیا ہے۔ وہ سنو۔ حکومت نے وہاں نیا بندہ اس لئے لگایا ہے کہ ایم پی اے ان کا مخالف ہے۔ اس کے سارے کام رک گئے۔ ہمیں بھی چند دن اسے چھیڑنا نہیں چاہئے۔ کام نہیں فقط تعلق بناؤ۔ اور فائل فوراً غائب کرو۔''

''جیسے آپ کی مرضی سرکار، لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ فائل۔۔۔'' دیوان نے کہنا چاہا تو پیر سائیں بولا۔

''اصل میں وہ فائل نادیہ کی طرف سے اپنی جائیداد کا تحفہ ہے جو وہ ظہیر الدین کر دینا چاہتی ہے۔ ممکن ہے وہ سر پھرا آفیسر یہ کہہ دے کہ تحفے دینے والی کو پیش کرو۔۔۔ حویلی میں معاملہ ذرا ٹھیک نہیں ہے اور پھر ظہیر الدین بھی یہاں نہیں، وہ آجائے تو دیکھا جائے گا۔''

''جی سرکار میں سمجھ گیا۔'' دیوان نے کہا۔

''اور ہاں۔! ایم پی اے کو اب قریب بھی پھٹکنے دینا، اب کوئی وقت نہیں ہے اس کے لئے۔ وہ اب حکومت مخالف ہے اور یہ ہمیں قبول نہیں۔ نئے الیکشن پر دیکھا جائے گا کہ کیا کرنا ہے۔'' پیر سائیں نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے سرکار۔ جیسے آپ کی مرضی۔'' دیوان نے جھکتے ہوئے کہا اور واپس مڑ گیا تاکہ کوئی نیا عقیدت مند اندر آسکے۔

☆☆☆

نادی خلاؤں میں تیرنے جیسی کیفیت میں تھی۔ زمین پر پاؤں دھرنے کو من کسی طور بھی نہیں مان رہا تھا اور آسمان تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ حویلی میں پہلے سرگوشیاں ہوئیں پھر واضح لفظوں میں ظہیر شاہ کی آمد بارے باتیں ہونے لگیں۔ یوں اس کی اچانک آمد بارے وجہ بھی سبھی کو معلوم تھی۔ بات حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی تھی۔ کیونکہ پیر سائیں نہیں چاہتے تھے کہ ظہیر اور نادی کی شادی بارے ابھی کسی کو معلوم ہو۔ وہ خاموشی سے دونوں کا نکاح کر دینا چاہتے تھے۔ انہیں اپنے بیٹے کی تعلیم مکمل ہونے کی بھی فکر تھی۔ وہ جو خود تعلیم حاصل نہیں کر پائے تھے، اپنے بیٹے میں وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کر رہے تھے۔ نادی کے لہجے میں جو انہوں نے بغاوت کی ہلکی سی رمق محسوس کی تھی۔ اسی کو بھانپ کر خود رو کونپل کو وہ اگتے ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ دادی اماں کی وساطت سے حویلی کے افراد کے درمیان ہی چھوٹی سے تقریب کا اہتمام ہو رہا تھا۔ وہاں روپوں یا گہنوں کی کہاں کمی تھی جو کوئی رکاوٹ آڑے آتی۔ نادی کا عروسی جوڑا تیار ہو چکا تھا۔ ان تیاریوں میں فرح پیش پیش تھی۔ اسے یقین تھا کہ نادی کا فقط یہی نکاح پر ہی جو اہتمام ہونا ہے، وہی ہوگا۔ دھوم دھام سے شادی کا خیال محض ایک خیال ہی تھا۔ پھر کہاں کس نے کچھ پوچھنا تھا۔ نادی یہ سب دیکھ رہی تھی اور بے بس تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ جو عمر قید اسے دی جا رہی ہے۔ اس پر اگر کوئی احتجاج کیا تو یہی ہوگا کہ اس کی سزا مزید بڑھا دی جائے گی۔ اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ فقط خوابوں اور خیالوں ہی میں آزادی کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب وہ از حد بے بس ہو جاتا ہے تو پھر کسی کرامت یا معجزے کا منتظر ہو جاتا ہے۔ نادی کی حالت بھی کچھ ایسے ہی تھی۔

پھر ایک شام ظہیر شاہ آگیا تو حویلی میں جیسے رونق آگئی۔ زہرہ بی اور فرح کی خوشی تو دیدنی تھی۔ دادی اماں کے چہرے پر بھی بہار آگئی تھی۔ کیونکہ وہ ان لوگوں کی خوشی میں خوش تھی۔ پیر سائیں بھی سر شام ہی آگئے اور رات دیر تک ان کی محفل جمی رہی۔ ایک نادی تھی جو اپنے کمرے تک

محدود تھی۔ کسی نے اس سے پوچھا تک نہیں تھا کہ وہ بھی ان کے درمیان میں آ کر بیٹھ جائے۔ ویسے نادیؔ نے اپنے طور پر یہ سوچ لیا تھا کہ اگر وہ لوگ اسے بلائیں گے تو وہ ظہیر شاہ سے یہ سوال ضرور کرے گی کہ وہ اچانک پاکستان کیوں آ گیا ہے؟ یہ تو اسے معلوم تھا کہ کیوں بلوایا گیا ہے لیکن اس استفسار کا مقصد فقط یہی تھا کہ سب کے سامنے بات کھل جائے اور وہ ایک بار ہی سب کے سامنے کھل کر اپنا انکار ظاہر کر دے۔ پھر اس کے بعد جو ہونا تھا، وہ ہوتا رہتا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال کئی دنوں سے پک رہا تھا۔ اس طرح کم از کم ظہیر شاہ پر تو عیاں ہو جاتا کہ اس نکاح میں اس کی مرضی شامل نہیں ہے۔ پھر جو بھی طوفان اٹھتا وہ اس کا سامنا کر لیتی۔ اب اس سے بڑی قیامت اور کیا ہوگی کہ اسے زندہ ان حویلی کی دیواروں میں چنا جا رہا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے کسی نے بھی نہیں بلایا تھا اور وہ اپنے کمرے کے بیڈ پر پڑی سلگتی رہی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ خود چلی جائے مگر اس کے اندر جوانا پرورش پا چکی تھی، اسی نے نادیؔ کا ہاتھ پکڑے رکھا اور وہ کمرے ہی میں جمی رہی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ ان کے سامنے جا کر پھٹ نہیں پڑی تھی۔ حویلی کا سکون ویسا ہی رہا مگر اس کے اندر دھواں بڑھتا ہی گیا جس سے نادیؔ کو اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ کبھی کبھی نظر انداز ہو جانے کا دکھ پاگل کر دیتا ہے۔

وہ اپنے بیڈ پر یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی بت ایستادہ ہو۔ وہ یوں بے حس و حرکت خیالوں میں گم تھی کہ جیسے اس میں روح نام کی کوئی شے نہ ہو۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کے والدین زندہ ہوتے تو شاید یہ لوگ اسے یوں نظر انداز نہ کر سکتے۔ اور نہ ہی اتنی بے بسی سے وہ ان کے حکم پر یوں سر جھکا دیتی۔ شام ڈھل کر رات میں بدل گئی تھی۔ حویلی کی خاموشی سناٹے میں بدلتی جا رہی تھی۔ حویلی کے باہر جھینگروں کی آوازیں اسے یوں لگ رہی تھی جیسے وہ اس کا نوحہ پڑھ رہے ہوں۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے کسی پیڑ پر سے بہت سارے بیٹھے ہوئے کبوتر ایک دم سے پھڑ پھڑاتے ہوئے اُڑ جائیں۔ اس پھڑ پھڑاہٹ میں ایک خیال کو ندے کی مانند لپکا۔ اس ایک لمحے میں نادیؔ نے ایک ایسا فیصلہ کر لیا، جیسے کوئی پل صراط سے گذرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس نے حویلی سے بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لحہ بہ لحہ یہ فیصلہ اس قدر پختہ ہو گیا کہ خود اسے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔

اس کی خاص ملازمہ ابھی تک حویلی ہی میں تھی۔ ظہیر شاہ کی آمد پر جو اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے کام کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے کھانے پر بلانے کے لیے ضرور آئے گی۔ اس دوران وہ اپنی جو تیاری کر سکتی تھی وہ ہی کرنا تھی۔ کافی دیر بعد اس کی ملازمہ نمودار ہوئی۔ تب تک وہ اپنی طرف سے تیاری کر چکی تھی۔ ملازمہ نے اس کا کھانا میز پر رکھا اور بولی

''بی بی حضور۔ ! یہ کھانا۔۔۔'' تاجاں مائی نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''سنو۔ ! میں نے حویلی سے جانا ہے۔ تم کیا بندوبست کر سکتی ہو۔''

تاجاں مائی نے سنا تو حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے خود پر قابو پانے میں کچھ وقت لگا۔

''بی بی حضور۔ ! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

''وہی، جو تم نے سنا ہے۔ مجھے آج رات ہی اس حویلی سے بہت دور جانا ہے۔ اگر ابھی نکل سکو تو۔۔'' نادیؔ نے اعتماد سے کہا۔

''آپ سچ کہہ رہی ہیں بی بی حضور۔ !'' ملازمہ کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

''بالکل، سچ کہہ رہی ہوں۔تم اگر مدد نہ کر سکو تو کوئی بات نہیں، مگر میں نے تو جانا ہے۔لیکن پھر کل صبح تک اپنی زبان بند رکھنا۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''بی بی حضور۔! میں آپ کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔آپ کے لئے جان بھی دینا پڑی تو دے دوں گی۔مگر آپ جائیں مت۔۔'' وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔

''تم کیا یہی چاہتی ہو کہ میں یہاں سسک سسک کر مر جاؤں۔'' نادی کے لہجے میں دکھ یوں چھلکا کہ وہ خود حیران رہ گئی۔

''نہیں بی بی حضور۔!'' تاجاں مائی نے جھجکتے ہوئے کہا۔وہ سارے حالات اچھی طرح سمجھتی تھی۔

''تو پھر میری آزادی میں میری مدد کرو یا پھر یہیں میرے مرجانے کا تماشہ کرنا۔۔میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ صبح میں نے حویلی میں نہیں دیکھنی۔'' نادی نے درشت لہجے میں یوں کہا جیسے وہ اب سب کچھ کر گذرنے کو تیار ہے۔ملازمہ سوچ میں پڑ گئی۔چند لمحے یونہی کھڑی رہی۔پھر بولی

''چلیں، میں آپ کو حویلی سے نکال کر باہر اڈے تک چھوڑ آؤں، پر بی بی سائیں اگر آپ کو بس بھی مل جائے آپ جائیں گی کہاں؟''

''میں جانتی ہوں کہ مجھے کہاں جانا ہے۔تم مجھے حویلی سے باہر نکالنے کا بندوبست کرو۔'' نادؔی نے حتمی انداز میں کہا۔

تاجاں مائی نے سنا اور چند لمحے سوچتی رہی، پھر اچانک بولی،

''بی بی سائیں۔!تو پھر یہی وقت ہے۔وہ سب لوگ کھانے میں مصروف ہیں اور باتیں کر رہے ہیں۔پر۔۔'' یہ کہہ کر وہ نادؔی کے چہرے پر دیکھنے لگی۔

''پر کیا۔۔؟'' اس نے تیزی سے پوچھا تو تاجاں مائی گھبراہٹ میں بولی۔

''اس وقت تو کوئی بس وغیرہ یہاں سے نہیں جاتی۔کار کا بندوبست کریں گے تو پتہ چل جائے گا۔''

''اس وقت یہاں سے ٹرین کی آواز روزانہ آتی ہے۔میں بچپن سے سنتی آئی ہوں۔۔وہ کدھر جاتی ہے؟'' نادؔی نے اس سے پوچھا تو وہ بولی۔

''بی بی سائیں۔وہ تو لاہور کو جاتی ہے۔''

''تو چلو، نکلو، میں نے اسی ٹرین سے جانا ہے۔'' نادؔی نے تیزی سے بے تابی کے ساتھ کہا۔

''آپ ابھی رکیں۔میں ابھی دیکھ کر آتی ہوں کہ آپ نکل بھی سکتی ہو یا نہیں۔'' تاجاں مائی نے کہا اور فوراً وہاں سے پلٹ گئی۔نادؔی امید و بیم کی کیفیت میں یوں وہاں کھڑی رہ گئی جیسے کوئی ہاں اور ناں کی صلیب پر لٹک جائے۔کچھ دیر بعد تاجاں مائی تیر کی طرح اندر آئی اور اسے چلنے کے لئے کہا۔اس نے جلدی سے اپنا تیار کیا ہوا بیگ اٹھایا اور اس کے پیچھے چل دی۔بچپن سے دیکھی بھالی حویلی سے نکلتے ہوئے اس کا دل کس طرح دھڑ کا تھا، یہ وہ ہی جانتی تھی۔وہ مردان خانے کے پہلو سے نکلتی ہوئی حویلی سے باہر آ گئی۔پھر جب وہاں سے چلتے ہوئے وہ کافی دور آ گئیں تو تاجاں مائی نے پوچھا۔

''آپ کب تک پیدل چلیں گی۔اسٹیشن تو یہاں سے کافی دور ہے۔''

''تو پھر کیا کریں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کسی سواری پر بھی نہیں بیٹھا جا سکتا۔ ورنہ ان کو معلوم ہو جائے گا۔ چلو جلدی سے چلو بی بی سائیں۔'' تاجاں مائی نے کہا۔

''تم مجھے چھوڑ کر واپس حویلی چلی جاؤ۔ کسی کو شک تک نہ ہو کہ تم نے میری مدد کی ہے۔'' وہ بولی

''نہیں بی بی حضور۔! میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''میں جو کہہ رہی ہوں۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ جاؤ واپس۔۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''نہیں، میں آپ کو اسٹیشن تک چھوڑ کر، گاڑی میں بیٹھا کر آؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے قدم بڑھا دیے۔

وہ دونوں اسٹیشن آن پہنچیں۔ گاڑی آنے میں ابھی تھوڑا وقت تھا۔ دونوں ایک اندھیرے کونے میں جا بیٹھیں۔ پھر جیسے ہی ٹکٹیں ملنے لگیں۔ تاجاں مائی سکون سے اٹھی، اپنا منہ لپیٹا اور ٹکٹ لے آئی۔ نادی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور اپنا دل کڑا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب نادی گاڑی میں سوار ہوئی تو اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ پہلی بار یوں ٹرین میں سفر کر رہی تھی۔ اسے سب کچھ ہیبت ناک لگ رہا تھا لیکن جونہی اسے اپنی ہتک اک خیال آتا تو سارا ڈر دور ہو جاتا۔ اس نے ایک سیٹ دیکھی اور اس پر ڈھے گئی۔ اس نے تاجاں مائی کے آنسوں بھرے چہرے کی ایک جھلک دیکھی تھی پھر تاجاں مائی آہستہ آہستہ نگاہوں سے کیا اوجھل ہوئی۔ پورا اسلامت نگر کہیں بہت پیچھے رہ گیا۔ اس کی منزل وہاں تھی۔ جہاں اختر رومانوی رہتا تھا۔ بہت دن پہلے اس نے ایڈیٹر سے اس کا ایڈریس معلوم کر لیا تھا جو اب زبانی یاد ہو چکا تھا۔ وہ بھیگی ہوئی آنکھوں اور سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ محوِ سفر ہو گئی۔

☆☆☆

حویلی کے ڈرائنگ روم میں خوشگوار باتوں کا احساس پھیلا ہوا تھا۔ایک صوفے پر پیر سائیں براجمان تھے۔جس کے ساتھ ہی ظہیر شاہ بڑے اعتماد سے بیٹھا ہوا تھا۔بالکل سامنے زہرہ بی اور فرح سمٹی ہوئی بیٹھی تھیں اور ایک طرف دادی اماں تھیں۔پیر سائیں دھیمے لہجے میں ظہیر شاہ سے سوالات کرتا چلا جا رہا تھا اور وہ دبے لہجے میں جواب دیتا جا رہا تھا۔ایسے میں کسی کو بھی خیال نہیں تھا کہ اوپر کمرے میں نادیہ کا وجود بھی ہے۔وہ بھی اس حویلی کی، اس خاندان کی فرد ہے۔جب سوال ختم ہو گئے اور جواب میں بھی کمی ہونے لگی تو ایک دم سے پیر سائیں نے دادی اماں سے پوچھا۔

''اماں بی۔!کیا آپ نے نادیہ کو بتا دیا ہے کہ کل اس کا نکاح ظہیر شاہ سے ہوگا؟''

''اس سوال پر وہاں موجود تینوں خواتین نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ان سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔تبھی دادی اماں نے دھیرے سے کہا۔

''ابھی تک تو نہیں، بتا دیں گے اسے۔''

''کبدادی اماں کب۔۔خیر۔!آپ اسے بلوائیں تا کہ میں خود اسے بتا دوں۔'' وہ سکون سے بولا تو قریب کھڑی ایک ملازمہ کو اشارہ کیا۔''جاؤ۔!نادیہ کو بلا کر لاؤ۔''

حکم سنتے ہی وہ ملازمہ پلٹ گئی اور وہ اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔کافی وقت گذر گیا۔پیر سائیں کو بے چینی ہونے لگی۔لیکن اظہار نہیں کیا۔سبھی کے ذہن میں تھا کہ وہ کیوں نہیں آ رہی۔اس سے پہلے کہ کوئی سوال کرتا ملازمہ آ گئی۔اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پیر سائیں۔!نادیہ بی بی تو اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ان کا کھانا بھی ویسے ہی پڑا ہوا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو، ادھر ادھر کہیں دیکھو اندر۔اُسے اپنے ساتھ لے کر آؤ۔'' زہرہ بی بی نے فوراً کہا۔

''میں نے ادھر ادھر سب جگہوں پر دیکھ لیا ہے۔لیکن وہ نہیں ہے۔میں نے تاجاں مائی کو بھی تلاش کیا ہے، لیکن وہ بھی نہیں ہے۔'' ملازمہ نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

''ارے وہ کدھر۔۔۔'' پیر سائیں نے کہنا چاہا مگر فوراً ہی چونک کر خاموش ہو گیا۔اس نے دادی اماں کی جانب دیکھا جو ہونق سی اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔وہ سارے ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔تبھی پیر سائیں نے کہا۔

''ساری حویلی چھان مارو۔۔۔۔۔کہیں تو ہوگی۔۔۔فوراً۔۔فوراً۔تلاش کرو۔۔''

اسی وقت پوری حویلی چھان ماری گئی لیکن نادیہ وہاں ہوتی تو ملتی۔گھڑی بھر بعد ہی معلوم ہو گیا کہ تاجاں مائی سمیت نادیہ یہاں پر نہیں ہے۔پیر سائیں فوراً ہی اپنے حجرے کی جانب چلے گئے اور جاتے ہی دیوان کو طلب کر لیا اور اسے ساری صورت حال بتا دی۔

''سائیں۔!میں کرتا ہوں کچھ۔۔اپنے مخصوص لوگوں کو تو یہ بات بتانا پڑے گی۔۔تا کہ وہ تلاش کر سکیں۔''

''ہاں۔!مگر یہ بات انہی تک محدود رہے۔بہت ہی مخصوص بندے۔۔۔'' پیر سائیں نے دھیرے سے کہا تو دیوان فوراً ہی باہر کی جانب پلٹ گیا۔اس نے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق چند لوگ بلوائے اور انہیں سلامت نگر میں پھیلا دیا۔پھر ایک خاص آدمی کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

''تاجاں مائی کو تلاش کرو۔ فوراً اور جب بھی ملے۔۔اسے ادھر یہاں لے آؤ۔۔ابھی جاؤ اس کے گھر۔۔۔''

وہ شخص دیوان کا حکم سن کر چل دیا۔ پیر سائیں سے اپنے حجرے میں نہیں بیٹھا گیا۔ وہ پھر حویلی چلا گیا جہاں سبھی لوگ ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔

دادی اماں پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کر پا رہی تھی۔ اس لئے اپنے بیڈ پر جو گئی تو پھر اٹھ ہی نہ سکی۔ وہ حیرت و شدت غم سے اس قدر نڈھال ہو گئی تھی۔ فرح بظاہر حیران و غم زدہ دکھائی دے رہی تھی مگر اندر سے وہ خوش تھی کہ چلو کسی نے تو ان روایات کو توڑا۔ ظہیر شاہ اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہا تھا کہ نادیہ نے اسے اس قدر بری طرح سے ریجیکٹ کیا تھا۔ زہرہ بی کے اپنے کہاں جذبات تھے۔ وہ خاموش اور افسردہ ضرور تھی۔ پیر سائیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کے دوسرے پہر جب تاجاں مائی کو اس کے سامنے لایا گیا تو وہ پر اعتماد تھی۔

''کہاں سے لائے ہو اسے؟'' پیر سائیں نے غضب ناک انداز میں پوچھا۔

''اس کے اپنے گھر سے۔۔'' دیوان نے آہستگی سے کہا۔

''نادی کہاں ہے؟'' پیر سائیں نے براہ راست ملازمہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، جہاں خوف نہیں تھا۔

''وہ لاہور چلی گئی ہے۔'' ملازمہ نے انتہائی سکون سے کہا تو اس کا دماغ گھوم گیا اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اور تم نے اسے جانے دیا۔۔۔تم جانتی ہو کہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیوں جانے دیا اسے۔''

''وہ جانا چاہتی تھی۔ میں نے تو ان کا حکم مانا۔ میں نے انہیں جانے دیا۔ بلکہ خود چھوڑ کر آئی ہوں۔'' ملازمہ کا اعتماد اب تک نہیں ٹوٹا تھا۔ اور یہی بات پیر سائیں کے لئے حیرت کا باعث بن رہی تھی۔ اس نے غصے میں لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''تم یہ جانتی ہو کہ تم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے؟''

''یہ جرم ہے یا نہیں۔ لیکن اس کی سزا ضرور جانتی ہوں۔ آپ مجھے اسی طرح قتل کر دیں گے۔ جیسے میری ماں کو کیا تھا۔ ہم لوگ تو آپ کے ہاتھوں مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔'' ملازمہ کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ نفرت میں بھیگے ہوئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی یہ ملازمہ اپنے دل میں انتقام لیے بیٹھی ہے۔ ایک ہی لمحے میں اسے ہوش آ گیا۔ اس پر اگر سختی کی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تب اس سے پوچھا۔

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاتا ہوں۔ بتاؤ۔ وہ گئی کس کے پاس ہے۔ کون ہے وہ؟''

''میں اس بارے قطعاً نہیں جانتی۔ ہاں اس کا کوئی دوست ہے، جس کے بارے میں آپ کی بیٹی فرح جانتی ہے۔ اس سے پوچھ لیں۔'' ملازمہ نے کہا تو پیر سائیں کو اپنی ساری بنیادیں ہلتی ہوئیں دکھائی دیں۔ مریدین کے دلوں پر حکومت کرنے والا، اپنے گھر کے بارے میں اس قدر لاپرواہ ہو گیا کہ وقت نے دیمک کی طرح اس کی عزت کو چاٹ لیا۔

''کہاں چھوڑا ہے تم نے اسے۔'' اس نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ وقت کو قابو کرنے کے لیے نادیہ کے بارے میں پوچھا۔

''اسٹیشن پر۔۔اب تو وہ آدھے سے بھی زیادہ سفر کر چکی ہوگی۔'' تاجاں مائی نے یوں کہا جیسے وہ اس کی بے بسی کا تماشہ کر رہی ہو۔ پیر

سائیں سوچ میں پڑ گیا۔اس نے پہلے فرح کی طرف دیکھا۔ جو سہمی ہوئی لرز رہی تھی اور پھر تاجاں مائی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں تو میں بعد میں آ کر پوچھتا ہوں۔ پہلے میں اسے تو لے آؤں۔۔'' اس نے کہا اور دیوان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''فوراً لاہور کے لئے نکلنے کی تیاری کرو۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا۔اس سے پہلے کہ دیوان پلٹتا وہ تیزی سے بولا ''نہیں تم نہیں۔۔تم یہیں رہو گے۔۔میں جاتا ہوں۔تم یہاں خیال رکھو۔۔''

دیوان کچھ کہے بنا تیزی سے باہر کی جانب لپک گیا۔

پیر سائیں آناً فاناً وہاں سے نکلا تھا۔اس کے ساتھ چار بندے تھے۔راستے میں پیر سائیں نے اپنے تعلقات آزمانا شروع کر دیئے۔اسے ہر طرح سے یہ یقین دلا دیا گیا کہ جیسے ہی وہ لاہور اسٹیشن پر پہنچے گا۔اسے ہر طرح کی مدد مل جائے گی۔وہ ٹرین پہنچنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔وہ راستے میں کسی بھی جگہ پر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔اگرچہ فرح نے تھوڑی بہت اسے معلومات دی تھیں، جو اسے معلوم تھیں۔وہی اس کے پاس تھیں، جن کے سہارے وہ اسے تلاش کر سکتا تھا۔

☆☆☆

پو پھٹ رہی تھی جب نادیہ لاہور کے مضافات میں پہنچ گئی۔اس کی سمجھ بوجھ کے مطابق تو لاہور آ گیا تھا۔اس کے ساتھ بیٹھی عورتوں کی باتوں سے احساس ہو گیا تھا۔وہ بے تابی سے اسٹیشن آ جانے کا شدت سے انتظار کرنے لگی۔تمام راستے وہ جی کڑا کر کے سفر کرتی رہی تھی۔اگرچہ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ نہیں لگی تھی۔لیکن تمام راستے اسے کسی نے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔وہ چند خواتین کے درمیان ایک کونے میں سمٹی رہی تھی۔کہانیوں،افسانوں میں پڑھے ہوئے نجانے کتنے واقعات اس کے ذہن میں گھومتے رہے اور سفر کٹتا رہا۔مضافات میں آتے ہی وہ بے چین ہو گئی۔وہ سمجھتی تھی کہ اب اسے سب سے مشکل مرحلہ درپیش ہے۔اسٹیشن سے نکل کر اجنبی شہر میں جس ایڈریس پر اس نے جانا تھا، یہی وقت سب سے کٹھن تھا۔مگر ایک حوصلہ اسے پرسکون رکھے ہوئے تھا۔اگر اس دوران کوئی بھی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو فون کا سہارا اس کے پاس موجود تھا۔جو ٹرین میں بیٹھتے ہی اس نے بند کر دیا تھا کہ کہیں کال نہ آ جائے۔وہ پہلے ہی فون نہیں کرنا چاہتی تھی۔وہ اختر رومانوی تک پہنچ کر ہی اس کا رویہ دیکھنا چاہتی تھی۔ممکن تھا کہ وہ فون پر منع کر دیتا۔اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا۔لیکن اچانک سامنے آ جانے پر اسے کہیں نہ کہیں رکھنے کا بندوبست ضرور کرتا۔ٹرین اسٹیشن پر رکی تو اس نے اتر کر پہلے فون کھولا اور پھر اسٹیشن سے باہر آ گئی۔

سامنے اجنبی شہر تھا، جس میں کہیں اختر رومانوی بس رہا تھا۔صبح کی دھوپ میں چمکتا ہوا شہر اسے بہت اچھا لگا۔اس نے اپنا چہرہ ڈھانپا ہوا تھا۔بھانت بھانت کے لوگ، طرح طرح کی آوازوں کا شور، دھڑکتا ہوا دل، امید و ناامید میں ڈوبتی ہوئی اس کی اپنی ذات، بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ وہ ایک رکشے کے پاس آ گئی جس میں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔پہلی بار وہ کسی اجنبی سے مخاطب ہو رہی تھی۔اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پتہ بتایا تو اس ادھیڑ آدمی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تو وہ کانپ گئی۔وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور یہ بے ہوش ہونے والی ہو گئی کہ وہ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے۔اگلے ہی لمحے اس نے اپنے کاندھے اچکائے اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔پھر رکشہ سٹارٹ کیا اور چل پڑا۔وہ شہر جو چند لمحے پہلے اسے بڑا

خوبصورت سا لگ رہا تھا۔اس کے اپنے ہی اندر کے خوف کے باعث گم ہوگیا۔وسوسے سر اٹھانے لگے۔اس وقت اس کی حالت یوں تھی کہ جیسے کھلے سمندر میں وہ کسی ناخدا کے رحم وکرم پر ہو۔نجانے وہ اسے کہاں لے جائے۔دل تھا کہ بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔خدا خدا کر کے وہ سفر ختم ہوا۔

''بس بی بی جی اتریں۔'' رکشے والے نے شیشے میں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں۔آپ اندر سے۔۔۔اختر صاحب کو بلا لائیں۔'' اس نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔

''اختر۔!یہاں تو کوئی اختر صاحب نہیں ہوتے۔۔'' رکشے والے نے الجھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کیسے پتہ، وہ یہاں نہیں ہے۔آپ جائیں معلوم کریں۔'' وہ جی کڑا کر کے ذرا سخت لہجے میں بولی۔تو وہ رکشہ ورکشاپ کے اندر ہی لے گیا۔پھر اتر کر دفتر کی جانب چلا گیا۔جہاں بھاء حمید ایک پڑھے لکھے لڑکے سے اخبار سن رہا تھا۔نادیٓ نے دیکھا،اس شخص نے انتہائی حیرت سے اس پر نگاہ ڈالی۔پھر تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آگیا اور کافی حد تک گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بیٹی۔!تم کہاں سے آئی ہو اور کس اختر سے ملنا ہے تمہیں؟''

''اختر رومانوی۔!یہی پتہ ہے نا ان کا۔۔۔'' نادیٓ نے وہ پتہ دہرایا۔تبھی بھاء حمید چونک گیا۔اسے لمحوں میں سمجھ آگئی کہ یہ یہاں تک کیسے پہنچ گئی ہے اور وہ اختر کون ہے؟''

''بیٹی۔!وہ تو یہاں نہیں ہوتا اب۔۔پہلے ہمارے پاس کام کرتا تھا،اب چھوڑ کر چلا گیا ہے۔'' بھاء حمید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلا گیا ہے۔'' اس نے مایوسی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے کہا۔اس کا دل ڈوب گیا۔صحرا میں چلتے ہوئے اس نے نخلستان دیکھا تھا جو سراب بن گیا تھا۔پھر اچانک اسے خیال آیا۔''آپ ان کے گھر کا پتہ تو جانتے ہوں گے۔پلیز انہیں بلوا دیں۔میں یہاں ان کا انتظار کر لیتی ہوں یا پھر آپ مجھے ان کے گھر پہنچا دیں۔'' میں انہیں ملنے کے لئے بہت دور سے آئی ہوں۔

''اس کا گھر۔۔چلو، میں تمہیں اس کے گھر لے چلتا ہوں۔آپ آؤ۔ادھر دفتر میں بیٹھو۔'' بھاء حمید سوچتے ہوئے کہا۔نادیٓ رکشے سے اتری۔پرس کھول کر اس میں سے ایک بڑا نوٹ نکال کر رکشے والے کو دیا اور دفتر میں آگئی۔اس نے اپنا فون نکال لیا تاکہ اختر سے بات کر سکے۔

''بیٹی۔!کیا اختر کو فون کرنے لگی ہو؟'' بھاء حمید نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جی۔'' اس نے انتہائی اختصار سے کہا۔

''ابھی ٹھہرو۔میں معلوم کرتا ہوں۔'' بھاء حمید نے کہا اور دفتر سے باہر آگیا۔اس نے اپنے سیل سے شعیب کے گھر کا نمبر ملایا۔ذرا سی دیر میں زبیدہ خاتون نے فون اٹھا لیا۔

''خیریت تو ہے نا بھاء حمید۔اتنی صبح فون کیا آپ نے؟''

''وہ آپ کو پتہ ہے نا بہن، اپنا شعیب جو ہے۔۔وہ اختر کے نام سے شاعری کرتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔۔ہاں۔۔ہوا کیا ہے۔'' وہ پریشان ہوتے ہوئے بولیں۔

''اسے ملنے کے لئے ایک لڑکی یہاں ورکشاپ میں آ گئی ہے۔ دفتر میں بیٹھی ہے۔ اب یہاں شعیب تو ہے نہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے، کیا کروں اس کا؟''

''لڑکی آ گئی ہے۔ اس نے شعیب کو فون تو نہیں کیا ابھی تک۔۔'' زبیدہ نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔۔ لگتا ہے نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ وہ یوں گھر جانے کی بات نہ کرتی۔۔ اپنے اختر کے۔۔'' بھاء حمید خاصا پریشان ہو گیا تھا۔

''اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیں۔'' زبیدہ نے کہا

''ایسے کیسے بھیج دوں بہن۔ کوئی اس کے بارے میں معلوم تو ہو۔ میں نے تو آپ کو اس لئے فون کیا ہے کہ شعیب اتنی دور ہے، اسے کیا پریشان کرنا۔ پھر اکیلی لڑکی ہے۔ کچھ پتہ تو چلے اس کے بارے میں۔ اب میں اس سے کیا پوچھوں؟'' بھاء حمید نے بے بس لہجے میں کہا

''اگر ایسی بات ہے تو بھاء حمید اسے یہاں میرے پاس ہی بھجوا دیں۔ پتہ نہیں کہاں سے آئی ہوگی۔ فون کر کے شعیب ہی کو پریشان نہ کرے۔۔۔ آپ بس اسے میرے پاس بھیج دیں۔۔'' زبیدہ خاتون نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں بھاء حمید نے نادیؔ کو اپنی گاڑی میں شعیب کے گھر بھجوا دیا۔ زبیدہ خاتون اس کے انتظار ہی میں تھی۔ نادیؔ اس خاتون کو دیکھ کر چونک گئی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ چہرہ اس نے پہلے دیکھا ہوا ہے۔ جانا پہچانا سا چہرہ، ایسا کیوں ہے؟ اسے فوراً احساس نہ ہو سکا۔

''لڑکی تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟'' زبیدہ نے پوچھا تو وہ اپنے حواسوں میں آ گئی۔

''میں نادیہ ہوں اور اختر مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔'' اس نے فوری طور پر اپنے بارے میں تفصیل بتانے سے گریز کیا۔

''کیا تمہارے پاس اس کا فون نمبر نہیں ہے۔ تم نے اس سے رابطہ نہیں کیا'' زبیدہ نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔

''فون نمبر تو ہے، لیکن ابھی میں نے اس سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ گھر پر نہیں ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، وہ گھر پر نہیں ہے۔'' زبیدہ نے کہا پھر فوراً ہی بولی۔ ''تم اس سے ابھی رابطہ مت کرنا، ابھی تم فریش ہو کر ناشتہ کرو، میں خود اس سے رابطہ کرتی ہوں۔ چلو شاباش۔۔'' زبیدہ نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ نادیہ نے اپنا پرس وہیں پر رکھا اور اٹھ گئی۔ نجانے کیوں وہ یہاں آ کر بڑا سکون محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

پیر سائیں کی فور وہیل جیپ لاہور کے مضافات میں پہنچ گئی تھی۔ ڈرائیور جس قدر تیز گاڑی چلا سکتا تھا، اس نے چلائی۔ اگرچہ پیر سائیں غصے کی شدت کے باعث اپنے آپ میں نہیں تھا۔ لیکن وقت اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ نہایت تحمل اور حوصلے سے اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ نادیہ کی حویلی سے نکل جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور وہ بھی اس وقت جب اس کا نکاح ظہیر شاہ سے ہونے والا تھا۔ ایک طرف اس کے سارے منصوبے چوپٹ ہو سکتے تھے اور دوسری طرف یہ خبر اگر پھیل جاتی تو اس کی اپنی حیثیت کیا رہ جاتی۔ نادیہ کے بارے میں شاید اس نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ اسے ایسی لڑکی سمجھ رہا تھا جسے باہر کی دنیا کی خبریں نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ باہر نکل کیسے گئی؟ یہ معمہ تھا

س کے لئے جو اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

جس وقت پیر سائیں لاہور اسٹیشن پہنچا۔ اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ اس نے اسٹیشن پر ایک جانب کھڑی پولیس جیپ کو دیکھا۔ پھر فون پر رابطہ ہوا تو ایک نوجوان پولیس آفیسر اس کے قریب آ گیا اور پوچھا۔

''جی۔ آپ دلاور شاہ جی ہیں۔''

''ہاں۔! میں ہی ہوں۔۔ گاڑی۔۔'' اس نے پوچھنا چاہا لیکن اس نے پہلے ہی پولیس آفیسر نے کہا۔

''ٹرین آئے تو کافی دیر ہو چکی ہے۔ جس قسم کا حلیہ آپ نے بتایا تھا، ویسی ایک لڑکی یہاں دیکھی تو گئی ہے۔ وہ ایک رکشے میں سوار ہوئی تھی۔ ہم اس رکشے والے کی تلاش میں تھے۔ جس کا پتہ تو چل گیا ہے لیکن ابھی وہ ملا نہیں۔''

''کب تک ملے گا وہ۔۔۔'' پیر سائیں نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر میں مل جائے گا۔ اس کے پیچھے بندے پھیل گئے ہیں۔ جلدی معلوم ہو جائے گا۔ آپ آئیں۔ تھانے چلتے ہیں۔ وہیں انتظار کرتے ہیں۔'' پولیس آفیسر نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ پیر سائیں نے خود پر قابو پاتے ہوئے ڈرائیور کو اس کے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆
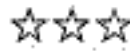
شعیب اپنے آفس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ وہ ڈرائینگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کا سارا دھیان نادیہ کی طرف تھا۔ رات بھر اس کا فون بند رہا تھا۔ پہلے پہر تک تو وہ خود اس کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جب خود اس نے اکتا کر فون کیا تو بند تھا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ چند بار جب اس نے کوشش کی اور فون بند ہی ملا۔ تب اس نے سوچا کہ کوئی نہ کوئی مجبوری ہو گئی ہوگی۔ اس لئے وہ بھی سو گیا۔ لیکن ایک بے چینی اس کے اندر آئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ نجانے اسے کیوں یہ خیال آتا ہی چلا جا رہا تھا کہ کچھ ایسا انہونا ہوا ہے، جس کی وجہ سے اس کی بات نہیں ہو سکی۔ حالانکہ پہلے کئی کئی دن گذر جاتے تھے اور ان کی بات نہیں ہو پاتی تھی۔

وہ انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اس کا ملازم ایک چٹ تھامے اندر آ گیا۔ ملازم نے وہ چٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

''یہ صاحب آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔''

''کون ہے۔۔؟'' چٹ پکڑتے ہوئے اس نے یونہی سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''چوہدری ثنا اللہ ہیں جی، یہاں کافی عرصے پہلے ڈی ایس پی رہ چکے ہیں۔ اب یہ ریٹائیر ہو گئے ہوئے ہیں۔'' ملازم نے تیزی سے بتایا تو اس نے کاغذ کے اس پرزے پر نگاہ ڈال کر ایک طرف رکھ دیا اور اسے بلانے کے لئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر صحت مند شخص اندر آ گیا۔ سلام و مصافحہ کرنے کے بعد شعیب نے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی فرمائیں۔ کیسے تشریف آوری ہوئی؟''

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ چند باتیں ہیں جو میں آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے آپ سمجھ جائیں گے کہ میں کس مقصد کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔'' اس نے بڑے نپے تلے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی فرمائیں۔ میں سن رہا ہوں۔'' اس نے تحمل سے کہا تو وہ کافی حد تک شائستہ انداز میں کہتا چلا گیا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ وہ پہلے آفیسر ہیں۔ جنھوں نے سلامت نگر آ کر پیر سائیں کی تابعداری نہیں کی۔ ایک تو میں آپ کو دیکھنے آیا تھا اور آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ دوسرا مجھے آپ جیسے آفیسر کی مدد چاہیے۔ وہ دراصل میں نے پیر سائیں کی بڑی مخالفت کی تھی۔ جب میں یہاں تعینات تھا۔ اس کے ناجائز کام نہیں کیئے۔ ظاہر ہے مجھے پھر یہاں بڑا مشکل وقت گذارنا پڑا۔ اس کے چھوٹے موٹے کام نچلے درجے کے اہلکاروں نے نکل جایا کرتے تھے۔ اصل مخالفت اس وقت ہوئی جب اُن دنوں حویلی ہی کی ایک ملازمہ شرماں مائی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے لواحقین بچارے بہت بھاگے دوڑے، مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے پیش رفت کی ہی تھی کہ اچانک لواحقین خاموش ہو گئے۔''

''وہ کیوں خاموش ہو گئے؟'' شعیب نے دلچسپی سے پوچھا۔

''خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بہت بعد میں پتہ چلا تھا کہ پیر سائیں نے ہر طرح سے دباؤ ڈالا اور کچھ دے دلا کر انہیں خاموش کر دیا تھا'' وہ بولا۔

''آپ کچھ نہیں کر سکے اس وقت؟'' اس نے سکون سے پوچھا۔

''نہیں، تھانے کا پورا عملہ بہر حال پیر سائیں کے زیرِ اثر تھا۔ انہوں نے سارا واقعہ گول مول کر کے اتفاقیہ موت قرار دے دیا تھا'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی پرانی بات کا اب۔۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو ثناء اللہ تیزی سے بولا۔

''وہی عرض کر رہا ہوں نا، اب پھر وہی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ شرماں مائی کی بیٹی تاجاں مائی بھی حویلی میں کام کرتی تھی۔ اب وہ حویلی میں بند ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ حویلی والوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ غالب امکان ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہو گا یا پھر اس کا قتل کر دیں گے وہ۔۔۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' شعیب نے پوچھا۔

''کیونکہ پیر سائیں کی نگاہ میں تاجاں مائی نے بھی وہی جرم کیا ہے، جو شرماں مائی نے کیا تھا۔ شرماں مائی کے زمانے میں پیر سائیں کی بہن نے حویلی سے فرار حاصل کر لیا تھا۔ اور اب اس کی بھتیجی حویلی چھوڑ کر غائب ہو چکی ہے۔ ان دونوں ملازمین خواتین نے ان دونوں حویلی والی خواتین کی مدد کی ہے۔'' اس نے پوری طرح مسئلہ بیان کیا۔

''آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔'' اس نے پوچھا تو ثناء اللہ نے کہا۔

''شرماں مائی کے وقت تو میں کچھ نہ کر سکا۔ لیکن بعد میں مجھے بہت سارے شواہد مل گئے۔ ان لواحقین سے میں نے خود رابطہ رکھا تھا۔ آج صبح تاجاں مائی کے بیٹے نے مجھے اطلاع دی ہے تو میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے آپ میرے پاس آگئے لیکن یہ معاملہ تو پولیس کا ہے۔ ہماری دخل اندازی کا جواز کیا ہے بھلا۔'' اس نے کہا۔

''میں مانتا ہوں کہ ابھی کوئی جواز نہیں ہے۔ مگر معاملہ ایک زندگی کا ہے۔ تاجاں مائی کے بیٹے نے تھانے میں درخواست دے دی ہے۔ مگر بہت مشکل ہے کہ اس پر عمل درآمد ہو۔'' وہ اس طرح بولا جیسے بے بس ہو

''آپ کیا چاہتے ہیں۔'' اس نے تحمل سے پوچھا۔

''یہی کہ تھانے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس واقعہ سے آپ کو بھی آگاہی ہے۔ آپ کے علم میں ہے۔ میرا مقصد ہے کہ وہ تاجاں مائی کو فی الفور کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔'' ثنا اللہ نے تیزی سے کہا۔

''اس وقت وہ تاجاں مائی کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بقول اس کے بیٹے کے رات حویلی کے کچھ ملازمین ان کے گھر آئے تھے اور اس کی ماں کو زبردستی اپنے ساتھ حویلی لے گئے تھے۔ اس کے بعد معلوم نہیں۔'' وہ تشویش سے بولا تو شعیب نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ڈی ایس پی صاحب کو بلا کر ان سے بات کر لیتا ہوں۔ باقی آپ دیکھ لیں۔''

''میں سنبھال لوں گا۔ مجھے ابھی کچھ پریس والوں سے بھی ملنا ہے۔ اخلاقی طور پر ہی سہی، آپ ضرور مدد کیجئے گا۔ روحانی شخصیت ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ دوسروں کی زندگیوں سے یونہی کھیلتا رہے۔ بہرحال میں نے جو عرض کرنا تھا وہ آپ سمجھ گئے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیں۔''

شعیب اس کی ہچکچاہٹ سمجھ رہا تھا۔ اس سے مزید بات کرنا فضول تھا۔ اس لیے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چلا گیا۔ تب وہ سوچنے لگا کہ شاید یہ اس کے لیے غیبی مدد آگئی ہے یا پھر اس کے خلاف کوئی سازش ہے۔ کیونکہ ہمارے ہی اس معاشرے میں جہاں دوسری برائیاں ہیں۔ وہاں ایک اور برائی منافقت بھی ہے۔ جو بہرحال اعلیٰ درجے کی خباثت ہے۔ جب گھٹیا قسم کے لوگ کسی کا کچھ بگاڑ نہ سکیں اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے بے بسی محسوس کریں تو منافقت ہی وہ ہتھیار ہے جس سے دوسروں کی زندگی تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ اپنی زندگی اور آخرت پہلے ہی تباہ و برباد کر چکے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

نادیہ فریش ہو کر ناشتہ کر چکی تھی۔ زبیدہ خاتون نے اس کے ساتھ ہی سب کچھ کھایا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ اب اس نے چائے کی پیالی نادیہ کو دیتے ہوئے دوسری اپنے سامنے رکھی۔ پھر چند سپ لینے کے بعد اس کے چہرے پر دیکھا اور بڑے پرسکون لہجے میں بولی۔

''دیکھ بیٹی نادیہ۔! میں نہیں جانتی کہ شعیب تمہارے ساتھ اختر بن کر بات کیوں کرتا رہا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تم دونوں کی آپس میں کیا بات ہے۔ وہ ساری باتیں ہم بعد میں کر لیں گے مگر تم یہاں ہو، اس بارے ابھی شعیب کو بتانے کی ضرورت نہیں۔''

''وہ کیوں آنٹی۔ میں۔۔۔'' نادیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ یہاں اس شہر میں نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اتنی دور بیٹھا میرا بیٹا پریشان ہوتا رہے۔ جب ضرورت ہوئی تو اسے فون بھی کر لیں گے۔ میں خود بتاؤں گی اسے تمہارے بارے میں۔ بلکہ خود تمہاری بات کراؤں گی۔'' انہوں نے اس تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپ میری بات سنیں۔۔'' نادیہ نے کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''اور دوسری بات۔! یہاں میرے پاس بہت ساری لڑکیاں کام کرنے کے لیے آتی ہیں۔ انہیں تمہارے بارے میں قطعاً معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ تم گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔''

''تو پھر میں کیا کہوں گی ان سے، اگر کسی نے پوچھ لیا تو۔۔؟'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔

''یہی کہ تم میری دور پار کی رشتے دار ہو اور چند دن کے لیے یہاں میرے پاس رہنے کے لئے آئی ہو'' اس نے قدرے سختی سے کہا اور برتن سمیٹنے لگی۔ تب نادیہ جلدی سے اٹھ کر خود برتن سمیٹنے لگی اور پھر انہیں لے کر کچن میں چلی گئی۔ وہ زبیدہ خاتون کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا گئی تھی۔ وہ کچن میں تھی اور زبیدہ خاتون کمرے میں، دونوں کے ذہن میں کئی خیال گردش کر رہے تھے۔

نادیہ نے کبھی کچن میں کام نہیں کیا تھا۔ زبیدہ نے دیکھا کہ وہ الٹے سیدھے ہاتھ مار رہی ہے۔ تب اس نے نادیہ کو روکتے ہوئے کہا۔

''بس کرو، یہ تم سے نہیں ہوگا۔ آؤ، میں تمہیں شعیب کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔ وہاں جا کر سو جاؤ۔ ساری رات جاگتے ہوئے تم تھک گئی ہو گی۔''

''ہاں، مجھے نیند تو آ رہی ہے۔ لیکن میں یہ کر لوں تو۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا۔

''آؤ۔!'' وہ بولیں۔

''جی اچھا'' اس نے دھیرے سے کہا اور چلتے ہوئے شعیب کے کمرے تک آ گئی۔ زبیدہ خاتون باہر ہی سے واپس چلی گئی اور نادیہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر چلی گئی۔ کمرہ ویسا ہی صاف ستھرا تھا، جیسے وہ ابھی یہاں سے گیا ہو۔ اس کمرے کو دیکھ کر شعیب کے اعلیٰ ذوق کا اندازہ ہو رہا تھا۔ سامنے دیوار پر اس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ''اچھا! تو یہ ہے اختر۔۔ میرا مطلب ہے شعیب۔۔'' وہ کافی دیر تک اسے دیکھتے ہوئے اپنے من میں اتارتی رہی اور پھر بیڈ پر پھیل گئی۔ اسے وہ بالکل منفرد سا لگا تھا۔ اس کا چہرہ ویسا نہیں تھا، جیسا وہ سوچتی رہی تھی۔ ان لمحات میں اس کا دل شدت سے یہ چاہنے لگا کہ اختر کو فون کرے اور اسے ستائے۔ اس کے نین نقش بارے باتیں کرے اسے حیران کرے۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے زبیدہ خاتون سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ اس نے اپنی اس خواہش کو دبا لیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی پہلی سوچ اس کے ذہن میں یہی در آئی کہ جب زبیدہ خاتون اس کے بارے میں پوچھے گی تو وہ اسے کیا جواب دے گی۔ وہ اپنے بارے میں سچ بتائے یا وہی جو اس نے ''اختر'' کو بتایا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ کیا کہنا چاہئے۔ سکون سے لیٹتے ہی تھکن اور نیند اس پر غالب آ گئی اور اسے کچھ ہوش نہ رہا وہ نیند میں کھو گئی۔

باہر دالان میں بیٹھی ہوئی زبیدہ خاتون پریشان ہو گئی تھی۔ گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی اس کے ہاں آ گئی تھی۔ وہ بھی اس

کے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے۔ نجانے ان دونوں میں ایسا کیا چل رہا تھا کہ وہ لڑکی اپنے گھر سے بھاگنے پر مجبور ہوگئی۔ نادیہ کے یوں گھر سے بھاگ آنے میں شعیب اس لئے قصوروار دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس کا اپنا بیٹا ہے بلکہ حالات و واقعات بتا رہے تھے۔ اگر اس میں شعیب کی مرضی شامل ہوتی تو وہ یوں اکیلی یہاں تک نہ پہنچ سکتی۔ بلکہ کم از کم اسے اسٹیشن سے ضرور لاتا۔ ان کا آپس میں رابطہ ہوتا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شعیب اس سے جھوٹ بولے گا یا پھر کوئی بات چھپالے گا۔ وہ یہی سوچتی رہی اور دوپہر سر پر آگئی۔ لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ مگر اس کے ذہن سے سوچیں ہی نہ نکل رہی تھیں۔ نجانے وہ لڑکی کس خاندان کی ہے۔ اس کا کوئی آگے پیچھے ہے بھی یا نہیں یا پھر بھرا پرا گھر چھوڑ کر آئی ہے۔ زبیدہ خاتون کو اس کا اپنا ماضی بار بار اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور وہ اس سے اپنا ذہن بچا رہی تھی۔ وہ جیسے جیسے نادیہ کے بارے میں سوچتی جاتی تھی، اس کا اپنا آپ اس کے سامنے آکھڑا ہوتا تھا۔ اور وہ گھبرا کر نگاہیں چرا لیتی تھی۔ وہ صبح ہی سے اسی کشمکش میں تھی۔ اس کی عقل یہی کہہ رہی تھی کہ پہلے اسے کریدنے کی کوشش کرے کہ وہ کون ہے؟ پھر اپنے بیٹے کو بتائے، پتہ نہیں شعیب کا نادیہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ سب اسے بڑے تحمل اور حکمت عملی سے کرنا تھا۔ یہ سوچ کر اسے ڈھارس بندھی کہ وہ اس معاملے کو حل کر لے گی۔ وہ انہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ پھر یوں مسلسل بیل ہوتی چلی گئی جیسے کسی نے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس سمیت سبھی لڑکیاں چونک گئیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک لڑکی نے اٹھ کر باہر جانا چاہا مگر اس نے روک دیا اور خود دروازے تک گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر اوٹ میں ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کون ہے؟'' اس کے لہجے میں درشتگی تھی۔

''وہ بہن۔۔۔ میں ہوں بھاء حمید۔ ! وہ لڑکی۔۔۔'' باہر سے آواز آئی تو اس نے بھاء حمید کے لہجے میں حد درجہ گھبراہٹ محسوس کی۔ جیسے سن کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے اوٹ ہی سے باہر دیکھا تو کئی گاڑیاں کھڑی تھیں، جن میں پولیس کی گاڑیاں نمایاں تھیں اور پولیس والے لوگ بھی موجود تھے۔

''کیا بات ہے بھائی۔ خیریت تو ہے نا؟'' اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''وہ لڑکی جو میں یہاں صبح چھوڑ گیا تھا۔ اسے یہ لوگ لینے آئے ہیں، وارث ہیں اس کے۔'' اس نے جواباً تیزی سے کہا۔

''بھاء جی، آپ نے تصدیق کر لی ہے۔ یہ واقعی ہی اس کے وارث ہیں'' اس نے تحمل سے پوچھا، مگر نجانے کیوں اس وقت اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ نادیہ کے یوں ان لوگوں کے حوالے کر دے۔ اگر خود اسے ایسی صورت حال کا سامنا ہوتا۔ کاشف کے ہاتھوں سے اسے حویلی والے واپس لے جاتے تو کیا وہ اب تک زندہ ہوتی؟

''آفیسر۔ ! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔۔۔ اندر جائیں اور باہر لے آئیں اسے یا پھر میں جاتا ہوں'' پیر سائیں نے انتہائی اکتائے ہوئے لہجے میں کہا جس میں غصہ اور حقارت تھی۔ تبھی بھاء حمید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا۔

''او بھائی، تو جو کوئی بھی ہے اتنی اونچی آواز میں بات نہیں کرو۔ یہ میری بہن کا گھر ہے اور یہاں پر کئی گھروں کی بیٹیاں آتی ہیں۔ میں نے یہ بات تم لوگوں کو پہلے بھی سمجھائی تھی۔ اس لئے خاموش رہو۔ وہ بچی آ جاتی ہے ابھی۔۔۔۔''

''تو پھر لا دو نا جا کر اپنی بہن کے گھر سے۔۔۔'' پیر سائیں نے اسی حقارت بھرے لہجے میں یوں کہا جیسے طنزیہ انداز میں گالی دے رہا

ہو۔تبھی زبیدہ خاتون نے اس شخص کو دیکھا، جس نے اتنی سخت بات کی تھی۔ یا خدا۔! یہ تو اس کا اپنا بھائی اس کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اگر چہ وقت نے اس کو اچھا خاصا بدل دیا ہے لیکن اپنا خون تو نہیں بھلایا جا سکتا۔ تو کیا نادیہ اس کی بیٹی ہے؟ کیا وقت نے اپنے آپ کو پھر سے دھرا دیا۔ وہ جواب تک دنیا کی نظروں سے چھپی ہوئی تھی، اس کا راز فاش ہو جانے کا وقت آ گیا ہے؟ میں اپنا راز چھپاؤں یا نادیہ کو بچالوں، اگر یہ بچی ان کے حوالے کر دی گئی تو اس کا زندہ بچنا محال ہوگا۔ نادیہ کی زندگی کی قیمت اس کا راز ہے؟ ایک ہی لمحے میں نجانے کتنے سوال اس کے سامنے آن ٹھہرے تھے۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ کسی بھی سوال کا جواب دے سکے۔

''بہن بھیجو نا، اس لڑکی کو۔'' بھاء حمید نے کہا تو زبیدہ ایک دم سے چونک گئی۔ پھر لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نادیہ کو نہیں دے گی۔ تبھی اس نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

''بھاء حمید۔! یہ جو شخص غصے میں بات کر رہا ہے۔ کیا اس کا نام دلاور شاہ ہے اور یہ سلامت نگر کا ہے؟'' اس کے اس طرح پوچھنے پر پیر سائیں نے خود ہی اونچی آواز میں جواب دیا۔

''ہاں۔! میں دلاور شاہ ہوں۔ وقت ضائع مت کرو اور اس لڑکی کو باہر بھیجو، ورنہ میں خود اندر سے نکال لاؤں گا۔''

تبھی زبیدہ خاتون نے دروازہ کھول دیا اور خود دروازے میں تن کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا۔

''اگر تم میں ہمت ہے نا دلاور۔! تو میرے دروازے کی یہ دہلیز پار کر کے دکھاؤ۔''

پیر سائیں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وقت نے اس کے چہرے پر اپنی پرچھائیں تو ڈالی تھیں مگر اتنی بھی نہیں کہ نقش مٹ جائیں۔ چند لمحوں میں وہ پہچان گیا کہ سامنے کھڑی عورت اس کی بہن زبیدہ خاتون ہے۔

''تم۔ تم۔۔۔ ابھی تک زندہ ہو۔۔۔'' وہ انتہائی حیرت سے بولا

''تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ میں مر گئی ہوں۔۔۔ میں زندہ ہوں دلاور۔۔۔ اور اب اس معصوم کو مرنے نہیں دوں گی۔ جسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے وہ کس کے گھر میں پناہ لے چکی ہے۔''

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔'' پیر سائیں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنی گاڑیاں دیکھ کر وہاں پر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔

''اگر دشمن بن کر آئے ہو تو انہی قدموں پر واپس چلے جاؤ۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں تیرے جیسے دشمن کا راستہ روک سکوں۔ آزمانا چاہو تو آزما لو۔۔ اگر بھائی بن کر آئے ہو تو یہ دروازہ پار کرو تو آ جاؤ۔'' زبیدہ خاتون نے انتہائی سرد لہجے میں کہا تو پیر سائیں نے پولیس آفیسر کی جانب دیکھ کر کہا۔

''آفیسر۔ آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے میری بہت مدد کی۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر ضرورت ہو تو کال کر لیں۔'' اکتائے ہوئے پولیس آفیسر نے کہا اور فوراً ہی پلٹ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ساتھ لائی نفری سمیت وہاں سے چلا گیا۔ وہ اپنے بندوں کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے اندر آ گیا تو زبیدہ نے کہا۔

''بھابھی جان آپ بھی آجاؤ۔''

''وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔تب تک نادیہ بیدار ہو چکی تھی۔اسے لڑکیوں نے جگا دیا تھا کہ باہر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے، جو اسی کی وجہ سے ہے۔وہ بھی دروازے سے آن لگی تھی۔

''کہاں ہے نادیہ۔؟''پیر سائیں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

''میرے پاس ہے۔مگر اسے قطعاً معلوم نہیں ہے کہ میں کون ہوں اور میرا بیٹا کون ہے۔اسے فقط میرے بیٹے کی شاعری پسند ہے۔اسی ناطے وہ یہاں آگئی۔کیوں آگئی ہے، یہ اب سے کچھ دیر پہلے نہیں جانتی تھی مگر اب سمجھ رہی ہوں۔اب بولو تم کیا چاہتے ہو؟''زبیدہ نے سکون سے کہا۔

''میں اسے واپس لے جانا چاہتا ہوں''اس نے جواباً کہا۔

''تاکہ تم اسے لے جا کر مار دو۔میں نہیں جانتی تمہیں۔۔۔میں اسے۔۔''

''آج اس کی شادی ہے میرے بیٹے ظہیر شاہ کے ساتھ۔وہ لندن سے صرف اسی لیے آیا ہے۔اور۔۔۔''

''وہ نادیہ تمہاری بیٹی نہیں اور اسے تمہارا بیٹا پسند نہیں ہے۔تبھی وہ حویلی کی زندگی چھوڑ کر ایک غریب شاعر کے پیچھے آگئی۔اب میں بھی وہ مجبوری میں پناہ کی خاطر یہاں تک آئی ہے۔''اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تمہارا بیٹا کدھر ہے۔میں اس سے بات کرتا ہوں، اسے سمجھاتا ہوں۔''پیر سائیں نے اب تحمل سے کہا۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔اپنے کام سے کہیں گیا ہوا ہے۔وہ آجائے گا تو میں اس سے مشورہ کر کے جو فیصلہ ہوا وہ تمہیں بتا دوں گی۔''

''وہاں، نادیہ کی شادی ہونے والی ہے، اس بات کو سمجھو۔''

''اگر وہ یہاں تمہیں نہ ملتی، تب شادی کی تاریخ کا کیا ہونا تھا۔جب نادیہ ہی کو شادی منظور نہیں ہے تو میں اسے تمہارے ساتھ کیسے بھیج دوں۔وہ عاقل بالغ ہے۔اپنی مرضی کر سکتی ہے۔پھر تم ہی کیوں، جاؤ، اس کے باپ کو بھیجو۔''اس نے زبیدہ نے ذرا تلخی سے کہا۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں۔نادیہ دو برس کی تھی جب ظاہر شاہ اپنی بیوی سمیت ایک کار حادثے میں اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔''وہ آہستگی سے بولا۔

''اوہ۔!تو نادیہ یتیم ہے اور اس کے سرپرست ہو تم۔۔۔''وہ انتہائی دکھ سے بولی۔اپنے بھائی کے بارے میں سن کر وہ ایک دم سے غم زدہ ہو گئی تھی۔

''ضد نہ کر آپا۔اسے میرے ساتھ جانے دو۔وہ میری بہو بننے جا رہی ہے۔بلکہ اب تو تم بھی میرے ساتھ چلو، میں ماضی کی ساری باتیں بھلا دینا چاہتا ہوں۔''پیر سائیں نے التجا بھرے لہجے میں کہا تو اس کا دل پسیج گیا۔وہ موم ہونے لگی۔

''ٹھیک ہے دلاور۔!اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔تو لے جاؤ اسے''وہ روتے ہوئے بولی۔

''تم بھی ہمارے ساتھ چلو آپا۔۔۔''اس نے دکھ سے کہا۔

''نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔میں اپنے بیٹے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔''وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بھیجو نادیہ کو۔!ایک دو دن میں تم لوگوں کو لینے دونوں آ جائیں گے۔'' پیر سائیں نے کہا تو دروازے سے لگی نادیہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''نہیں پھوپھو۔!میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔اگر آپ نے مجھے بھیجا بھی تو حویلی میں میری لاش جائے گی۔میں نے وہاں جا کر بھی مرنا ہی ہے۔''

وہ تینوں اس کی چیخ بھری آواز پر چونک گئے اور جو اس نے بات کی تھی، اس کا سب سے زیادہ اثر بھا حمید پر ہوا۔تب وہ تڑپ کر بولا۔

''زبیدہ بہن۔!میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔میری نگاہ میں آپ کا کتنا احترام ہے یہ آپ جانتی ہیں۔آج آپ پہلی بار میرے سامنے آئی ہیں۔میری رائے یہی ہے کہ بچی کو ابھی واپس حویلی مت بھیجا جائے۔اسے اس وقت تک اپنے پاس رکھیں۔جب تک یہ خود جانے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔''

''یہ ہمارا خاندانی مسئلہ ہے۔'' پیر سائیں نے تیزی سے کہا۔

''میں مانتا ہوں۔لیکن وہ بھی میری بیٹی جیسی ہے۔وہ جب تک نہیں چاہے گی، یہیں رہے گی، چاہے جو مرضی کر لو۔۔۔تم جتنے بھی طاقتور ہو، اپنی طاقت آزما لو'' بھا حمید نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''جاؤ دلاور۔!چلے جاؤ۔یہ میرا وعدہ ہے کہ میں چند دنوں تک نادیہ کو لے کر خود حویلی آؤں گی۔'' زبیدہ خاتون نے کہا اور زار و قطار رونے لگی۔پیر سائیں چند لمحے یونہی خاموش بیٹھا رہا پھر تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔چند لمحوں بعد ان کے دروازے کے آگے کوئی گاڑی نہیں تھی۔زبیدہ خاتون دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے روتے چلی جا رہی تھی۔تبھی نادیہ اندر آئی اور دھیرے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔تب زبیدہ نے اسے گلے لگایا اور یوں روئی کہ جیسے سارے آنسو آج ہی بہا دے گی۔

☆☆☆
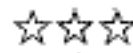
حویلی پر سہ پہر کی دھوپ اتر آئی تھی۔وہی سناٹا اور خاموشی تھی۔لیکن دادی اماں کا وجود یوں تڑپ رہا تھا کہ لبوں سے آواز نہیں نکل رہی تھی مگر آنسو یوں رواں تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔نجانے کب سے بندھے ہوئے بندھ ٹوٹے تھے۔اتنے برس بعد اپنی اکلوتی بیٹی زبیدہ بارے میں سن کر ان سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا۔انسان اگر اس دارِ فانی سے چلا جائے تو اس پر دھیرے دھیرے صبر آ ہی جاتا ہے۔لیکن زندوں کے لیے خود پر جبر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔اگرچہ وقت نے زبیدہ کی یاد پر حالات نے منوں مٹی ڈال دی تھی لیکن اتنے برس بعد بیٹی کے زندہ ہونے کی اطلاع پر وہ اس سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھی تھی۔وہ شاید کسی پر یقین نہ کرتی۔اسے یقین اس لئے آ گیا کہ خود اس کے بیٹے نے یہ بتایا تھا۔نادیہ کے حویلی سے چلے جانے پر وہ پہلے ہی غم سے نڈھال تھی، جب اس نے سنا کہ وہ زبیدہ کے پاس چلی گئی ہے تو جہاں وہ خوشی سے بے حال ہو گئی کہ چلو ان کی عزت پامال نہیں ہوئی، وہاں اپنی بیٹی کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی تڑپ نے اسے بے بس کر دیا۔وہ دلاور شاہ سے اسی وقت اپنی اس خواہش کا اظہار کر دینا چاہتی تھی۔پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ نجانے اس کا ردعمل کیا ہو؟ وہ تو پہلے ہی نادیہ کے معاملے میں غصے سے بھرا ہوا ہے۔وہ کیا

کرے، کس طرح اپنی بیٹی سے ملے، پتہ نہیں زبیدہ حویلی آ بھی سکے گی یا نہیں؟ اس کا بیٹا نجانے کیسا ہوگا؟ ان حالات میں وہ کیا نادیہ کو قبول کر لے گا؟ کیا دلاور شاہ اب نادیہ کو بھول جائے گا؟ ایسا ممکن تو نہیں ہو سکتا؟ کیا اسے ہی اپنی بیٹی سے ملنے جانا پڑے گا؟ کیا اس عمر میں وہ حویلی سے باہر قدم رکھ پائے گی؟ سوالوں کا اک سلسلہ تھا اور ہر ایک سوال کی اپنی ہی الگ سے چبھن تھی۔ ممتا کی تڑپ، رشتوں کا دکھ اور حالات کے جبر کا اظہار وہ فقط آنسو بہا کر ہی کر سکتی تھی۔ ان چند گھڑیوں میں ہی وہ برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے جا ملے۔ انہی لمحوں میں اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ وہ دلاور شاہ کو دستک کو پہچانتی تھی۔ وہ کافی حد تک حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت اس کے کمرے میں کیسے آ گیا؟ وہ تو اس سے کمرے سے باہر ہی ملا کرتا تھا۔ وہ اس کے قریب آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی اور اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

”اماں بی، میں جانتا ہوں، زبیدہ کے بارے میں سن کر آپ اس سے ملنے کی شدید خواہش رکھتی ہیں۔ کیا آپ اس سے ملنا چاہیں گی؟“

”کیوں نہیں بیٹا! میں اسے دیکھنے کے لئے، اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں۔“ وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

”آپ یہ فرمائیں کہ آپ اس کے پاس جائیں گی یا پھر اسے یہاں بلائیں گی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”جیسے تم چاہو بیٹا!“ وہ حیرت اور خوشی سے گھلے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اماں بی۔! مجھے آپ کا زبیدہ سے ملنے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن میرے خیال میں اسے خود یہاں آنا چاہئے۔ اور جب آئے تو اپنے ساتھ نادیہ کو لے کر آئے۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

”اگر وہ دونوں ڈر کی وجہ سے یہاں نہ آ سکی تو۔۔ اکیلی آ جائے تو۔۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔۔“ وہ ممکنہ خدشے کے باعث سوچتے ہوئے انداز میں بولی۔

”اب یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ آپ کی بیٹی، آپ سے ملنا بھی چاہے گی یا نہیں؟ اگر اس کے دل میں آپ کے لیے کوئی تڑپ ہوگی تو ہی ملنا چاہے گی۔ اب اگر وہ نادیہ کو لاتی ہے اپنے ساتھ، تبھی اس حویلی میں قدم رکھ پائے گی، ورنہ اس کا یہاں کیا کام۔ اگر وہ نادیہ کی وجہ سے نہیں ملنے آئے گی تو سمجھیں، وہ میری دشمن ہوگی۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں بیٹا۔ وہ ایسا نہیں کرے گی۔“ دادی اماں تیزی سے بولی۔

”یہ آپ پر ہے دادی اماں کہ آپ اسے مجبور کریں، تاکہ وہ نادیہ کو لے کر ہی یہاں آئے۔ آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

”دلاور شاہ، تم سختی نہ کرو۔ ورنہ جو کچھ تم چاہ رہے ہو، ویسا ممکن نہیں ہو پائے گا۔“ انہوں نے تشویش سے کہا۔

”آپ ایسا ممکن کرو دادی اماں، ورنہ حویلی کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔ یہ ساری شان و شوکت، یہ لوگوں کی عقیدت سب ختم ہو جائے گی۔“ وہ تیزی سے بولا۔

''کچھ بھی ختم نہیں ہوگا۔اگر تم تحمل سے کام لوتو۔۔ذرا برداشت کرو۔۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ بولیں۔

''کیسے۔۔کیسے ہوگا سب ٹھیک۔۔پہلے زبیدہ گئی۔۔اور اب نادیہ۔۔زبیدہ کے معاملے پر تو پردہ پڑ گیا تھا۔اب نادیہ کے ساتھ اس کا معاملہ بھی لوگوں کی زبان پر ہوگا۔ان دونوں کو خاموشی سے حویلی آنا ہوگا۔ورنہ میں دونوں کی آواز بند کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔'' وہ انتہائی غصے میں بولا۔

''دیکھو۔!ذرا تحمل سے سوچو،تم نے بتایا ہے نا کہ زبیدہ کا ایک بیٹا بھی ہے۔اگر تم خود پر قابو رکھو اور میری بات مانو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔سارے معاملات درست ہو جائیں گے۔'' انہوں نے پرسکون انداز میں کہا۔تب وہ ٹھٹکتے ہوئے بولا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں اماں بی؟''

''بیٹا۔!فرح بھی تو تمہاری بیٹی ہے۔تم اگر مصلحت سے کام لو نا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اشارے میں سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''آپ کی یہ بات ٹھیک ہے کہ اس وقت مجھے مصلحت ہی سے کام لینا چاہیے۔باقی جو کچھ بھی ہے،وہ سب بعد کی باتیں ہیں۔فی الحال نادیہ کو حویلی میں واپس بلوا لیں۔اس کے ساتھ اگر زبیدہ بھی آ جاتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔اس وقت صورت حال کیا ہے یہ آپ خود سمجھتی ہیں۔'' دلاور شاہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو دادی اماں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔چند لمحے وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر دلاور نے اپنا فون نکالا اور نمبر ملاتے ہوئے بولا ''لیں۔یہ کریں بات زبیدہ سے۔۔'' کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔اس نے فون ان کی جانب بڑھا دیا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔دوسری جانب سے ہیلو کی آواز سن کر دادی اماں نے بھیگے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''زبیدہ۔!''

''اماں۔۔۔آپ۔۔۔'' جس بھیگی ہوئی آواز میں اس کا نام لیا گیا تھا۔وہ آواز لمحے کے ہزارویں حصے میں پہچان گئی۔ممتا میں گوندھا ہوا یہ لفظ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو جذبات کے بندھ ایک دم سے ٹوٹ گئے۔اسے یوں لگا جیسے کسی گہرے گھاؤ پر مرہم رکھ دیا گیا ہو۔وہ سکون کی ان انتہاؤں پر جا پہنچی جہاں سے وہ دور تک اپنے ماضی کو ایک ہی نگاہ میں دیکھ سکتی تھی۔

''ہاں یہ میں ہوں۔۔جو آج تک تیری راہ تک رہی ہوں۔کہاں گم ہو گئی ہو تم۔۔ترس گئی ہوں تمہیں دیکھنے کے لیے۔۔۔'' وہ اپنی رَو میں کہتی چلی گئی۔تب زبیدہ کو خود پر قابو نہیں رہا۔وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''میں کہیں بھی گم نہیں ہوئی ہوں اماں۔۔بس اپنا آپ چھپا کر بیٹھی ہوں۔''

''نادیہ اگر تم تک نہ پہنچ پاتی تو شاید میں تیری آواز بھی نہ سن پاتی۔'' اماں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں۔۔یہ کوئی اتفاق تھا۔۔یا قدرت ہی کو ہمارا ملن منظور تھا۔وہ جو یہاں تک پہنچ گئی ہے۔یہ بھی تو میرے اللہ کا احسان ہے نا۔۔ورنہ وہ اگر کہیں۔۔'' وہ انجانے خوف سے لرزتے ہوئے بولی۔

''وہ اللہ ہی تو ہے جو عزتیں رکھنے والا ہے۔بندہ تو نجانے کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔میں نادیہ کو بھی دوش نہیں دوں گی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔۔یہ بات ساری دنیا میں سے زیادہ تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔لیکن بیٹی۔!کیا حویلی کی قسمت میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔'' دادی اماں کے لہجے میں شکوہ در آیا تھا۔

''اماں۔! میرا تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ مگر نادیہ کے ساتھ تو ظلم ہونے جا رہا تھا۔ مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ حویلی اگر انسانوں کے جذبات کو کچل کر رکھے گی تو اس کی قسمت میں ایسا ہی رہے گا۔'' زبیدہ نے واضح لفظوں میں ہمت کر کے کہہ دیا۔

''ہاں۔! تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا ہی ہے۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ عورتوں کو دبا کر رکھا جا سکتا ہے۔ اب انہیں سمجھنا ہوگا۔ ان روایات پر سمجھوتہ کرنا ہوگا۔ مگر بیٹی، یہ پرکھوں کی عزت کا معاملہ بھی تو ہے نا۔ اسے بھی تو سمجھو۔'' دادی اماں نے اس سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے اپنی بات کہہ دی۔

''اماں۔! میں کسی حد تک سمجھ سکتی ہوں کہ دلاور شاہ اس معصوم بچی کے ساتھ کیوں ایسا چاہ رہا ہے۔ صرف جائیداد کی خاطر، کب تک وہ اس جائیداد سے فائدہ اٹھالے گا۔ اس بچی کو تو پتہ بھی نہیں کہ اصل میں اسے حویلی میں قید کس وجہ سے رکھا جا رہا ہے۔۔۔ اماں۔! کیسی روایات ہیں یہ۔۔ جو انسانوں کو نگل رہی ہیں۔''

''میں تم سے اختلاف نہیں کرتی اور یہ وقت بحث کا بھی نہیں ہے میری بیٹی۔ اتنے برسوں بعد تم مجھ سے ملی ہو۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے ملو، میں ترس گئی ہوں تمہاری صورت دیکھنے کے لیے، سنا ہے، تیرا بیٹا بھی ہے۔'' اماں نے پوچھا۔

''ہاں۔! میں نے اپنے بیٹے ہی کے سہارے اتنا طویل وقت گذار لیا ہے۔ اب وہ جوان ہو گیا ہے برسر روزگار ہے۔ اور اماں، میں تو پل پل آپ کیلئے تڑپی ہوں۔ میں کیوں نہیں ملنا چاہوں گی آپ سے ملنا۔'' وہ حسرت زدہ لہجے میں بولی۔

''تو پھر تمہیں کس نے روکا ہے۔ آ جاؤ نا میری بچی۔ جب سے تمہارے بارے میں پتہ چلا ہے، تمہیں دیکھنے کو، تم سے ملنے کو دل تڑپ رہا ہے۔'' اماں کا لہجہ پھر سے بھیگنے لگا تھا۔

''ایسا ہی حال میرا ہے اماں۔ پر کیا کروں، مجھے اپنے بیٹے کو بھی جواب دینا ہوگا۔ وہ کیا سوچے گا۔ اماں میں نے اسے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں اگر حویلی آ جاتی ہوں تو پھر۔۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا۔'' وہ اٹکتے ہوئے انداز میں بولی۔

''کیا نادیہ کی موجودگی سے یہ معاملہ نہیں کھلے گا۔ وہ سوال نہیں کرے گا کہ یہ کون ہے؟ کیا تم پھوپی بھتیجی کا رشتہ چھپا پاؤ گی۔ یہ ماضی تو ایک دن کھل ہی جانا ہے، تو پھر ڈرتی کیوں ہو؟'' اماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جب تک ممکن ہو، میں اپنا ماضی چھپاؤں گی۔۔ جیسے آج تک چھپاتی آئی ہوں۔ اگرچہ میں نے غلط نہیں کیا مگر بہت ساری وجوہات ہیں جس کی وجہ سے میں اپنے بیٹے کو نہیں بتاتی ہوں۔ میں شرمندہ نہیں ہوں اماں۔ ہاں۔! جہاں تک نادیہ کا معاملہ ہے، اس بارے میں آپ کو سوچ کر بتادوں گی۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں کہتے ہوئے ہانپ گئی۔

''بیٹی۔ اب جو بھی ہے، حویلی کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ اچھا وقت ہے کہ تمہارے ماضی پر سوال اٹھائے بنا، تمہارا تعلق حویلی سے جڑ سکتا ہے تم اس لیے۔۔'' انہوں نے کہنا چاہا تو وہ بات قطع کرتے ہوئے بولی۔

''حویلی کی عزت کا خیال تو ہے۔ لیکن ان روایات کا کیا ہوگا۔۔۔؟''

''میں سمجھ سکتی ہوں زبیدہ۔! اب وہ وقت آ گیا ہے، جب ان روایات کو دیکھا پرکھا جائے۔ وقت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔ یہ سب دور بیٹھ کر نہیں، پاس آ کر بات کرنے سے ہوگا۔ تم جو بھی چاہتی ہو۔ یہاں حویلی میں بیٹھ کر منوا سکتی ہو۔'' اماں نے تیزی سے کہا۔

''اماں۔! میں حویلی آ سکوں یا نہ آؤں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن معاملہ تو نادیہ کا ہے نا۔ کیا ضمانت ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہو گا۔ میرے کہنے پر وہ حویلی آ بھی جائے مگر ہونا وہی ہے جو وہ نہیں چاہتی تو پھر اسے کیا ضرورت ہے حویلی آنے کی۔۔'' وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''میں ضمانت دیتی ہوں۔ نادیہ صرف حویلی میں رہے۔ باقی جو ہوگا، اسی کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ اگر پھر بھی وہ کچھ تنگی محسوس کرے۔ تب وہ تمہارے پاس رہ سکتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ حویلی سے نادیہ کا یوں غائب ہو جانا کس قدر اور کتنی افواہوں کی وجہ بن سکتا ہے۔ ایک بار نادیہ حویلی میں آ جائے۔ پھر وہ چاہے تیرے پاس رہے یا حویلی میں۔۔۔'' اماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اماں۔! میں سمجھتی ہوں۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے کہا نا کہ میں سوچتی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''کیا سوچنا ہے تمہیں؟'' انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

''مجھے نادیہ سے پوچھنا ہے، وہ کیا چاہتی ہے۔'' وہ سکون سے بولی۔

''اس سے پوچھنا نہیں، اسے سمجھانا ہے۔ ورنہ وہ حویلی سے جاتی ہی کیوں؟ تم تو سمجھ دار ہو۔ تم دونوں آؤ۔ یہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ پھر جو تیرا فیصلہ ہوگا، وہی ہوگا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' وہ پورے اعتماد سے بولی۔

''ٹھیک ہے اماں، میں بتاتی ہوں آپ کو۔'' زبیدہ نے پھر آہستگی سے کہا اور چند باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ دادی اماں فون بند کر کے جو یوں ہو گئی جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ وہ آنے والے وقت کے بارے میں اعتماد سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی

☆☆☆

نادیہ حیرت سے اپنی پھوپھو کے چہرے پر دیکھ رہی تھی جہاں حسرت، ندامت اور محبت کے نجانے کتنے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دادی اماں کے فون آنے کے بارے میں پوری تفصیل سن چکی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ کافی دیر بعد وہ بولی۔

''پھوپھو۔! میں آپ کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں۔ ایسے میں آپ جو بھی فیصلہ کریں گی وہ مجھے قبول ہوگا۔''

زبیدہ کے انتہائی حسرت سے اس کی طرف دیکھا اور تڑپتے ہوئے بولی۔

''نہیں میری جان، میری مجبوریاں اپنی جگہ، لیکن میں تیری زندگی کے عوض کوئی ایسا سودا نہیں کروں گی، جس میں تیری مرضی شامل نہ ہو۔''

''مگر میں بھی تو یہ نہیں چاہوں گی کہ وہ راز جو آپ نے ساری عمر شعیب سے چھپا کر رکھا، وہ میری وجہ سے کھل جائے۔ نہیں پھوپھو، میں ایسا نہیں چاہوں گی۔'' وہ گھٹے ہوئے لہجے میں بولی اور آخری لفظ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے۔

''نہیں میری بیٹی، رونا نہیں۔ یہ وقت بہت سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنے کا ہے۔ ورنہ وقت ہمارے ہاتھ سے بھی نکل سکتا ہے۔ مجھے ڈر صرف اس بات کا ہے کہ اگر شعیب کو اس ساری صورت حال کا پتہ چل جاتا ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ اسے شاک تو ضرور لگے گا۔'' زبیدہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔ اگر میں واپس حویلی میں چلی جاؤں گی۔ ظہیر شاہ سے میری شادی ہو جائے گی اور میں۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو زبیدہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔۔۔ تم یوں حوصلہ مت ہارو''

''اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے پھوپھو، آپ کا راز بھی رہ جائے گا، حویلی والوں کی عزت بچ جائے گی اور شعیب کو بھی معلوم نہیں ہوگا تو پھر ردعمل کیسا؟ میں نہیں چاہتی کہ آپ کی زندگی میں کوئی ایسا وقت جس سے آپ کو کوئی پچھتاوا ہو۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ میری قسمت میں۔۔۔۔۔''

''کوئی جذباتی فیصلہ مت کرو۔ میں دیکھتی ہوں کیا کرنا ہوگا۔ ابھی شام ہونے میں بہت وقت ہے۔ ہم کوئی سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کریں گے۔'' زبیدہ نے اسے ڈھارس دی اور پھر اٹھ کر کچن کی جانب چل دی۔

یہ لمحات نادیہ کے لیے بہت کٹھن تھے۔ اس کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ اسے ایسی صورت حال کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں خون کے جذباتی رشتے اس کی راہ میں آن کھڑے ہوں گے۔ اسے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہو رہا تھا کہ وہ تو اختر رومانوی کے پاس آئی تھی۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ ایک غریب شاعر جس کے پاس اگر وقت اچھا نہیں تو کم از کم برا بھی نہیں گذرے گا۔ وہ حویلی والوں کی نگاہ ہی میں نہیں، دنیا کی نظروں میں بھی گم ہو جائے گی۔ اس کی جگہ تو شعیب نے لے لی تھی جو خود ایک سی ایس پی آفیسر تھا اور اس کے شہر میں تھا۔ اس سے اتنا قریب تھا۔ وہ خود اس سے دور آ گئی ہے۔ اختر رومانوی کا گم ہو جانا اسے شدید صدمے سے دوچار کر گیا تھا۔ اسے یہ قطعاً دکھ نہیں تھا کہ شعیب نے اس سے جھوٹ کیوں بولا حالانکہ اس نے خود کون سا سچ بولا تھا۔ تاہم جس طرح کے حالات کا اسے یہاں آ کر واسطہ پڑ گیا تھا۔ ایسے میں شعیب کیا اسے قبول کر لے گا؟ پھوپھو

کی مجبوری بھی یہی ہے کہ شعیب کو معلوم نہ ہو۔اس لئے اسے حویلی واپس جانا ہی ہوگا۔جس کے پاس وہ آئی تھی، وہی سراب نکلا۔وہ دوش کسے دے۔اگر وہ اب بھی اپنی قسمت سے لڑے گی تو بڑی ٹوٹ پھوٹ ہو جائے گی۔وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی اور شام کے سائے پھیل گئے۔وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ حویلی سے آنے والے فون نے منتظر تھیں۔اس سے پہلے کہ فون آتا۔نادیہ خود ہی اپنی پھوپھو کے پاس جا پہنچی۔

''پھوپھو۔!میں سمجھتی ہوں کہ آپ ایسے دوراہے پر آن کھڑی ہوئی ہیں۔جہاں سے نکلنے والا ہر راستہ آپ کی اچھی بھلی زندگی میں الجھنیں بھر دے گا۔اس لئے۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اس لئے۔۔۔؟'' زبیدہ نے چونک کر پوچھا تو وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''مجھے حویلی چلے جانا چاہیے۔''

''وہ تمہاری شادی ظہیر سے کر دیں گے۔۔اور اب شاید تمہاری وہ اہمیت نہ رہے گی جو حویلی سے قدم نکالنے سے پہلے تھی۔'' وہ تشویش سے بولی۔

''پھوپھو، اگر میں اختر رومانوی کے پاس ہوتی تو یہ الگ بات تھی۔اس وقت تو معاملہ میری پھوپھو کا ہے۔ایک ایسی ماں کا جو اپنے بیٹے کے سامنے اپنا راز نہیں کھولنا چاہتی۔یہ آپ پر کوئی احسان نہیں۔میرا فرض بنتا ہے پھوپھو۔باقی رہی اہمیت کی بات، تو وہ پہلے کہاں تھی۔یہ اچھا ہے کہ شعیب کو میرے بارے میں علم نہیں ہو سکا۔میں اسے اپنے رب کی رحمت ہی سمجھوں گی۔آپ بھی اسے کچھ مت کہیے گا۔میں حویلی کی ان خاموش دیواروں میں زندگی جی لوں گی۔'' نادیہ نے کہنا تو بڑے اعتماد سے شروع کیا تھا مگر کہتے کہتے اس کے آنسو چھلک پڑے اور لہجہ بھیگتا چلا گیا۔زبیدہ کتنی دیر اسے حیرت سے دیکھتی رہی پھر اسے گلے لگا کر شدت سے رو پڑی۔کچھ دیر تک وہ دونوں آنسو بہاتی رہیں۔تب زبیدہ نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹی۔میں تمہیں ان دیواروں میں قید نہیں ہونے دوں گی۔بلکہ اب وقت آ گیا ہے کہ ان روایات کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ہم حویلی جائیں گے اور انہیں احساس دلائیں گے کہ ان روایات کو ختم کرو جس سے زندگیاں درگور ہو جاتی ہیں۔تم صبر کرو۔اب اگر راز فاش ہو جاتا ہے تو ہو جائے مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بڑے اعتماد سے بولی۔پھر نادیہ کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کر دیئے۔

زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ حویلی سے فون آ گیا۔

''تو پھر کیا فیصلہ کیا تم نے زبیدہ؟''

''اماں۔!میں آ رہی ہوں۔میرے ساتھ نادیہ بھی آئے گی۔لیکن آپ کو یہ ضمانت دینا ہوگی کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔'' اس نے صاف لفظوں سے اپنا مدعا کہہ دیا۔

''میں ضمانت دیتی ہوں۔جو اس کا من چاہے گا، ویسا ہی ہوگا۔'' انہوں نے پورے یقین سے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر میں آ جاؤں گی۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا اور الوداعی جملوں کے بعد فون بند کر دیا۔وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بھا حمید کو فون کر دیا۔

''بھائی جی۔ مجھے سلامت نگر جانا ہے۔ گاڑی تو کوئی بھجوا دیں۔'' فون ریسو ہوتے ہی اس نے کہا۔

''اپنے شعیب کے پاس جانا ہے نا۔۔۔ آجاتی ہے گاڑی، ابھی چاہئے۔'' اس نے پوچھا۔

''کچھ دیر بعد بھیجیں مجھے شعیب کے پاس نہیں، نادیہ کو چھوڑنے جانا ہے آپ بھی اسے مت بتائیے گا۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا اسے نہیں معلوم کہ نادیہ یہاں۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''نہیں، اور نہ ہی کبھی معلوم ہونا چاہئے، یہی سمجھ لیں کہ وہ کبھی یہاں نہیں آئی تھی اور جو ڈرائیور بھی ساتھ میں بھیجیں وہ بہت بھروسے کا بندہ ہونا چاہیے۔'' زبیدہ نے رُندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھی بات ہے بہن جی، جیسا آپ چاہیں۔ میں کچھ دیر بعد گاڑی بھجوا دوں گا۔'' اس نے انتہائی اختصار سے کہا اور فون بند کر دیا۔ انہی لمحات میں دونوں نے فطری طور پر ایک دوسرے کو دیکھا تو نادیہ دکھی انداز میں لبوں پر مسکراہٹ لے آئی۔ جس سے زبیدہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ کوئی بات کہے بنا حویلی جانے کے لئے تیار ہونے لگیں۔ یہ زبیدہ ہی جانتی تھی کہ وہ کس دل سے اتنے برسوں بعد حویلی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ جبکہ نادیہ یہاں سے اٹھ کر شعیب کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کتنی ہی دیر تک اس کی تصویر کے سامنے کھڑی رہی۔ یوں بت بنی ساکت و صامت جیسے وہ بھی کوئی تصویر ہی ہو۔ کافی دیر تک یونہی تصویر کو تکتے رہنے کے بعد وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ رات گئے زبیدہ نے اپنا گھر ایک اعتماد والی عورت کے سپرد کیا اور وہ دونوں بھا حمید کی بھیجی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر سلامت نگر کی جانب چل دیں۔

رات کے تعاقب میں دن پوری طرح واضح ہو گیا تھا۔ جب ان کی گاڑی سلامت نگر پہنچ گئی۔ وہاں کی تو دنیا ہی بدل گئی ہوئی تھی۔ زبیدہ اپنے ہی بابل کے دیار میں اجنبی تھی۔ اتنے برسوں بعد وہ سلامت نگر کی راہوں پر آئی تھی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ حویلی کدھر ہے اور ایسا ہی حال نادیہ کا تھا۔ وہ بھی سلامت نگر کی گلیوں اور راہوں سے ناآشنا تھی۔ وہ تو خود اندھیرے میں نکلی تھی اور اب دن کی روشنی میں اسے حویلی کا راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس غنیمت یہی تھا کہ سلامت نگر میں صرف ایک حویلی ہی پیر سائیں کی تھی۔ جہاں تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ پورا قصبہ گذر گیا اور اس کے باہر دربار شریف تھا جس کے ساتھ حویلی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ ایستادہ تھی۔ بڑے پھاٹک پر اب بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ زبیدہ اور نادیہ نے چہروں سمیت اپنا پورا بدن سیاہ حجاب میں چھپایا ہوا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں؟ اسے لئے انہیں روک لیا گیا۔ زبیدہ سمجھ گئی کہ نادیہ بارے کوئی خبر ابھی حویلی سے باہر نہیں نکلی اور نہ ہی اسے کسی نے دیکھا ہے کہ دیکھتے ہی پہچان لیں۔ ایک شخص ان کے پاس آیا تو ڈرائیور نے ہی کہہ دیا جو زبیدہ نے اسے بتایا تھا۔

''دادی اماں صاحبہ سے ملنا ہے، انہیں اطلاع دیں۔ ہم شہر سے آئے ہیں۔''

''اماں بی صاحبہ کا نام سن کر بڑا پھاٹک کھل گیا۔ لیکن ذرا فاصلے پر انہیں روک لیا گیا اور ایک ملازم اندر اطلاع دینے کے لیے چل دیا۔

☆☆☆

شعیب اچانک ہی پریشان ہوگیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وقت کی طنابیں اس کے ہاتھ سے نکلتی جارہی ہیں۔ سلامت نگر آتے ہوئے جو ذہنی طور پر پرسکون ہوگیا تھا۔ ایک دم سے پریشانی نے اس پر حملہ آور ہوگئی تھی۔ انہی دو دنوں میں دو ایسے واقعات ہوگئے، جس نے اس کا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔ نادیہ کا نمبر اچانک بند ہوا تو پھر اس سے کوئی رابطہ ہی نہ ہوسکا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ خود پر حیران تھا کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے؟ یہ وہی نادیہ ہے جس سے وہ کبھی خود رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے تعلق ختم ہوجائے۔ اب وہی نادیہ اسے اپنے انتہائی قریب محسوس ہورہی تھی۔ یونہی کھیل ہی کھیل میں، ایک ساتھ چلتے چلتے اتنی گہری قرابت ہوجائے گی۔ ایسا تو کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس قرابت کی شدت کا اندازہ اسے ان لمحات میں ہورہا تھا جب وہ اندھیروں میں گم ہوگئی تھی۔ وہ مسلسل اس کے نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار ایک ہی ٹیپ سنائی دے رہی تھی۔ اگرچہ اس کے لاشعور میں کہیں تھا کہ وہ یونہی ایک دن گم ہوجائے گی۔ لیکن وہ کیوں گم ہوگئی؟ اس سوال کا جواب اسے حیرت زدہ کر رہا تھا۔ یہ نادیہ ہی کی کوشش تھی کہ وہ دوستی کی راہ پر چلتے چلتے بہت دور تک آگئے تھے۔ اس کا بناء کچھ کہے اچانک غائب ہوجانا پریشانی کا باعث ہی نہیں فکرمندی بھی پیدا کر رہا تھا۔ وہ اسے کہاں سے اور کیسے تلاش کرے، یہی تو اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ سوائے ایک نمبر کے اس کے پاس تھا ہی کیا؟ یہی ایک سہارا تھا، ایسے کچے دھاگے سے وہ نادیہ تک کیسے رسائی پاسکتا ہے۔ یہ تو کبھی بھی اور کہیں سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اسے یقین نہیں ہورہا تھا کہ یہ وہی نادیہ ہے جس نے دو دن اور دو راتوں سے اس سے بات نہیں کی تھی۔ کیوں؟ اس کے بعد سب کچھ اندھیرے میں گم ہوجاتا اور اس پر مایوسی چھائے چلی جارہی تھی۔

مایوسی بھرے ان حالات میں چوہدری ثناء اللہ کی اطلاع کا بوجھ اس کے ضمیر پر بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ اسی شہر میں، اس سے تھوڑی دور حویلی میں تاجاں مائی قتل ہوجانے والی تھی یا پھر شاید اسے قتل بھی کردیا گیا ہو اور اب تک وہ منوں مٹی تلے دفن پڑی ہو۔ یہ بات اس کے علم میں نہ آتی تو الگ بات تھی۔ بہتیرے ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ جن کا علم نہیں ہوتا تو ایسے میں دکھ بھی من میں نہیں اُترتا۔ اب یہ اطلاع اسے تھی۔ ذمہ داری اور انسانی ہمدردی کا بوجھ تھا کہ اس پر بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ اگر وہ عورت قتل ہوجاتی ہے اور اس ضمن میں اس نے کوئی کوشش بھی نہ کی کہ اسے بچالے تو وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پائے گا۔ اس کے پاس ایسے کوئی اختیارات نہیں تھے۔ جنہیں وہ استعمال کرتے ہوئے حویلی کی تلاشی لے سکتا اور تاجاں مائی کو برآمد کر لیتا۔ یہ اختیارات دوسرے آفیسر کے تھے۔ وہ شہر کا سب سے بڑا انتظامی آفیسر ہونے کے باوجود بھی بے بس تھا۔ اس کے پاس اختیار نہیں تھے جس کے باعث وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی بے بسی اور مایوسی والی کیفیت میں وہ آفس جانے کے لیے تیار ہوچکا تھا۔

اگرچہ شعیب کو اس کا دماغ ایک خاص حد تک جا کر مایوسی کا فیصلہ تو دے چکا تھا لیکن وہ مضطرب تھا، ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔ کوئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔ صاف راستے پر اگر رکاوٹ آجائے تو ساتھ میں کوئی نہ کوئی پگڈنڈی ضرور منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ ایسی ہی کسی پگڈنڈی کی تلاش میں تھا۔ دل اسے مسلسل اکسا رہا تھا کہ ناکامی اس کے لئے نہیں بنی۔ کامیابی کے لئے وہ کوشش ضرور کرے۔ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ آفس جانے کے لئے تیار بھی تھا لیکن دماغ مسلسل سوچ رہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں آگیا۔ وہ نادیہ کو تلاش کرنے میں ایک قدم تو اٹھا سکتا ہے۔ وہ پگڈنڈی اس نے تلاش کر لی تھی۔ وہ سیل فون نمبر ہی سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ کوئی قانونی طریقہ نہیں تھا مگر

اسے پورا بھروسہ تھا۔ جو معلومات بھی ملیں گی، درست ہوں گی۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور اپنے قابلِ اعتماد دوست کو فون کر کے نمبر دے دیا۔ اس دوست نے تھوڑی دیر بعد معلومات دینے کا وعدہ کر لیا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے کافی حد تک اطمینان ہونے کے ساتھ ساتھ حوصلہ بھی ہوا۔ اب وہ اپنے آپ کو مطمئن کر سکتا تھا کہ اس نے کوشش تو کی۔ مایوسی کے بادل کسی حد تک چھٹ گئے۔ وہ تازہ دم سا ہو کر آفس چلا گیا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ تاجاں مائی کے معاملے میں بھی ایسی ہی کوئی پگڈنڈی تلاش کر لی جائے۔ اسے خیال آیا کہ پیر سائیں کی ایک فائل اس کے پاس پڑی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا دیوان اسے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دھمکیاں دے کر گیا تھا۔ ممکن ہے اس فائل کی وجہ سے کوئی سودے بازی ممکن ہو سکے۔ تاجاں مائی کی بازیابی کے لئے اسے اگر کوئی غیر قانونی حربہ بھی آزمانا پڑا تو وہ آزمائے گا۔ آفس پہنچتے ہی اس نے اپنے اہلکار سے وہ فائل لانے کے لئے کہہ دیا۔ ابھی فائل اس تک نہیں پہنچی تھی کہ چوہدری ثناء اللہ اور تاجاں مائی کا بیٹا الیاس علی اس کے پاس آ گئے۔ وہ ان کے ساتھ بڑے تپاک سے ملا اور حال احوال کے بعد پوچھا۔

’’سنائیں چوہدری صاحب۔! کوئی پیش رفت ہوئی؟‘‘

’’میں نے پولیس سے تعاون لینے کی کوشش کی تھی، لیکن آپ کو بھی معلوم ہے کہ وہ سیدھے سبھاؤ تیار نہیں ہیں۔ ہاں بس اب ایک ہی راستہ بچتا ہے۔‘‘ وہ اعتماد سے بولا۔

’’وہ کیا؟‘‘ شعیب نے پوچھا۔

’’یہی عدالت کا راستہ۔۔۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’اس میں تو بڑا وقت لگے گا۔ میں نے بھی یہ سوچا تھا۔ مگر تب تک تاجاں مائی۔۔۔‘‘ اس نے بے یقینی کے سے انداز میں کہتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’نہیں سر۔! تاجاں مائی ابھی تک محفوظ ہے۔ ہاں مگر اس پر تشدد بہت ہوا ہے۔ یہ اس کا بیٹا کرم علی ہے، اسے وہیں سے معلوم ہوا ہے۔‘‘ وہ پھر اعتماد سے بولا۔ ’’جہاں تک عدالت کی بات ہے تو ہم نے ایک مشہور وکیل کے ذریعے ایک کوشش کی ہے۔ آپ کا تعاون ہو تو ہم ابھی کچھ دیر بعد حویلی سے تاجاں مائی کو برآمد کر سکتے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ قانونی معاملات کے نکات سمجھانے لگا۔ شعیب غور سے سنتا رہا اور پھر بولا۔

’’آپ دیر مت کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کروں گا۔ میں ڈی ایس پی صاحب کو ابھی یہاں بلوا لیتا ہوں۔ پھر سب سنبھال لیتے ہیں۔ آپ فوراً حکم نامہ لے آئیں۔‘‘ شعیب نے کہا تو ثناء اللہ فوراً ہی اٹھ گیا۔ وہ ڈی ایس پی کو فون کرنے لگا۔ اس وقت وہ فون پر بات کر رہا تھا جب اس کا اہلکار اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا بات سن رہا تھا۔ وہ فون کر چکا تو اہلکار سے پوچھا۔

’’میں نے وہ فائل لانے کے لیے کہا تھا۔‘‘

’’سر۔! میں نے وہ فائل اپنے ذمے صرف اس لئے لی تھی کہ میں پہلے بھی پیر سائیں کے سارے کام کرواتا رہتا ہوں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اس میں کوئی جائز کام نہیں ہے اور پھر آپ انکار بھی کر چکے ہیں۔ اس لئے اب وہ کیوں سر؟‘‘ اس نے آخری لفظ بہت جھجک کر کہے تھے۔

''اور میں بھی تمہیں صاف بتانا چاہتا ہوں۔اس فائل کے ذریعے ممکن ہے میں پیر سائیں سے کوئی سودے بازی کرسکوں۔تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ۔۔۔''

''سر گستاخی معاف۔!میں ثنا اللہ کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ پیر سائیں کے خلاف ہی جائے گا۔۔۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''سر ان کا پرانا ہی معاملہ چلتا چلا آرہا ہے۔خیر۔!آپ کو سودے بازی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور جو معاملہ ابھی درپیش ہے، میں اس کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو معاملہ ہوگا میں اسے آرام سے حل کروادوں گا۔اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں۔'' اہلکار نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''کیسے۔!جبکہ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ معاملہ کیسا ہے۔وہ سیدھے سجاؤ حل بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟'' شعیب نے پوچھا۔

''سر۔!مجھے معاملہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔میں ابھی دیوان صاحب سے کہہ کر آپ کی ملاقات پیر سائیں سے کنفرم کروا دیتا ہوں آپ براہ راست خود ہی بات کر لیجئے گا۔'' اہلکار نے تیزی سے کہا۔

''کتنا وقت لگے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ابھی بات کر لیتا ہوں۔آپ کی پیر سائیں سے بات ہوجائے گی تو زیادہ اچھا ہے۔یہ ثنا اللہ جیسے بلیک میلر لوگوں کے ہتھے نہ چڑھیں، یہ خراب کریں گے۔۔'' وہ جلدی سے فون نکالتے ہوئے تیزی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ، اور فائل مجھے لا کر دو۔ان سے بات کرلو، میں آج بلکہ ابھی ان سے ملنا چاہوں گا۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا اور سامنے پڑی فائل کھول لی، اہلکار سمجھ گیا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔اس لئے فوراً ہی پلٹ گیا۔تب شعیب دونوں آپشن پر سوچنے لگا۔جو بھی ہو اور جیسے بھی ہو، اسے اپنا مقصد چاہیے تھا۔

☆☆☆
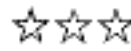
حویلی کی دوسری منزل پر، پورچ سے بالکل اوپر والے کمرے میں دادی اماں اور زبیدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ان دونوں کے درمیان اتنی باتیں ہو چکی تھیں کہ سب کچھ جاننے کے باوجود کئی سوال جنم لے چکے تھے۔اتنے برسوں کا فاصلہ اتنی دیر میں تو نہیں سمٹ سکتا تھا اور وہ تھیں کہ اس فاصلے کو سمیٹنے کی غرض سے باتیں کرتی چلی جارہی تھیں۔نادیہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔فرح اپنے کمرے میں مچل رہی تھی کہ وہ نادیہ سے ملے مگر اس کی امی نے اسے نادیہ سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ظہیر شاہ نے جب نادیہ کی آمد کے بارے میں سنا تو وہ حویلی سے باہر چلا گیا تھا، کہاں تھا، اس کی انہیں خبر نہیں تھی۔حویلی کے ماحول میں وہی اجنبی خاموشی تیر رہی تھی۔ایسی ہی بے اعتماد فضا میں دلاور شاہ اپنی ماں کے پاس آگیا۔تب وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے۔ہر کوئی یہی خیال کر رہا تھا کہ وہ بات کی ابتداء کرے۔تبھی دلاور شاہ نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''آپا۔!آپ نادیہ کو واپس حویلی لے آئی ہیں۔آپ کا شکریہ آپ نے اسے یہ تو سمجھا دیا ہے ناکہ اب اس حویلی میں کیسے رہنا ہے۔''

''کیسے رہنا ہوگا۔ مطلب۔۔۔ میں کچھ نہیں۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' زبیدہ نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اس میں نہ سمجھنے والی کون سے بات ہے۔ اس نے جو کچھ کیا، اس کی بھول سمجھ کر معاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن آئندہ کے لیے اسے حویلی کی روایات کے مطابق رہنا ہوگا۔ ظہیر شاہ سے شادی کے بعد۔'' اس نے کہنا چاہا تو زبیدہ نے ٹوک دیا۔

''دلاور۔! اس کے یہاں آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب تم جو چاہو اس سے منوالو۔ مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ جو نادیہ چاہے گی وہی ہوگا۔ لہذا وہی ہوگا جو نادیہ چاہے گی۔'' زبیدہ نے حیرت، غصے اور افسردگی کے ملے جلے جذبات میں تیزی سے کہا۔

''ایسا ممکن ہی نہیں ہے آپا زبیدہ۔! میں اگر آپ کے گھر سے خاموشی کے ساتھ واپس آ گیا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی روایات بھول گیا ہوں۔ میں نے صرف اس لیے خاموشی اختیار کی کہ اسی میں حویلی کی بھلائی ہے۔ بات نکلتی تو گڑھے مردے اکھاڑ لیے جاتے۔ اس میں آپ کا کردار کیا ہے۔ ساری دنیا کو معلوم ہو جاتا۔ آپ اگر یہاں اس وقت حویلی میں بیٹھی ہیں تو اس وجہ سے کہ میں نے نادیہ کو حویلی میں واپس لانا تھا اور بس، وہ آگئی ہے۔'' پیر سائیں نے خود غرضی سے کہا۔

''دلاور شاہ۔! تم بہت غلط سوچ رہے ہو۔'' زبیدہ نے غصے میں کہا۔

''غلط یا درست۔! یہ میں نہیں جانتا، مجھے تو وہی کرنا ہے جو میں چاہتا ہوں۔ آج ہی نادیہ کی شادی ظہیر شاہ سے ہو جائے گی۔ اب آپ کا کام ختم ہے، اب آپ سے مجھے کسی تعلق کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' اس نے واضح لفظوں میں اپنا مدعا کہا تو وہ دونوں حیران رہ گئیں۔ انہیں پیر سائیں سے اس قدر خود غرضی کی توقع نہیں تھی۔ اس پر زبیدہ نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

''تم نے یہ سب مصلحت کے تحت کیا۔ اور تمہیں رشتے ناطوں اور تعلق کی کوئی قدر نہیں۔۔۔ نہ ہی اپنے وعدہ کی۔''

'جو کچھ بھی آپ سمجھو، میرے خیال میں اگر ہم بات یہیں ختم کردیں تو زیادہ بہتر ہے۔ آپ چاہیں تو نکاح کے وقت تک یہاں رہ سکتی ہیں تاکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس کا نکاح ظہیر شاہ سے ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر جانے لگا تو زبیدہ نے بپھرتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ تم نے کہا، یہ فقط تمہاری سوچ ہے۔ یہ اس وقت تک حقیقت نہیں بن سکتی جب تک نادیہ نہیں چاہے گی۔ اور پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری مصلحت کے جال میں آ کر نادیہ کو یہاں لے آئی ہوں۔ اور اسے چھوڑ کر واپس چلی جاؤں گی۔ وہ بھی تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر۔۔۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔۔''

''میں نے جو سوچا ہے، وہی کرنا ہے۔ ابھی تم خود ہی دیکھ لوگی۔'' وہ غصے میں ادب آداب بھی بھول گیا۔ وہ اٹھا تو اماں بی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دلاور شاہ۔! کیا تم اپنی ماں کے وعدوں کا پاس بھی نہیں کرو گے۔۔۔ میں نے زبیدہ کو زبان دی ہے۔''

''حویلی کی عزت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے، دلاور شاہ کی ذات بھی نہیں۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال ریسو کی تو دوسری طرف دیوان تھا۔ وہ چند لمحے اس کی بات سنتا رہا اور پھر بولا ''انہیں مردان خانے میں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس

کھڑکی کی جانب بڑھ گیا جہاں سے حویلی کا بڑا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ پھر کچھ کہے بنا، فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ تب زبیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اماں۔! آپ فکر نہ کریں، دلاور شاہ نے اگر مجھے دھوکہ دیا ہے تو میں بھی اسے معاف نہیں کروں گی۔''

''کیا کرو گی تم۔۔۔ کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو مجھ سے ہی غلطی ہو گئی جو میں نے تمہیں یہاں بلوا لیا'' اماں نے بھیگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اماں۔! میں جب یہاں آئی تو یہ سب سوچ کر آئی تھی، مجھے کسی حد تک اندازہ تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اس لئے میں نے۔۔'' زبیدہ یہ کہتے ہوئے چونک گئی۔ وہ تیزی سے کھڑکی تک چلی گئی اور ہونقوں کی مانند باہر دیکھنے لگی جیسے باہر اس نے کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہو۔ پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''کون۔۔ کون پہنچ گیا'' اماں بی نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ زبیدہ کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''میرا بیٹا شعیب۔!'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''شعیب یہاں۔۔ کہاں ہے وہ'' اماں نے شدید حیرت سے کھڑکی کے پاس آ کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ ایک سرکاری گاڑی کے پاس تین لوگ کھڑے تھے۔ ان میں ایک شعیب تھا، ایک ڈرائیور اور تیسرا اہلکار۔

''وہی شعیب ہے، جو تینوں میں سے لمبا ہے۔۔'' زبیدہ نے آہستگی سے یوں کہا جیسے وہ شعیب سے اپنی آواز بھی چھپا رہی۔ جبکہ نانی نے نہال ہوتے ہوئے کہا۔

''ماشاللہ! کیسا کڑیل جوان ہے۔۔۔ میرا نواسہ۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ بالکل باپ پر گیا ہے۔''

''یہ آ کیسے گیا۔۔؟'' زبیدہ نے کہا۔ وہ مسلسل نیچے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''ہاں۔۔ یہ تو ہے۔ لیکن تم تو کہہ رہی تھی وہ کہیں کام سے گیا ہے۔ گھر آ کر پوچھا ہو گا تو۔۔۔ یہاں آ گیا۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے'' دادی نے اپنے تئیں اندازہ لگا کر کہا۔

''نہیں اماں۔! میں نے شعیب کے بارے میں بتایا تھا آپ کو، وہ سچ نہیں ہے، اسے نادیہ کے بارے میں قطعاً نہیں معلوم کہ وہ میرے گھر وہاں گئی تھی۔۔ اور نہ ہی میرے بیٹے کو یہ معلوم ہے کہ میرا بھی کوئی تعلق اس حویلی سے ہے۔'' وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تو پھر یہ یہاں کیسے آ گیا۔۔؟'' اماں بی نے شدت حیرت سے پوچھا تو وہ کھڑکی سے شعیب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرا بیٹا یہیں اس سلامت نگر میں سب سے بڑا انتظامی آفیسر ہے۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا، ایک ماں کا فخر جو اپنی ہونہار اولاد کے لئے ہوتا ہے۔

''اوہ۔ اس طرح تو پھر یہاں ایک طوفان اٹھ جائے گا'' اماں بی نے لمحوں میں سوچتے ہوئے کہا۔ مہیب خوف کے سناٹوں میں شعیب کے بارے میں ہونے والی خوشی اچانک دب کر رہ گئی۔ یوں جیسے خوف کی ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہو۔

''کاش دلاور شاہ اپنی من مانی نہ کرے اور۔'' زبیدہ نے کہا اور غور سے نیچے دیکھنے لگی۔ دیوان اس کے پاس چلا گیا تھا اور اس کو لے کر مردان خانے کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اسی طرف غور سے دیکھے چلی جا رہی تھی، پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ ''یہ آیا کیسے ہے؟''

''میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔'' اماں بی نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنی ملازمہ کو آواز دے دی۔ مضطرب سی زبیدہ کھڑکی سے لگی کھڑی تھی وہ بڑے پھاٹک کے پاس کھڑی سرکاری گاڑی کو تکے جا رہی تھی۔ جس میں اس کا بیٹا آیا تھا۔ چند لمحوں میں ملازمہ دادی اماں کے پاس آ گئی۔

''پتہ کرو، مردان خانے میں کون لوگ آئے ہیں اور کیوں؟'' ملازمہ یہ سن کر پلٹنے لگی تو دادی اماں نے دھیمے لہجے میں تاکید کی۔ ''اور سنو، اکسی کو معلوم نہ ہو۔''

''جی دادی اماں۔۔۔'' ملازمہ نے کہا اور الٹے قدموں واپس پلٹ گئی تو دادی اماں نے زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آ، زبیدہ، بیٹھ ادھر میرے پاس، تو پریشان نہ ہو، دلاور شاہ نے وعدہ خلافی کر کے اچھا نہیں کیا، میں اسے سمجھاؤں گی۔۔اور اسے۔۔۔''

''وہ تو اب میں اسے دیکھ لوں گی کہ وہ نادیہ کی مرضی کے خلاف کیا کر سکتا ہے۔ لیکن شعیب یہاں کیسے آ گیا۔ یہ کوئی تھوڑی پریشانی نہیں ہے۔ لگتا ہے اب میرا راز کھل جائے گا۔ میں۔۔۔میں اپنے بیٹے کا سامنا کیسے کر پاؤں گی۔'' وہ پاگلوں کی طرح خود کلامی میں کہتی ہوئی کھڑکی ہی کے پاس کھڑی تھی۔

''حوصلہ کرو میری بیٹی۔! اگر اسے معلوم ہو بھی گیا ہے تو کیا ہوگا۔ کیا ماں اور بیٹے کا رشتہ ختم ہو جائے گا؟ ایسے پاگلوں کی طرح مت سوچو، سکون سے میرے پاس آ کر بیٹھو۔ ممکن ہے وہ اپنے ہی کسی کام سے آیا ہو۔ یہ آفیسر لوگ تو یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ آ میری بیٹی، بیٹھ ادھر۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔۔۔ میں نے ساری زندگی اس سے یہ بات چھپائی ہے۔۔۔اور اگر اب۔۔۔'' وہ کہتے ہوئے رک گئی، پھر غصے میں بھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ 'میرے بارے میں پتہ چلتے ہی نادیہ کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا۔۔۔ بات یہیں تک نہیں رکنے والی۔ لیکن اب مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ بات کھلتی ہے تو کھل جائے۔ اب میں دلاور شاہ کو معاف نہیں کروں گی۔''

''اللہ خیر کرے گا۔ تم صبر تو کرو۔'' اماں بی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا، تب پھر ان دونوں میں خاموشی چھا گئی۔

وہ لاشعوری طور پر ملازمہ کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ اس کی اطلاع پر ہی وہ سوچ سکتی تھی کہ اب اس نے کیا کرنا ہے۔ یہ لمحات بہت بھاری تھے۔ گذارے نہیں گذر رہے تھے۔ ایک طرف دلاور شاہ لکیر کھینچ کر جا چکا تھا اور دوسری طرف شعیب حویلی آن پہنچا تھا۔ اس وقت زبیدہ ایسی کیفیت میں تھی جیسے کوئی خلا میں ہوتا ہے۔ نہ ہی کچھ سوچ سکتی تھی اور نہ ہی کچھ کہہ سکتی تھی، ایک جمود اس پر طاری تھا کہ وہ انتہائی بے بسی محسوس کر رہی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ملازمہ پلٹ آئی۔ اس کے چہرے پر عجیب طرح کا تاثر پھیلا ہوا تھا۔

''بولو، کون لوگ ہیں وہ۔؟'' اماں بی نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

''وہ شہر کے افسر ہی ہیں اماں۔۔ لیکن تاجاں مائی کو لینے آئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پیر سائیں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ وہ

اسے۔۔۔'' وہ تیزی سے کہنے لگی تو زبیدہ نے پوچھا۔

''دلاور شاہ کا رویہ کیسا ہے ان کے ساتھ۔۔۔؟''

''ٹھیک ہے۔ غصے میں نہیں ہیں۔۔ کہہ رہے تھے کہ تاجاں مائی کو جانے کی اجازت نہیں۔اس سے ملوایا جا سکتا ہے''

''اور وہ نہیں مان رہے ہوں گے؟'' دادی اماں نے جلدی سے پوچھا

''بس یہی بحث چل رہی ہے۔'' ملازمہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تاجاں مائی کہاں ہے۔'' اماں بی نے انتہائی آہستگی سے پوچھا تو ملازمہ نے زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے جھجک کر کہا۔

''وہ تہہ خانے میں ہے۔ پیر سائیں نے اسے وہاں بند کر دیا ہوا ہے۔''

''وہ ضد کا بڑا پکا ہے۔ تاجاں مائی کو لے کر ہی جائے گا۔ مگر وہ تاجاں مائی ہی کو کیوں لینے آ گیا۔'' زبیدہ نے پوچھا۔

''تاجاں مائی کا بیٹا کرم علی ان کے ساتھ ہے۔'' ملازمہ جلدی سے بولی تو دادی اماں چند لمحے سوچتی رہی پھر اس سے بولی۔

''اچھا، تو جا۔۔۔ میں جب تجھے بلاؤں تو آنا۔۔۔''

ملازمہ یہ سنتے ہی فوراً پلٹ گئی۔ تب اماں بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگی

''تاجاں مائی تو سب کچھ کہہ دے گی۔۔۔ اس کا منہ کون بند رکھے گا۔ اس نے منہ کھولا تو۔۔۔''

زبیدہ نے سنا تو انجانے خوف سے لرزتی ہوئی چونک اٹھی تھی۔ اسے فقط اپنے بیٹے کی فکر تھی۔

☆☆☆

نادیہ کو اپنے کمرے میں آتے ہی سب سے پہلی تشویش تاجاں مائی کے بارے میں ہی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اس وقت تک بے چین رہی، جب تک اسے تاجاں مائی کے بارے میں پتہ نہیں چل گیا کہ اس کے جانے کے بعد اس پر کیا گذری۔ نادیہ کا دل بھر آیا۔ تاجاں مائی نے اس کے لئے اتنی بڑی قربانی دی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد نادیہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تاجاں مائی اس وقت کہاں ہے؟ نادیہ کے گمان میں یہی تھا کہ پیر سائیں اب اپنا راز رکھنے کے لیے تاجاں مائی کو قتل کروا دے گا۔ یہی اس حویلی کی روایات میں تھا کہ راز افشا کرنے والے کی سانسیں کھینچ لی جاتی تھیں۔ وہ اپنی پھوپھی زبیدہ کا راز رکھنے کے لئے دوبارہ حویلی آ گئی تھی۔ یہاں حویلی آنے کا مطلب تھا کہ اپنی زندگی کو داؤ پر پھر سے لگا رہی تھی۔ اگرچہ پھوپھو زبیدہ اور دادی اماں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ہو گا وہی جو وہ خود چاہے گی، لیکن یہ بات اس کے دل میں نہیں اتری تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ پھوپھو زبیدہ سے جہاں خون کا رشتہ نکل آیا تھا، وہاں وہ شعیب کی ماں بھی تھی۔ وہ شعیب جس پر دیکھے بنا اعتماد کر چکی تھی۔ اس نے خود کو ان پر قربان کر دیا تھا۔ اس کی اپنی ذات تو نہ رہی تھی لیکن تاجاں مائی بے چاری کا کیا قصور، اس کی تو مدد کرنی چاہیے نا، اگر اسے کچھ ہو گیا تو ذمے دار وہی ہو گی۔ جس کے باعث وہ تشدد کے اذیت ناک مرحلے سے گذری ہے۔ اب اگر وہ حویلی میں ہے تو اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ تاجاں مائی کی مدد کرے۔ اس حویلی کی روایات سے وہ بغاوت تو کر ہی چکی ہے۔ باغی کے لئے جو سزا ہے وہ تو مقرر ہو ہی گئی ہے تو کیوں نا، اپنی مرضی کرے۔ یہ سوچتے ہی وہ اپنے کمرے سے اٹھی اور اس جانب چل دی، جہاں تہہ خانے میں تاجاں مائی کو رکھا ہوا تھا۔

تہہ خانے کا وہ دروازہ لاک تھا۔ دروازے پر جڑا تالہ اس کی طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہی تالہ تاجاں مائی کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ وہ واپس پلٹ آئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ وہاں پر واپس آئی تو حویلی کی دو ملازمائیں اس کے ساتھ تھیں اور تالا توڑنے کا سامان ان کے پاس تھا۔ ذرا سی دیر میں تالا ٹوٹ گیا اور وہ اس کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے ننگے فرش پر تاجاں مائی چت لیٹی ہوئی تھی۔ وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ اپنی آخری سانسوں پر ہو۔ تشدد کے باعث اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ کئی جگہ سے جلد پھٹی ہوئی تھی۔ جس سے خون رس رس کر سوکھ چکا تھا یا پھر آنسوؤں کی لکیروں میں بہہ گیا تھا۔ وہ نیم جان حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ نادیہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر خود اس کا اپنا دل بھر آیا تھا۔ اس نے تاجاں مائی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے آواز دی۔

''تاجاں مائی۔!''

''بی بی سائیں آپ۔۔۔! آپ۔۔کیسے۔۔۔ یہ مار دیں گے۔۔ جاؤ آپ۔۔۔''

''میں آ گئی ہوں نا۔۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔'' نادیہ نے اسے تسلی دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔۔۔ پیر سائیں مار دیں گے۔۔ آپ کو بھی اور مجھے بھی۔۔'' وہ تڑپ کر بولی تو نادیہ نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کہا ہے نا، کچھ نہیں ہوتا۔۔ تم اٹھو اور میرے کمرے تک چلو۔۔ میں دیکھ لیتی ہوں سب کو۔۔ چلو۔''

''بی بی سائیں۔! وہ بہت ظالم ہیں۔۔'' وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہیں کہا نا۔ اب کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں سب بتاتی ہوں۔ چلو اٹھو۔'' اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے اسے اٹھایا۔ تاجاں مائی بہت

کوشش کے بعد اٹھ گئی۔اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔نادیہ اسے سہارا دے کر کمرے سے باہر تک لے آئی۔پھر دونوں ملازماؤں کی مدد سے وہ کافی کوشش کے بعد اسے اپنے کمرے میں لانے میں کامیاب ہو گئی۔

نادیہ نے تاجاں مائی کو قالین پر لٹایا اور اس کے زخموں پر مرہم پٹی کرنے لگی۔تب تک ایک ملازمہ اس کے لئے کھانے پینے کے لیے کچھ چیزیں لے کر آ گئی۔اس سارے دورانیے میں نادیہ نے تاجاں مائی کو اعتماد میں لے لیا اور اس کی پوری حفاظت کے ذمے داری بھی لے لی۔وہ کافی حد تک سنبھل گئی مگر پیر سائیں کا خوف اب بھی اس پر مسلط تھا۔وہ گھبرائی، ڈری اور سہمی ہوئی نادیہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔وہ حیران ہو رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو گیا۔

''بی بی سائیں۔!آپ صرف بی بی زبیدہ کے لئے یہاں آ گئی ہیں۔اپنی ساری زندگی۔۔۔۔''

''ہاں۔!وہ بھی میرے ساتھ آ گئی ہیں اور دادی اماں کے پاس ہیں۔میں نے ان کا راز رکھنا ہے۔''نادیہ نے عزم سے کہا۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، کمرے کا دروازہ کھلا اور زبیدہ کے ساتھ دادی اماں وہیں آ گئیں۔زبیدہ حسرت سے تاجاں مائی کو دیکھ رہی تھی اور ایسی ہی حالت تاجاں مائی کی بھی تھی۔وہ اس عورت کو دیکھ رہی تھی جس سے وفا کرتے ہوئے اس کی ماں شرماں مائی نے اپنی جان دے دی تھی۔

''تم بہت چھوٹی سی تھی جب میں نے حویلی کو چھوڑا تھا۔میں بدقسمت رہی کہ تمہاری ماں کو نہ بچا سکی۔لیکن نادیہ نے تمہیں بچا لیا۔''زبیدہ نے انتہائی دکھ سے کہا۔تبھی نادیہ نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''پھوپھو۔!آپ اسے اپنے ساتھ شہر لے جائیں۔یہاں میں خود سنبھال لوں گی۔''

''کیا مطلب۔!تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟''زبیدہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

''جی پھوپھو۔!آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی۔۔آپ کا راز اور میرا راز صرف اسی صورت میں چھپا رہ سکتا ہے، جب تک میں یہاں ہوں۔''نادیہ نے کہنا چاہا۔

''میں مانتی ہوں نادیہ کہ یہ تم صرف میرے لئے کر رہی ہو۔اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا راز کھل گیا تو شاید شعیب سے بھی نگاہیں نہ ملا سکوں، میں چاہتی ہوں کہ میرا راز، راز ہی رہے، لیکن اس کی اتنی بھاری قیمت کم از کم میں نہیں ادا کر سکتی۔میں جو سوچ کر یہاں آئی تھی، حالات ویسے نہیں رہے۔اس وقت یہاں اس حویلی میں شعیب موجود ہے اور وہ اسے لینے کے لئے آیا ہوا ہے۔''زبیدہ نے کہا تو نادیہ بری طرح چونک گئی۔پھر وہ لرزتے ہوئے بولی۔

''شعیب یہاں۔۔کیسے۔۔؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔۔وہ ہر حال میں تاجاں مائی سے ملنا چاہتا ہے۔بلکہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔''زبیدہ نے کہا تو نادیہ نے دادی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں۔!یہ سب کیا ہو گیا ہے۔۔۔یہ۔۔یہ۔''وہ شدت جذبات سے کچھ نہ کہہ سکی۔تب دادی اماں نے سکون سے کہا۔

''تم سب سکون کرو۔۔۔میں کچھ کرتی ہوں۔'' پھر پاس کھڑی ملازمہ نے کہا۔'' جاؤ۔دیوان سے کہنا۔۔۔میں بلا رہی ہوں۔''

وہ سنتے ہی پلٹ گئی۔تب اماں نے تاجاں مائی سے کہا۔''تم باہر سے آنے والوں سے ملوگی۔انہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔بلکہ یہ کہوگی کہ تم یہاں حویلی میں رہنا چاہتی ہو۔تم پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔وہ لوگ چلے جائیں تو پھر میں سنبھال لوں گی۔اپنے بیٹے کو بھی سمجھا دینا۔۔۔''

''جیدادی اماں سائیں۔۔۔میں ایسا ہی کروں گی۔۔۔'' تاجاں مائی نے سعادت مندی سے کہا اور پرسکون ہوگئی۔

نادیہ سمجھ گئی تھی کہ دادی اماں کیا کرنے جارہی ہیں۔اس لیے خاموش رہی۔

☆☆☆

مردان خانے میں پیر سائیں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔اس کے دائیں طرف پڑے صوفوں پر شعیب اور اہلکار بیٹھے ہوئے تھے۔اور تاجاں مائی کا بیٹا کچھ فاصلے پر کھڑا تھا جہاں دیوان بیٹھا ہوا تھا۔ان کے درمیان باتیں ختم ہو چکی تھیں۔صرف فیصلہ پیر سائیں پر تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔شعیب اس سے ذرا مرعوب نہیں ہوا تھا۔اس نے پیر سائیں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تاجاں مائی کا مطالبہ کیا تھا۔اس دوران فون بھی آتے رہے اور بحث بھی چلتی رہی۔تب اچانک پیر سائیں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کو تاجاں سے ملوا دیتا ہوں۔''

یہ کہنے کے ساتھ ہی باتیں ختم ہوگئی تھیں اور وہ لوگ تاجاں مائی کی آمد کے منتظر تھے۔چند لمحے گذرے ہوں گے کہ بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی تاجاں مائی ان کے پاس آکھڑی ہوئی۔تبھی اس کا بیٹا حیرت اور درد بھری خوشی میں پکار اٹھا۔

''اماں۔!تم ٹھیک تو ہونا۔۔۔''

''ہاں پتر۔!میں ٹھیک ہوں۔۔۔'' پھر بڑے مودب لہجے میں پیر سائیں کی طرف دیکھ کر بولی۔''جی، پیر سائیں حکم۔۔۔''

''یہ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں۔۔۔تیرا بیٹا لے کر آیا ہے، پوچھ لو کیا کہتے ہیں۔۔۔؟'' پیر سائیں نے رعونت سے کہا تو وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''تاجاں مائی۔!کیا تم پر حویلی میں کوئی تشدد ہوا ہے، یا تمہیں یہاں اپنی جان کو خطرہ ہے؟'' شعیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں سرکار۔!ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔آپ سے کس نے کہا؟''

''تمہارے بیٹے نے۔۔۔اور یہ تمہارے چہرے پر۔۔۔''

''اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔میں سیڑیوں سے گرگئی تھی۔تب سے یہیں ہوں۔میرے چوٹیں آگئی تھیں۔یہاں میرا بہت اچھا خیال رکھا جا رہا ہے۔میرا علاج ہو رہا ہے۔'' تاجاں مائی نے بڑی مشکل سے کہا۔

''اوہ۔!لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں تمہارے گھر سے غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے۔۔۔اور۔۔'' شعیب نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، میں ٹھیک ہوں، مجھے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔'' تاجاں مائی نے کہا تو شعیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔نجانے اسے تاجاں مائی کے بیان پر یقین کیوں نہیں آرہا تھا۔اس کا لہجہ اور آنکھیں یکساں نہیں تھیں۔مگر یہاں آنکھوں کی زبان پر نہیں، لفظوں پر یقین کرنا تھا۔وہ چند لمحے سوچتا رہا۔پھر فوراً ہی اٹھتے ہوئے بولا۔

’’او کے پیر سائیں۔! آپ کو تکلیف دینے کی معذرت۔۔اب میں چلتا ہوں۔‘‘

’’کھانا کھا کر جایئے گا۔‘‘ پیر سائیں نے فتح مندی کے بھرپور احساس کے ساتھ کہا۔

’’نہیں۔! میں معذرت خواہ ہوں۔‘‘ یہ کہا اور اس سے ہاتھ ملائے بغیر وہاں سے نکل کر باہر آ گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا مردان خانے سے نکلا تھا۔ پیر سائیں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر دیوان کی طرف دیکھا اور بولا۔

’’ان لوگوں کو بھی بھجوا دو۔۔میں اب آرام کروں گا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ بھی مردان خانے سے نکل گیا۔ تب تاجاں مائی کا بیٹا فوراً اپنی ماں کی جانب آیا اور احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔

’’اماں، یہ تو نے کیا کہا۔ کیوں جھوٹ بولا۔‘‘

’’تم نہیں جانتے پتر۔۔! تم جاؤ۔۔میں حویلی ہی میں رہوں گی۔۔جاؤ تم۔۔‘‘ تاجاں مائی نے بڑے پیار سے کہا۔

’’نہیں اماں۔! میں نہیں جانتا کہ تو کیوں جھوٹ بول رہی ہے۔ پر میں تجھے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ چلو میرے ساتھ۔‘‘ بیٹے نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

’’نہیں۔ میں نے کہا نا۔ تم جاؤ۔۔۔میں یہیں رہوں گی۔۔‘‘ اس نے کہا اور واپس پلٹ گئی۔ تب دیوان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’جاؤ پتر جاؤ۔ اس حویلی کے بغیر تم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ آرام سے گھر جا کر بیٹھ۔۔۔جا۔۔۔‘‘

اس کے یوں کہنے پر وہ سر نیچا کیئے وہاں سے چلا گیا تو دیوان نے اہلکار کی طرف دیکھا تو دونوں مسکرا دیئے۔

☆☆☆
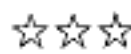
نادیہ کے کمرے میں زبیدہ، اماں بی اور تاجاں مائی بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ شعیب جا چکا ہے۔ وقتی طور پر راز افشا ہونے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اماں بی نے دیوان کے ذریعے سارا معاملہ سنبھال لیا تھا۔ لیکن نادیہ کے بارے میں زبیدہ تذبذب میں تھی کہ اب وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ یہی سوال لیے وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ تبھی دادی اماں نے کہا۔

’’زبیدہ۔ میرے خیال میں تم واپس لوٹ جاؤ۔ ایک طوفان جو حویلی میں اٹھنے والا تھا، وقتی طور پر ہی سہی، وہ تھم گیا ہے، اب جبکہ نادیہ بھی حویلی سے نہیں جانا چاہتی، تم یہ سب بھول جاؤ، سمجھو کہ تم نے خواب دیکھا تھا۔ تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔۔‘‘

’’لیکن اماں۔! آپ لوگ جانتے بوجھتے نادیہ کو ایسی زندگی میں دھکیل رہے ہو۔ جہاں اس کی اپنی مرضی نہیں ہو گی۔ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی ایک لاش کی مانند ان در و دیوار میں رہے گی۔ کیوں ظلم کرتے ہیں آپ۔۔؟‘‘ زبیدہ کے لہجے میں حد درجہ احتجاج تھا۔ تبھی دادی اماں چند لمحے خاموش رہیں، پھر انتہائی تحمل سے بولیں۔

’’زبیدہ۔ یہ تمہیں نے کہا تھا کہ جو نادیہ چاہیے گی، وہی ہو گا۔ اگر یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اگر اسے دلاور شاہ بھی روکے گا نا، تو میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں گی۔‘‘

زبیدہ نے سنا اور پھر نادیہ کی طرف دیکھا، جو سر جھکائے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور زبیدہ کی جانب دیکھا۔ پھر لرزتے

ہوئے لہجے میں بولی۔

''پھوپھو۔!میں نے اگر حویلی سے جانا ہی ہوتا نا۔۔۔تو آپ کے ساتھ آپ کے گھر سے آتی ہی نا۔۔۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔تم صرف میرا راز رکھنے کی خاطر خود کو بھینٹ چڑھا رہی ہو۔میں اپنے ضمیر پر یہ بوجھ قطعاً برداشت نہیں کر پاؤں گی۔۔میری وجہ سے ایک مجبور لڑکی۔۔۔''زبیدہ نے کہنا چاہا لیکن نادیہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔!میں مجبور نہیں اور نہ ہی کمزور ہوں۔۔حویلی کے باہر جا کر اتنا حوصلہ مجھے ہو گیا ہے کہ میں اپنے حق کے لیے لڑ سکوں۔اور یہ حوصلہ اور ہمت میں نے حویلی والوں کو دکھا بھی دیا ہے۔یہی بات اگر میں کہوں کہ میری وجہ سے آپ کا راز افشا ہو جاتا ہے تو میں اور میرا ضمیر یہ کیسے برداشت کر پائیں گے۔بولیں۔۔''

''مجھے فقط اپنے بیٹے کا ڈر ہے۔میں اسے بتادوں گی۔۔تو پھر۔۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔''زبیدہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

''آپ کے پاس کیا ضمانت ہے کہ وہ پھر بھی مجھ سے اپنائیت بھرا سلوک کرے گا۔وہ نفرت نہیں کرے گا مجھ سے۔میں زندہ درگور ہو جاؤں گی پھوپھو۔؟''اس نے سوالیہ انداز میں بڑے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بیٹا۔!میرا راز۔کیا ہے میرا راز۔۔میں اپنے بیٹے کے لیے تمہیں کھودوں۔۔مجھے امتحان میں مت ڈالو۔۔ہم اسے بتائیں گے ہی نہیں کہ تم کون ہو۔پھر مناسب وقت پر بتادیں گے۔۔''زبیدہ نے کہا۔

''جھوٹ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی عمارت کو سچ کو ذرا سی ہوا بھی گرا دیتی ہے۔کب تک ایسا کر پائیں گے۔۔آپ خدا کے لیے اپنی دنیا میں چلی جائیں۔۔اور مجھے میری قسمت کے حوالے کر دیں۔جو ہو گا اب دیکھا جائے گا۔۔''نادیہ نے اپنائیت سے کہا تو زبیدہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ نادیہ کو یوں تنہا چھوڑ کر واپس چلی جائے۔تب وہ چونک کر بولی۔

''نادیہ۔!بیٹی اگر میں شعیب کو سب کچھ بتادوں۔۔اور اس کا ردعمل وہ نہ ہو جو تم سوچ رہی ہو۔تو پھر تمہیں میرے پاس لوٹ کر آنا ہو گا۔۔میں تمہیں۔۔۔''

''نہیں پھوپھو۔!میں جانتی ہوں۔۔ظہیر شاہ میری زندگی میں آچکا ہو گا۔۔ایسے میں یہ سب ناممکن ہو جائے گا۔۔خدا کے لیے پھوپھو،یہ سب کچھ تج دیں۔بھول جائیں مجھے۔۔خدا کے لیے بھول جائیں۔۔''نادیہ نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا تو دادی اماں نے اپنے مخصوص تحمل سے کہا۔

''زبیدہ۔!میرا نہیں خیال کہ یہ اب تمہارے ساتھ جائے گی۔تم چپ چاپ واپس پلٹ جاؤ۔میں دلاور شاہ کو بھی نہیں بتاؤں گی کہ شعیب کون ہے۔اسی خاموشی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔۔''یہ کہتے ہوئے دادی اماں کے آنسو اس کی گالوں تک آ گئے تھے۔زبیدہ چند لمحے سر جھکائے سوچتی رہی،اس کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے تھے۔وہ کچھ دیر تو خود پر قابو پاتی رہی،پھر اپنی ماں کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔کافی دیر بعد اس کا من ہلکا ہوا،پھر وہ نادیہ کے گلے لگ کر خوب روئی۔۔آنسوؤں کا یہ سیلاب کچھ دیر بعد تھم گیا تو وہ اٹھی اور باہر کی جانب چل دی۔اماں بی،نادیہ اور تاجاں مائی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور حویلی سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

شعیب اپنے سرکاری گھر کے دالان میں یوں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا جیسے زندگی کی بہت بڑی بازی ہار چکا ہو۔ اگرچہ وہ جس مقصد کے لیے گیا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ اسے تاجاں مائی کی زندگی سے غرض تھی۔ وہ نہ صرف زندہ تھی، بلکہ اس کے سامنے آ کر اس نے بیان بھی دے دیا تھا۔ لیکن ۔! طاقت نے کس طرح کمزور کو اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر انتہائی دکھی ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ چوہدری ثناءاللہ کی بے بسی کو بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک آفیسر تھا تو کس قدر بے بس ہو گیا ہو گا۔ وہ واپس اپنے دفتر نہیں گیا تھا۔ بلکہ سیدھا سرکاری رہائش گاہ آ گیا۔ وہ کچھ دیر تنہائی میں خود کو حوصلہ دینا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ زندگی کس قدر سسک رہی ہے اور کتنی بے بس ہے۔ اس کا اہلکار فاتح مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا اسے سمجھاتا رہا تھا کہ پیر سائیں سے سمجھوتہ کر لینے میں ہی فائدہ ہے۔ وہ انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اس کے دوست کا فون آ گیا۔ جسے اس نے نمبر دے کر پوچھا تھا کہ معلوم کرو۔۔۔ اس نے کال ریسو کی اور پوچھا۔

''ہاں مل گیا کوئی اتہ پتہ۔۔۔''

''ہاں۔۔نوٹ کرو۔۔۔'' یہ کہتے ہی پتہ لکھوانے لگا۔۔ وہ جلدی سے نوٹ کرنے لگا۔ اس کے دوست نے پتہ لکھوایا اور فون بند کر دیا۔ جبکہ شعیب حیرت میں ڈوب گیا۔ اس کے سامنے جو پتہ تھا وہ یہیں سلامت نگر کا تھا اور جس شخص کے نام تھا، وہ تاجاں مائی کا بیٹا الیاس تھا۔۔ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

''یہ کیا۔۔؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنے دوست کو فون کیا۔ اسے نمبر بتا کر دوبارہ تصدیق کی۔ پتہ وہی تھا۔

شعیب کی سمجھ میں قطعاً کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نادیہ جس فون نمبر سے بات کرتی رہی ہے۔ وہ الیاس کا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے، کیا حویلی سے بھاگ جانے والی لڑکی، جس کی پاداش میں تاجاں مائی معتوب ہوئی تھی۔ کیا ان کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔۔ کہیں نادیہ، وہی لڑکی تو نہیں ہے جو حویلی سے بھاگی تھی۔۔؟ کہیں وہ نادیہ۔۔۔'' اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا تھا۔ یہ کیسا اتفاق ہے۔۔ جس نے اسے پوری جان سے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ کافی دیر تک وہ سوچ ہی نہ سکا کہ یہ معمہ کیا ہے؟ وہ بالکل ساکت و صامت یوں کرسی پر بت بن گیا جیسے اس میں کوئی جان ہی نہ ہو۔ وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ اسے یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب فون کی مسلسل بجتی ہوئی بیل نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ چونک گیا۔ وہ فون اس کی والدہ کا تھا۔ اس نے جلدی سے کال ریسو کر لی، اور تیزی سے پوچھا۔

''امی، آپ۔۔۔ کہیے کیا حال ہے۔۔''

''بیٹا تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے، تم ٹھیک تو ہو۔۔۔'' زبیدہ نے تشویش سے پوچھا تو اسے ہوش آیا۔ تب اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جھوٹ کہہ دیا۔

''بس یونہی اماں، میرے گلے میں خراش سی آ گئی تھی۔ آپ سنائیں کیسی ہیں، آپ۔۔۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔ اور یہیں سلامت نگر میں ہوں۔ میں۔۔'' امی کی آواز آئی۔

''آپ۔۔۔سلامت نگر میں۔۔کب کیسے۔۔'' وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''سوال ہی کرتے رہ جاؤ گے یا ہمیں بتاؤ گے بھی کہ تم تک کیسے پہنچیں۔'' امی نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

''کون ہے آپ کے ساتھ۔۔۔'' اس نے پوچھا۔

''بھائی حمید نے ڈرائیور بھجوایا ہے۔۔لو یہ اسے بتاؤ۔۔۔''

لمحے بعد ڈرائیور کی آواز آئی تو اس نے سمجھا دیا کہ کیسے آنا ہے۔ پھر فون رکھ کر وہ اٹھا اور گیٹ کے پاس جانے کے لیے اٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی رہائش گاہ پر گاڑی آن رکی۔ اس کی امی گاڑی سے نکلی تو وہ یوں اس سے ملا جیسے کئی برس سے بچھڑا ہوا ہو۔ زبیدہ نے وہیں گیٹ پر کھڑے ہو کر رہائش گاہ کی طرف دیکھا اور انتہائی محبت سے بولی۔

''یہ گھر ملا ہے تجھے بیٹا۔۔۔''

''جی اماں۔ آئیں نا آپ۔۔'' اس نے کہا اور زبیدہ کو لے کر اندر کی طرف چل دیا۔ اتنے میں ڈرائیور گاڑی پورچ میں لے گیا۔ اور گاڑی سے اتر آیا۔ وہ بھی شعیب کے ٹھاٹھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ باتیں کیں اور اپنے ملازم سے اس کے آرام کے لیے کہہ دیا۔ دونوں ماں بیٹا اندر چلے گئے۔

''امی۔! آپ یوں اچانک۔۔۔کوئی اطلاع دیئے بغیر۔۔'' سہولت سے بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''بس بیٹا۔ میرا دل کیا اور میں آ گئی۔۔'' زبیدہ نے مختصر سا جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ پھر چند لمحوں بعد اٹھتے ہوئے بولا ''آپ آرام کریں، میں آپ کے لیے۔۔۔''

''تو بیٹھ میرے پاس بیٹا، ہو جائے گا سب کچھ۔۔'' وہ بولی تو شعیب بیٹھ گیا۔ پھر یونہی ان کے درمیان باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر بعد شعیب نے محسوس کیا کہ وہ دباؤ جو حویلی سے آنے کے بعد اس پر چھا گیا تھا، وہ بالکل ہی نہیں تھا۔ وہ پرسکون تھا۔ یہی تو ماں ہے جس کے اثر میں آتے ہی انسان سارے دکھ درد اور غم بھول جاتا ہے۔ باتوں کے دوران پتہ ہی نہیں چلا کب دوپہر ڈھل گئی۔ تب اس کے ملازم نے کچھ لوگوں کے آنے کے بارے میں بتایا۔

''امی، آپ آرام کریں کچھ دیر، پھر باتیں کرتے ہیں۔ میں بھی ذرا ان سے مل لوں۔''

''ہاں۔! تم ایسے کرو، ڈرائیور کو بھجوا دو۔ میں کچھ دن تمہارے پاس رہوں گی۔''

''جی ٹھیک ہے آپ آرام کریں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور سیدھا ڈرائیور کے پاس گیا۔ اسے کافی ساری رقم دی اور اسے واپس بھجوا دیا۔ وہ خوش خوش واپسی کے لیے چل دیا۔ اور وہ لان میں بیٹھے ہوئے چوہدری ثناء اللہ کے پاس چلا گیا۔

''جی چوہدری صاحب۔! معاملہ تو پھر نہ بنا۔ وہ جو آپ چاہتے تھے۔۔'' اس نے خوش دلی سے کہا، حالانکہ وہ اندر سے افسردہ تھا۔

''یہی تو۔۔! یہی تو المیہ ہے ان لوگوں کا۔۔ یہی طاقت ہے ان کی۔۔ تشدد بھی کرتے ہیں اور پھر ان لوگوں کے چیخنے بھی نہیں دیتے۔ اب

ظاہر ہے تاجاں مائی کو انہوں نے کسی بھی طرح بلیک میل کیا ہوگا۔ تبھی تو وہ نہیں بولی، اپنے بیٹے تک کو جھوٹا بنا دیا۔ لازمی بات ہے کسی کمزوری کے باعث ہی ہوگا۔'' وہ بے تکان بولتا چلا گیا۔ ظاہر ہے وہ اپنا غصہ نکال رہا تھا۔

''چوہدری صاحب۔! مان لیں کہ اس نے یہ معاملہ بھی جیت لیا ہے، چاہے اس نے کچھ بھی کیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔ یہ تو ماننا پڑے گا۔'' وہ فوراً ہی اپنی ہار قبول کر گیا۔

''اصل بات یہ ہوتی ہے چوہدری صاحب۔! کسی کمزور بندے، یا غیر کی بنیاد پر لڑائی نہیں جیتی جا سکتی۔ پرائی لڑائی میں بندہ ہار ہی جاتا ہے۔ جب اپنی لڑائی ہو تب ہی جیت کے امکان ہوتے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں خیر۔! میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ آپ نے میرے کہنے پر اتنی دلچسپی لی، آئندہ کے لیے شاید آپ کو زحمت نہ دوں۔۔'' اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں یاسیت سے کہا۔

''آپ تو مایوس ہو گئے چوہدری صاحب۔! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ ظالم ہے تو پھر اس کے ظلم کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تب میں آپ کی بات پر عمل کروں گا۔ اگر اللہ نے چاہا تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اب مجھے اجازت دیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، آپ ایک چھوٹا سا کام کیجیے گا۔ وہ تاجاں مائی کا بیٹا ہے نا۔ اسے تو میرے پاس بھجوا دیں۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا۔

''کب۔۔؟'' چوہدری سے پوچھا۔

''ابھی بھجوا دیں۔۔ یا جب بھی۔۔'' اس نے پھر عام سے انداز ہی میں کہا۔

''جی ضرور۔۔ میں ابھی بھجوا دیتا ہوں۔ اجازت دیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ ملایا اور چل دیا۔ شعیب وہیں لان میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ نادیہ کے بارے میں جو اشارہ ملا ہے، وہیں سے ہی آگے معلوم ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ایک اور خیال اس کے ذہن میں ابھرنے لگا۔ یہ جو سب کچھ سلامت نگر ہی میں گھوم کر رہ گیا ہے۔ کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں ہے، یہ جو میرے ارد گرد سب لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ان کا تعلق نادیہ سے ملتا ہے یا یہ کہیں اور ہی راستہ نکلتا ہے جو مجھے کہیں اندھیرے ہی میں نہ لے کر پھینک دے۔ اس کا ذہن دلیلیں دیتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن دل تھا کہ ذہن کی کسی دلیل کو بھی قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہی سے الجھ گیا تو اس نے نادیہ کے خیال کو ایک لمحے کے لیے جھٹک دینا چاہا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ کچھ ایسا تھا کہ وہ نادیہ کے خیال کو خود سے الگ نہ کر سکا۔

''پھر میں کیا کروں۔۔۔ اسے تلاش کرنے کے لیے کس راہ پر چلوں۔۔'' وہ خود ہی بڑبڑانے لگا۔ یوں خود کلامی کرتے ہوئے وہ چونک گیا۔ کیا نادیہ اس کے اعصاب پر اس قدر حاوی ہو چکی ہے؟ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ تب اس نے محسوس کیا کہ شام کے سائے ڈھل رہے ہیں۔ اسے اب اٹھ کر اندر چلے جانا چاہیے۔ وہ اٹھا اور آہستہ قدموں سے اندر کی جانب چلا گیا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے اتر آئی تھی۔ نادیہ کھڑکی سے لگی باہر دیکھ رہی تھی۔ وہی دور دور تک پھیلی ہوئی اندھیرے کی سیاہ چادر، جس میں کہیں کہیں برقی قمقموں کی روشنی بے ڈھنگے ستاروں کی طرح لگ رہی تھی۔ بے ترتیب اور الجھے ہوئے، ہانپتے ہوئے روشنی دیتے، جیسے وہ بھی کسی کی غلامی میں روشنی دینے پر مجبور ہوں، یہ سیاہ رات جن پر مسلط ہو چکی ہو۔ جیسے روشنی دینے کے لیے خود کو جلانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ بھی جل رہے تھے اور یہاں اس کھڑکی میں موجود وہ بھی جل رہی تھی۔ مگر وہ خود کو بدقسمت تصور کر رہی تھی۔ جس کے مقدر میں جلنا تو ہے لیکن اس کی روشنی نہیں، شاید اس میں جلنے کی بھی صلاحیت نہیں، وہ محض سلگ سکتی ہے۔ اور سلگنا ہی شاید اس کا مقدر ٹھہرا ہے۔

کچھ عرصہ بیشتر بھی وہ یوں کھڑکی میں کھڑی اپنی ہی ذات کے حساب کتاب میں الجھی ہوئی تھی۔ تب اس کی سوچوں میں بغاوت بھری ہوئی تھی۔ وہ حویلی سے باہر کی دنیا نہیں دیکھنا چاہتی تھی بلکہ وہ آزادی چاہتی تھی، ان روایات سے نفرت تھی جو اس پر لاگو کی ہوئیں تھیں۔ مذہب کے نام پر اپنی پسند و ناپسند کو مسلط کیا گیا ہوا تھا۔ وہ باہر کی دنیا کا تجربہ نہیں کر پایا کرتی تھی۔ کیونکہ اس نے باہر کی دنیا دیکھی ہی نہیں تھی۔ اسے تو وہ گھٹن ستایا کرتی تھی جو اس حویلی کے در و دیوار میں کسی آسیب کی مانند چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی سوچوں کا محور کچھ اور ہی تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ باہر کی دنیا میں جاتے ہی اسے راحت کی بجائے زخم مل جائیں گے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بغاوت کر کے بھی، کچھ نہیں کر پائی تھی۔ زبیدہ پھوپھو سے ملاقات ہوتے ہی وہ سمجھ گئی کہ روایات کے تسلط میں وہ یونہی حصار میں نہیں تھی۔ یہ حصار در اصل حویلی والوں کا خوف تھا۔ اور اس خوف نے زندگیوں کو ششدر کر رکھا ہوا تھا۔ لاہور سے سلامت نگر آنے سے پہلے پھوپھو زبیدہ نے اسے پوری طرح بتا دیا تھا کہ وہ کن حالات میں حویلی سے نکلی اور کاشف کے ساتھ اپنی زندگی گذارتی رہی ہے۔ حویلی سے ایک بار ناطہ توڑ لیا سو پھر اس جانب منہ نہیں کیا۔ اب اگر وہ چاہتی ہے تو دوبارہ حویلی نہیں جائے۔ لیکن وہ خود کچھ اور ہی سوچ چکی تھی۔ نجانے کیوں وہ قدرت کے اشاروں کو سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتی اور اپنے سارے ہی فیصلے اسی کے مطابق کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کے اندر سے یہ پختہ یقین اٹھ رہا تھا کہ یہ اشارے ہیں، جو اسے مستقبل کی راہ دکھا رہے ہیں، ورنہ ایک تسلسل کے ساتھ اتفاقات کا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہیں۔ وہ ایک ایک اشارے کو پھر سے اپنے ذہن میں دہرانے لگی۔

وہ بڑی آسانی کے ساتھ حویلی سے نکل کر ٹرین میں جا بیٹھی اور بغیر کسی پریشانی کے لاہور پہنچ گئی۔ وہ جس اختر رومانوی کے لیے گئی تھی، وہ اس کا کزن نکلا اور ماں، اس کی اپنی پھوپھو۔ لیکن جس کے لیے وہ گئی، وہی نہیں ملا، بلکہ حویلی کے لوگ اس تک آن پہنچے۔ جو اپنی تمام تر طاقت کے باوجود پسپا ہو گئے۔ وہ اسے واپس نہ لے جا سکے۔ وہیں اسے اپنی پھوپھو کے بارے میں معلوم ہوا۔ جو اس سے پہلے ہی بغاوت کر چکی تھی۔ اس نے ان اشاروں پر وہیں شعیب کے گھر میں بیٹھ کر بہت سوچا تھا۔ تب بہت سارے ''کیوں'' اس کے سامنے آن کر تن گئے۔ مثلاً وہ اختر رومانوی ہی کو کیوں پسند کرنے لگی تھی۔ اس کی شاعری سے لے کر لہجے تک کو ہی کیوں پسند کیا؟ وہ پھوپھو کے گھر ہی کیوں پہنچ گئی؟ شعیب اس کا کزن کیوں نکلا۔ اس کے ساتھ سفر میں کوئی انجانا حادثہ کیوں نہیں ہوا؟ دلاور شاہ اس تک کیوں پہنچ گیا؟ پھوپھو کا راز اس کے سامنے کیوں آ گیا؟ یوں ایک سلسلہ تھا کہ دراز ہوتے چلا گیا۔ تبھی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ واپس حویلی میں جائے گی اور اس حادثے کو کریدے گی، جسے سب نے ''قدرت کو یہی منظور تھا'' کہہ کر ماضی کے سرد خانے میں ڈال دیا تھا۔ وہ حادثہ اس کے والدین کا تھا۔ حویلی سے نکلنے سے پہلے وہ بھی سبھی کی طرح یہی سمجھتی تھی لیکن پھوپھو

کی بغاوت بارے سن کر اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے والدین کو بہر حال حادثہ پیش نہیں آیا تھا، کیا ہوا تھا؟ یہی اس نے جاننا تھا۔ اگر چہ وہ چاہتی تھی کہ پھوپھو کا راز، راز ہی رہ جائے، وہ افشا نہ ہو۔ اور اس معاملے میں اس کے اندر پوری طرح قربانی دینے کا جذبہ بھی موجود تھا۔ لیکن ان سارے واقعات وحالات میں اسے جو اپنے والدین کے بارے میں شک ہوگیا تھا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اس سے وقت کی پڑی دھول کو صاف کر دے۔ یہ کیسے ہوگا۔ ابھی اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر اس کے اندر جو اعتماد آگیا تھا، اس سے نادیہ کو پورا یقین تھا کہ وہ ایسا کر گذرے گی۔

وہ اختر رومانوی کی ذات میں پوری طرح ڈوب گئی تھی۔ اس کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ اختر رومانوی کے لبادے میں شعیب موجود ہے اور وہ اس کا اپنا ہی خون ہے۔ اگر زبیدہ پھوپھو کا راز رہتا ہے تو وہ بھی راز ہی رہے گی۔ شعیب اسے کبھی نہیں پا سکے گا۔ اور وہ خود اختر رومانوی سے رابطہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ اسے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ شعیب حویلی میں آیا ہے۔ مگر دل کے کونے میں کہیں بھی خواہش نہیں اٹھی کہ دیکھوں تو سہی وہ حقیقت میں کیسا ہے؟ ایک لمحہ کی دوری اور چند قدم کے فاصلہ پر تھا وہ۔ اسے محض کھڑکی تک جانا تھا اور اسے دیکھ لینا تھا۔ لیکن اس نے شعیب کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔ وہ آیا اور چلا گیا۔ اس نے ایک نگاہ بھی نہ ڈالی۔ یہ غصہ تھا، بے بسی تھی یا پھر وہ بے نیاز ہوگئی تھی۔ یہی سب سوچتے ہوئے اسے ایک لمحے کو خیال آیا کہ کیا اس کی محبت اتنی سی ہی تھی کہ چند دن وہ محبت کی پنہائیوں میں رہی اور پھر سدا کے لیے اس سے یہ جذبے اور احساس چھین لیے گئے۔ یہاں سے پھر ''کیوں'' اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ جیسے وہ مہارانی ہو اور اس کے دربار میں یہ سوال کسی سوالی کی طرح اس کی نظر کرم کے منتظر ہوں۔ اب اس کے پاس تھا بھی کیا، یہی سوال تھے اور انہی سوالوں کی بنیاد پر ابھرتے ڈوبتے سوچوں کے پندار، اس کے علاوہ اب اس کے پاس تھا بھی کیا۔ وہ خود اپنے اندر سے جاگ اٹھی تھی۔ اسے خود اپنے فیصلے کرنا تھا۔ جن کے سہارے اس نے اپنی زندگی کے باقی ایام گذارنے تھے۔ اس کا سیل فون نجانے کہاں تھا اور کتابیں میگزین ڈبوں میں بند کر کے کسی کونے کھدرے میں ڈال دیئے تھے۔ وہ ان کے بارے میں اب سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔ اس کا تمام تر محور اب اس کی اپنی ذات تھی، جہاں سے اب سوچوں کے نئے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

رات لمحہ بہ لمحہ گذرتی چلی جا رہی تھی۔ اور سوچوں کا ایک طوفان تھا جو امنڈتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اب اپنے اعتماد کے بل بوتے پر ان حالات کا مقابلہ کرے، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک مجبور، بے بس اور تنہا لڑکی ہے۔ وہ ان حالات کا کیسے مقابلہ کر پائے گی۔ پھوپھو کا ایک سہارا بنا تھا، وہ بھی ختم ہوگیا۔ وہ اس کی اگر بات مان کر اس کے ساتھ چلی جاتی تو شاید اسے اپنی تنہائی کا اتنا احساس نہ ہوتا۔ اسے شعیب کی محبت چاہے نہ ملتی لیکن اس کا سہارا تو مل جاتا۔ اور اگر نفرت مل جاتی؟ اس خیال کے ساتھ ہی جب یہ سوچ ابھرتی تو وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ زندگی اچانک ہی بے رنگ دکھائی دینے لگی۔ اسے یوں لگتا جیسے زندگی کے صحرا میں وہ یک تنہا کھڑی ہے، آسمان سے کڑی دھوپ اس پر ہے اور وہ آبلہ پائی میں کھڑی اسی حیرت میں ہے کہ کوئی تو راستہ ہو؟ لیکن راستہ تو کیا ملنا تھا۔ اسے کوئی سراب بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ مایوسی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ باہر موجود اندھیرے کی طرح اس کا مقدر بھی سیاہی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اس کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ کھڑکی پر دھرے ہاتھ کی پشت پر جب گرم گرم نمی محسوس ہوئی تو وہ اپنے آپ میں آگئی۔ اس نے بے بسی کی سی کیفیت میں اپنے آنسو صاف کیئے اور باتھ روم میں چلی گئی۔ وہ منہ پر کافی دیر تک پانی کے چھپاکے

مارتی رہی۔ ذرا سکون محسوس ہوا تو اس نے وضو کرنا شروع کر دیا۔ وہ باتھ روم سے وضو کر کے نکلی تو ایک گونہ سکون اس کے دل میں اتر آیا تھا۔ وہ جائے نماز بچھا کر رب تعالیٰ کے حضور کھڑی ہوگئی اور پھر انتہائی جذب کے عالم میں نماز پڑھنے لگی۔ نجانے اتنا سرور نماز میں کہاں سے آگیا تھا۔ بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے جب انسان اپنے خالق حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے، اس کی مدد کا طلب گار ہوتا ہے تو اسے اپنے رب کی طرف سے یقین مل جاتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ منفی سوچیں نہ جانے کہاں تحلیل ہو جاتی ہیں اور اس کی جگہ ایمان و یقین آجاتا ہے۔ جس سے دل کو تسلی ملتی ہے کہ بندے اور رب کا تعلق جب بن جاتا ہے تو پھر اس میں دوئی نہیں آتی، تعلق گہرا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

حویلی کی اوپری منزل کے اس کمرے میں دھیمی روشنی تھی۔ نادیہ پورے خشوع وخضوع کے ساتھ رب تعالیٰ کے حضور جھکی ہوئی تھی۔ اس کی دعاؤں میں نجانے کیسی رقت آگئی تھی کہ بہتے آنسوؤں کا اسے خیال ہی نہیں تھا، بلکہ ایک گونہ سرور اس کے دل میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ اسے لگا جیسے تپتے ہوئے صحرا میں چمکتے ہوئے سورج کے آگے بادل آگئے ہیں اور موسم خوشگوار ہونے کا امکان پیدا ہوگیا ہے۔ اسے یقین ہوگیا کہ اب سراب نہیں، حقیقی نخلستان اسے نہ صرف ملیں گے، بلکہ وہ انہی راستوں پہ چلتی ہوئی اپنی منزل تک ضرور پہنچے گی۔ ایک ایک چہرہ اس کی نگاہ میں تھا۔ وہ انہیں دیکھتی جاتی تھی اور غور کرتی چلی جا رہی تھی۔ زندگی اسے بامقصد دکھائی دینے لگی تھی۔

☆☆☆

شعیب اگرچہ اپنے آفس میں مصروف تھا لیکن وہ ذہنی طور پر الجھا ہوا تھا۔ حویلی سے آنے کے بعد اسے نجانے اپنی ہزیمت کا احساس کیوں ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ پیر سائیں نے اسے اسی کے سامنے ہرا دیا ہے۔ وہ جو بہت کچھ کرنے کے بلند و بانگ دعوے لیے ہوئے تھا۔ کچھ بھی نہیں کر سکا۔ وہ یوں خالی ہاتھ واپس لوٹا تھا کہ جیسے اس کا ہاتھ جھٹک دیا گیا ہو۔ وہ لاشعوری طور پر محمد الیاس کا انتظار کر رہا تھا جو ہنوز اس تک نہیں پہنچا تھا۔ جبکہ نادیہ تک پہنچنے کی ایک راہ اسی کی ذات سے ہو کر جا رہی تھی۔ وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اچانک سب کچھ ہی اس سے چھین لیا گیا ہو۔ وہ جتنا اپنا دھیان اپنے کام کی طرف لگاتا، اتنا ہی الجھ جاتا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھے اور کسی ویرانے میں چلا جائے۔ وہاں بس وہ ہو، اس کی تنہائی ہو اور نادیہ کی یادیں ہوں۔ اسی کشمکش میں دوپہر گزر گئی۔ دفتر کا وقت ختم ہوا تو وہ سرکاری گاڑی میں واپس رہائش گاہ آگیا۔ اس کا دل تھا کہ ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ شاید اس کے اندر کا عکس اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس لیے جیسے ہی وہ گھر آیا۔ زبیدہ نے ایک ہی نگاہ میں دیکھ لیا کہ شعیب نارمل نہیں۔ ضرور کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔

''کھانا لگواؤ بیٹا۔؟'' زبیدہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی۔!'' اس نے ہنکارہ بھرا اور ایزی ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ وہ اس کے بغیر کھاتی ہی نہیں تھی۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کھانے کی میز پر آگیا۔ یوں ماں کا ساتھ دینے کی غرض سے وہ کھاتا رہا۔ دونوں نے ہی بہت کم کھایا اور پھر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ملازم جب برتن سمیٹ کر چلا گیا اور اس نے چائے لا کر ان دونوں کے سامنے رکھ دی تو اس وقت زبیدہ اپنے طور پر فیصلہ کر چکی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا۔!تم مجھے خاصے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

''امی۔!میں پریشان تو ہوں۔۔اس میں کوئی شک نہیں ہے۔میں چاہوں بھی تو اپنا آپ چھپا نہیں پاؤں گا۔لیکن جو میری پریشانی ہے،اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ایسا کچھ ہے کہ کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔''اس نے الجھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا تو وہ بولیں۔

''تیرا تعلق تو مجھ سے ہے نا۔۔بتاؤ۔ممکن ہے تمہارے مسئلے کا کوئی حل میرے پاس ہو۔۔۔''

''امی۔!بس ایسے ہی۔۔بس چھوڑیں آپ۔۔''اس نے نظرانداز کرنے والے لہجے میں کہا۔

''بیٹا۔!آج سارا دن میں ایک بات سوچتی رہی ہوں۔۔بعض اوقات ہم جو باتیں کہہ نہیں پاتے،بعد میں وہ بڑا نقصان دیتی ہیں۔کوئی بھی راز رکھنے کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر اسے افشا کر دینا چاہئے۔ورنہ بہت زیادہ نقصان ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔''زبیدہ نے نجانے کس جذبے کے تحت کھوئے ہوئے انداز میں کہا،تو شعیب چونک گیا۔

''امی۔!آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔؟''

''دیکھو بیٹا۔!میں نے تم سے ایک بہت بڑا راز چھپائے رکھا۔وہ راز ایسا تھا کہ اگر میں وہ تمہیں وقت سے پہلے بتاتی تو شاید تمہاری یہ شخصیت نہ بن پاتی۔اور پھر اس میں میری اپنی غرض بھی شامل تھی۔میں خود غرض ہو گئی تھی۔لیکن اب وقت آ گیا ہے۔۔وہ سب میں تمہیں بتا دوں۔۔اب اس کے بعد تم جو چاہو سمجھو،میری ذمے داری تو پوری ہو چکی ہے۔''زبیدہ نے یوں اعتماد سے کہا جیسے اب اسے اپنا آپ چھپانے سے کوئی خوف نہ ہو۔

''آپ ساری دنیا میں ایک ایسی ہستی ہیں کہ جسے میں اہمیت دیتا ہوں۔۔میں آپ سے ہوں۔۔چاہوں بھی تو آپ سے خود کو الگ نہیں کر سکتا۔۔میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں،میں زمانے کی مار کھا چکا ہوں۔سمجھتا ہوں کہ حقیقت کبھی کبھی کتنی تلخ ہوتی ہے اور میں کسی بھی تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا ہوں امی۔۔آپ بتائیں۔۔''

''ہاں۔!شاید یہ حقیقت اتنی ہی تلخ ہو کہ تمہیں اپنی ماں کا وجود بھی اچھا نہ لگے۔۔''زبیدہ نے روہانسو ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔۔۔آپ کہہ دیں جو آپ کے دل میں ہے۔۔''

''تو سنو بیٹا۔!یہ میری زندگی کی کہانی ہے۔۔''زبیدہ نے کہا اور جس قدر ممکن ہو سکا آہستہ آہستہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔شعیب ہمہ تن گوش پورے تحمل سے سب کچھ سنتا چلا گیا۔یہاں تک کہ سہ پہر کا وقت ہو گیا''حقیقت یہ ہے شعیب کہ میں یہاں تمہارے لیے نہیں نادیہ کے لیے آئی تھی۔اور شاید نادیہ تم سے بہت دور چلی جائے گی۔اس نے صرف میری خاطر،میرے راز کی خاطر۔۔تم سے اپنا آپ چھپا لیا۔۔''

شعیب یہ سب سن کر پہلے تو کافی دیر تک خاموش رہا۔شاید وہ اس حقیقت کی تلخی کو نگل رہا تھا یا پھر زندگی کے اس نئے منظر میں خود کو دیکھ رہا تھا۔پھر جب بولا تو اس کے لہجے میں اعتماد چھلک رہا تھا۔

''امی۔!مجھے اس سے غرض نہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا یا صحیح،بس وہ درست تھا،جو بھی تھا۔۔آپ نے میرے لیے اتنے دکھ

ہے۔۔تنہائی کی زندگی سے لڑتی رہیں۔۔ایمان سے امی۔۔آپ میرے لیے زیادہ مقدس ہوگئی ہیں۔آپ فکر نہ کریں۔۔حویلی والوں کے خلاف ڈٹ جائیں۔۔میں آپ کے ساتھ ہوں۔۔اس لیے نہیں کہ مجھے نادیہ چاہئے۔۔بلکہ اس لیے کہ انہوں نے آپ کو وہ مان نہیں دیا، جو آپ کا ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ دلاور شاہ نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا۔ وہ جو کوئی بھی ہے۔۔اسے میری ماں کے سامنے جھک کر معافی مانگنا ہوگی۔'' شعیب نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ مجھ سے معافی مانگے یا نہ مانگے۔۔مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔۔بلکہ نادیہ تمہاری ہونی چاہے۔۔مجھے اس سے نہیں اس لڑکی کو زندہ درگور ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتی۔۔'' زبیدہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کے آنسو نکل گئے۔

''ایسا ہی ہوگا۔۔تیاری کریں۔۔ہم ابھی حویلی جائیں گے۔۔'' شعیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ زبیدہ ایک لمحے کو خوف زدہ ہوگئی۔ جبکہ شعیب کے ذہن سے ساری الجھنیں ختم ہوئیں تو ہر منظر واضح ہو گیا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی نکالی تو زبیدہ اس کے ساتھ والی پسنجر سیٹ پر آن بیٹھی۔ جس وقت وہ رہائش گاہ سے چلے عصر اور مغرب کا درمیانی وقت ہو رہا تھا۔

حویلی پہنچتے انہیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ وہاں پہنچ گئے جہاں انہیں صدر دروازے پر ہی روک لیا گیا۔

''کس سے ملنا ہے صاحب۔۔؟'' وہاں موجود ایک شخص نے اس کے ساتھ بیٹھی خاتون کو دیکھ کر تذبذب سے کہا، جو کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے گئی تھی۔ اس نے شعیب کو بھی دیکھا تھا اور یہی گاڑی پہلے بھی یہاں آئی تھی۔ شعیب نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ سیل فون نکال کر دلاور شاہ کے نمبر پش کر دیے۔ دوسری ہی بیل پر فون ریسو کر لیا گیا۔

''نمبر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں کون بات کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''کہیے آفیسر۔! اب کیا بات ہے۔'' دوسری طرف سے اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کا بھانجا بات کر رہا ہوں اور حویلی کے دروازے پر ہوں۔۔کہیے اندر آنے کی اجازت دیں گے یا اپنی ماں کو حویلی کے اندر بھیج دوں۔۔''

''کیا مطلب کیا کہنا چاہتے ہو تم۔۔؟'' دلاور شاہ نے انتہائی الجھے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

''ظاہر ہے ہم یہاں کھڑے رہیں گے، جب تک آپ ہمیں اندر آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔۔'' وہ پھر غصے میں چھلکتے ہوئے لہجے پر قابو پا کر بولا۔

''کس نیت سے آئے ہو؟'' پیر سائیں نے پوچھا

''اس کا جواب میں آمنے سامنے بیٹھ کر دوں گا۔ اور اس شرط پر کہ آئندہ مجھے حویلی کے دروازے پر کوئی نہیں روکے گا۔'' شعیب کا غصہ بے قابو ہونے لگا تھا۔ تبھی چند لمحے دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر نجانے کیا سوچ کر پیر سائیں بولا۔

''ٹھہرو۔! میں ملازم بھیجتا ہوں۔۔ورنہ یہ تجھے اندر نہیں آنے دیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ چند منٹ وہ ویسے ہی کھڑے

رہے، تبھی اندر سے ایک ملازمہ نے آ کر سکیورٹی والوں سے کہا اور انہیں اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔ شعیب نے گاڑی پورچ میں لے جا کر روک دی اور پھر اتر کر اندر چل پڑے۔ ڈرائینگ روم میں سامنے ہی پیر سائیں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے اطمینان کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے زبیدہ پر ایک نگاہ ڈالی اور دونوں کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو پیر سائیں ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''تو پھر تمہاری ماں نے ساری روداد تمہیں سنا دی۔۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں رشتے میں تمہارا ماموں لگتا ہوں۔ ہو گئی رشتے داری۔۔ اب بتاؤ یہاں کیا کرنے آئے ہو۔۔؟''

''دلاور۔! اس لہجے میں بات کرو گے تو پہلے مجھ سے بات کرو۔۔ بتاؤں میں تمہیں یہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ یہ نادیہ کو لینے کے لیے آیا ہے جسے تم ان در و دیوار میں زندہ درگور کرنے جا رہے ہو۔''

''آپا۔! زبان بند رکھو۔'' پیر سائیں نے کہنا چاہا مگر زبیدہ نے ہتھے سے اکھڑتے ہوئے کہا۔

''خبردار اگر مجھے ٹوکا دلاور۔! تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ پوچھ رہے ہو یہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ یہ بھی اس حویلی کا اتنا ہی مالک ہے جتنے تم ہو۔۔ یہ جب چاہے یہاں آ سکتا ہے۔۔ تم اسے روکنا بھی چاہو تو نہیں روک سکتے دلاور۔'' زبیدہ ایک دم سے پھٹ پڑی تھی۔ شاید دلاور کو امید نہیں تھی کہ وہ اتنا اونچا بولے گی۔

''اچھا تو تم اپنا یہ حق جتانے آئی ہو۔ مگر تم اپنا یہ حق بہت پہلے بڑے پیر سائیں کے دور میں کھو چکی ہو اور۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو شعیب بولا۔ اس کے لہجے میں تحمل کے ساتھ ساتھ برداشت کا بھی عنصر تھا۔

''پیر سائیں۔! آپ اس طرح میری ماں کو بلیک میل نہیں کر سکتے۔۔ اگر آپ کو اپنے مریدین کا زعم ہے تو یہ آپ کا خوف بھی ہے۔۔ یہ نہ ہو کہ آج آپ اجازت دینے والے ہیں تو کل ہم آپ کو اجازت دینے والے بن جائیں۔ اس سے پہلے کہ میں ادب کا دامن چھوڑ دوں۔۔ آپ اپنا لہجہ ٹھیک کر لیں۔''

''کیا کرو گے تم۔؟'' پیر سائیں نے سرسراتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو کچھ نہیں کرنا۔۔ جو کرنا ہے وہ آپ ہی نے کرنا ہے۔'' وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا تو پیر سائیں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر آہستگی سے بولا۔

''بتاؤ۔ تم ماں بیٹا کیسے آئے ہو؟''

''میں نادیہ کو لینے کے لیے آئی، جسے تم نے دھوکے سے یہاں قید کر لیا ہے۔'' زبیدہ نے غصے میں کہا۔

''میں نے تو اسے قید نہیں کیا۔ وہ اپنی مرضی سے یہاں موجود ہے۔ اور زبیدہ آپا۔۔ کیا اس نے آپ کو بتایا نہیں۔'' وہ کافی حد تک طنزیہ انداز میں بولا۔ اس سے پہلے کہ زبیدہ کوئی جواب دیتی اماں بی دروازے میں آ کھڑی ہوئیں۔ اسے دیکھتے ہی زبیدہ اٹھ گئی اور پھر ان کی طرف دیکھتے ہی رونے لگ گئیں۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑی تکتی رہی۔ پھر بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آجاؤ۔۔!آؤ۔" پھر شعیب کی طرف دیکھ کر بولی۔"میں تمہاری نانی ہوں پتر۔!آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔" وہ اٹھا اور اپنی نانی کے گلے لگ گیا۔دلاور شاہ انہیں دیکھتا رہا۔پھر انہیں اماں بی کے ساتھ جاتا دیکھ کر اٹھ گیا۔اس کے چہرے پر سے غضب چھلک رہا تھا۔

اماں بی انہیں اپنے کمرے کے سامنے بڑے گول کمرے میں لے گئیں جو ڈرائینگ روم کے طور پر سجا ہوا تھا اور خاندان کے لیے مخصوص تھا۔بہت عرصے بعد اس کمرے کو استعمال کرنے کی نوبت آئی تھی۔اطمینان سے بیٹھنے کے بعد زبیدہ نے اپنی ماں سے کہا۔

"دلاور شاہ اس قدر غیریت برتے گا میرے ساتھ۔۔میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔۔اب مجھے اس حویلی میں آنے کے لیے اجازت لینا پڑے گی۔اگر میں اپنی ضد پر اتر آئی تو اس کی ساری شان وشوکت چھین لوں گی۔"

"تم تو چلی گئی تھی۔۔واپس کیوں آئی۔۔"

"میں نادیہ کو لینے آئی ہوں۔۔صرف میرا راز نہ کھولنے کی غرض سے اس نے یہاں حویلی میں گھٹ کر مرنا قبول کرلیا ہے۔اب تو وہ شرط بھی نہیں رہی۔" زبیدہ نے تیزی سے کہا۔

"مطلب۔؟" اماں چونکی۔

"مطلب یہ کہ میں نے اپنے بیٹے کو سب بتا دیا۔کچھ نہیں چھپایا۔" اس نے کہا تو دلاور شاہ اور اس کی بیوی اسی لمحے کمرے میں داخل ہوئے اور بڑے اطمینان سے آکر سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"زبیدہ آپا۔!میں تم سے زیادہ بحث نہیں کروں گا۔دوٹوک بتاتا ہوں کہ تم نادیہ کو یہاں سے نہیں لے جاسکتی ہو۔ہاں،اس حویلی میں حصے داری کا دعویٰ میں مان لیتا ہوں۔اپنے حصے کی جو قیمت لگاؤ۔میں ابھی دینے کو تیار ہوں۔۔ورنہ اگر تم لوگوں کے ذہن میں یہ ہے کہ عدالت میں لو گے۔۔تو وہ تم لوگوں کی بھول ہے۔۔"

"مجھے نہ حویلی سے کوئی غرض ہے اور نہ میں نے کبھی ایسا سوچا۔۔میں نے فقط تیرے رویے کے جواب میں تجھے احساس دلایا ہے۔تم نادیہ کو مجھے دو۔۔میں دوبارہ یہاں قدم بھی نہیں رکھوں گی۔چاہے یہ کاغذ پر لکھوالو۔۔" زبیدہ نے واضح کہا۔

"نادیہ کی منگنی میرے بیٹے ظہیر شاہ سے ہوچکی ہے۔اور ابھی تھوڑی دیر بعد اس کا نکاح ہے۔ظہیر کے ساتھ۔۔اس لیے تمہیں یہاں سے مایوس لوٹنا پڑے گا۔۔" پیر سائیں سکون سے بولا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے دلاور شاہ۔!میں نادیہ کے جذبات جانتی ہوں۔تم اس پر ظلم نہیں کر سکتے۔۔" زبیدہ بولی۔

"زبیدہ آپا۔!اگر نادیہ ہی یہاں سے نہ جانا چاہے تو۔۔۔؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا۔۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔۔"ضرور تم نے اسے خوف زدہ کر دیا ہوگا۔۔"

"قطعاً خوف زدہ نہیں کیا۔چاہو تو اس سے پوچھ لو۔۔آپ کا کہنا بھی یہی تھا نا کہ جو نادیہ چاہے گی،ویسا ہی ہوگا۔اب نادیہ کی سن لو۔۔وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔۔" اس نے کہا تو اماں بی بولی۔

''بیٹا شعیب۔! کیا یہ درست ہے کہ ہم نادیہ کے کہنے پر اپنا فیصلہ دے دیں۔؟''

''ضرور اس میں کوئی چال ہے۔۔ورنہ اتنی آسانی سے۔۔۔'' زبیدہ نے کہنا چاہا کہ باہر سے نادیہ کی آواز آئی۔

''نہیں پھوپھو۔! اس میں کسی کی کوئی چال نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ دے دیا تھا کہ میں حویلی میں رہوں گی۔ وہ فیصلہ میں نے جس بنیاد پر بھی کیا، ہو گیا۔ کسی کا مجھ پر کوئی جبر نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔'' شعیب نے اس آواز کو سنا تو اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہی آواز، وہی لہجہ۔۔وہی انداز۔۔ہاں بس اس آواز میں حزن ملا ہوا تھا۔ جو نادیہ کی آواز کو انفرادیت بخشتا تھا۔

''تم سامنے آ کر کہو۔ ضرور۔۔۔''

''نہیں پھوپھو۔! میں سامنے نہیں آؤں گی۔ شعیب کا شکریہ کہ اس نے مجھے مان دیا۔ میرے لیے یہاں تک چل کر آیا۔ وہ مجھے اپنانا چاہتا ہے۔ اس عزت افزائی کا بھی شکریہ۔ یقیناً میں نے پھوپھو کے راز کو افشاء نہ ہونے کے ڈر ہی سے یہاں حویلی میں رہنے کا فیصلہ دیا تھا، لیکن اب میرا یہی فیصلہ ہے۔'' نادیہ نے پورے اعتماد سے کہا تھا۔

''کیا تمہارے اس فیصلے میں دلاور شاہ۔۔۔''

''ہاں۔! میں نے ان کے ساتھ، اماں بی کے ساتھ اور زہرہ بی کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا ہے، مجھے اپنی اور اس حویلی کی عزت اور روایات کی پاسداری کرنا ہے۔۔'' نادیہ نے واضح طور پر کہہ دیا۔

''تم وہ نادیہ بات نہیں کر رہی ہو جو میرے پاس گئی تھی۔ انہوں نے تمہارے دماغ کو نجانے کیا کر دیا ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔۔'' زبیدہ نے روتے ہوئے کہا۔

''نہیں پھوپھو۔! میں نے پیر سائیں کی یہ بات مان لی ہے اور مجھے یقین ہے کہ پیر سائیں بھی میری بات مانیں گے۔۔کیوں پیر سائیں؟'' نادیہ نے کہا تو سبھی اس دروازے کی طرف دیکھنے لگے جہاں سے اس کی آواز آ رہی تھی۔ شاید دلاور شاہ سے اس کی کوئی بات طے ہو چکی تھی۔ اس لیے دلاور شاہ نے کہا۔

''ہاں۔! میں مانوں گا۔۔بولو۔؟''

''شعیب۔ معذرت خواہ ہوں کہ مجھے بڑوں کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے تھی، لیکن یہ ضروری ہے، کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔۔۔؟''

''اس کے یوں سوال کرنے پر ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ شعیب کو یوں لگا جیسے انجانی آواز اس کے پورے بدن سے آ کر لپٹ گئی ہو۔ اور اس کا دامن تھام کر اس سے سوال کر رہی ہو۔ سو اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں نادیہ۔! مجھے اگر تم سے محبت نہ ہوتی تو میں اس حویلی کی جانب ایک قدم بھی نہ بڑھاتا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔''

''تو پھر اسی محبت کا واسطہ، آپ میری لاج رکھیں گے۔۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ میری کزن دلاور شاہ کی بیٹی فرح سے شادی کر لیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔!'' دلاور شاہ ایک دم سے چیخا۔ سبھی چونک گئے جیسے اس نے کوئی انہونی کہہ دی ہو۔

''آپ نے میری بات ماننا تھی پیر سائیں۔ جیسے میں نے آپ کی بات مانی۔ اگر آپ کو میری بات منظور نہیں تو پھر میں بھی آپ کی پابند نہیں۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بولیں جواب دیں۔''

''نادیہ۔! یہ تم بہت غلط کر رہی ہو۔ میں تمہاری اس۔۔۔''

''یہ غلط ہے یا سہی۔۔ سوچ لیں۔ مغرب تک کا وقت ہے آپ کے پاس۔ مغرب کے بعد جہاں میرا نکاح ہوگا، وہاں فرح کا بھی ہو گا۔ میں جا رہی ہوں اپنے کمرے میں۔۔ نانی اماں، شعیب میرا مہمان ہے، خاطر مدارت کی جائے۔''

اس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ زبیدہ کا چہرہ ایک دم سے کھل گیا۔ جبکہ دلاور شاہ کا چہرہ غصے میں سرخ ہو چکا تھا۔ وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ہی زہرہ بی بھی چلی گئیں۔ کمرے میں وہ تینوں رہ گئے۔

☆☆☆

پیر سائیں اپنے کمرہ خاص میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور دیوان ہاتھ باندھے سامنے کھڑا تھا۔ دونوں کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ انہیں نادیہ کی شرط نے حیران و پریشان ہی نہیں گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔ پیر سائیں بہت غصے میں حویلی سے اٹھ کر مردانے میں اپنے کمرہ خاص تک آیا تھا تا کہ وہ اس پر پوری طرح سوچ کر کوئی فیصلہ دے سکے۔

''تمہارا ذہن کیا کہتا ہے۔۔'' پیر سائیں نے دیوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا تو مشورہ یہی ہے کہ نادیہ بی بی کی بات مان لی جائے۔۔'' اس نے کہا تو پیر سائیں نے چونک کر دیکھا، چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''کیوں۔؟ کیوں مان لیں اس کی بات۔۔؟''

''نادیہ بی بی نے شرط ہی اس لیے رکھی ہے کہ آپ یہ بات نہ مانیں اور پھر وہ اپنی مرضی کرنے میں آزاد ہو گی۔ دیکھیں پیر سائیں ماحول اور حالات وہ نہیں رہے جس میں آپ اپنی بات زور دے کر یا حکم دے کر منوا سکتے ہیں۔ نادیہ بی بی کی بغاوت ہی اس لیے ہوئی کہ شعیب کا وجود سامنے آ گیا۔ اگر شعیب نہ ہوتا تو پھر شاید یہ حالات پیدا ہی نہ ہوتے، ماحول ہی کچھ دوسرا ہوتا۔''

''ہم ان حالات کو اپنے حق میں کیسے کر سکتے ہیں۔'' پیر سائیں نے پوچھا۔

''شاید نہ کر سکیں۔ یہ گمان بھی نہیں تھا کہ شعیب آپ کے خاندان کا خون بھی ہو سکتا ہے۔ قدرت کے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایسے حالات سامنے آ رہے ہیں کہ جن کے بارے میں گمان بھی نہیں تھا۔ اگر لاہور میں نادیہ بی بی آپ کو نہ ملتی۔۔؟ تب سے لے کر اب تک حالات جس طرح پل پل بدلے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتے۔۔ یہ قدرت کے اشارے ہیں، انہیں مان لیں۔۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ بازی پھر آپ کے ہاتھ میں رہے گی۔۔''

''کیسے۔۔۔'' پیر سائیں نے تیزی سے پوچھا۔

''گستاخی معاف پیر سائیں۔! آپ کے خاندان میں کوئی ایسا لڑکا نہیں ہے، جس سے آپ اپنی صاحبزادی کی شادی کر سکیں۔۔ نادیہ بی بی کی شادی اگر ظہیر شاہ سے ہو جاتی ہے تو وہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا جو آپ نے سوچا ہے، دوسرا شعیب نے اپنے حصے کا مطالبہ کرنا ہی کرنا ہے۔ وہ آج کرے یا کل۔۔۔ چاہے صلح ہو یا نہ ہو۔۔ اگر آپ کی صاحبزادی کا نکاح شعیب سے نہ ہو سکا تو پھر ساری زندگی۔۔۔ وہ حویلی ہی میں پڑی رہے گی۔۔ اس کی زندگی کا بھی تو سوچیں۔ بجائے شعیب کو دور کرنے کے، آپ سے قریب کریں۔۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔''

''ہاں۔! اس کا اشارہ تو دادی اماں بھی مجھے دے چکی ہیں۔'' پیر سائیں نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو بس پھر اللہ کا نام لے کر آپ ہاں کر دیجئے۔۔ نادیہ بی بی تو بچی ہے۔۔ اس نے تو سوچا ہے کہ آپ کا انکار ہو گا اور وہ شعیب سے شادی کرے گی۔۔ اس طرح آپ۔۔ فائدے میں نہیں نقصان میں رہیں گے۔۔ جائیداد کے حصے دار الگ ہو جائیں گے تو پھر آپ کے پاس کیا رہ جائے گا۔۔۔ فائدہ ہاں کرنے ہی میں ہے۔۔''

''ٹھیک ہے۔۔ مغرب کے بعد میں بیٹی کا نکاح دے دیتا ہوں۔۔'' پیر سائیں نے بمشکل کہا اور اٹھ گیا۔ اسے یہ اچھی طرح ادراک ہو گیا تھا کہ وہ شرط جس سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ درحقیقت وہ اس کے لیے فائدہ مند تھی۔ جائیداد کے معاملات کو اگر سامنے رکھا جائے اور ان پر ذرا سا بھی سوچا جائے تو بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ اسے اب شعیب پر ایسی بھرپور نوازشات کرنی تھیں کہ وہ نہال ہو جاتا۔ یہاں تک کہ وہ نادیہ کی محبت کو بھول کر فقط اس کا دم بھرتا۔ ایسا آفیسر اس کے لیے بہت سارے فائدوں کا باعث بن جاتا۔۔ اور پھر سب سے بڑی بات۔ اس کی بیٹی ،جس کے بارے میں وہ پریشان ہو جایا کرتا تھا، بیٹھے بٹھائے اس کی خوشگوار زندگی کے امکان پیدا ہو گئے تھے۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس نے سوچ لیا کہ مغرب کے بعد اس نے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

حویلی کی دوسری منزل پر اگرچہ سب موجود تھے لیکن ان کے درمیان وہی سناٹا تھا جو اس حویلی کی پہچان بن چکا تھا۔ پیر سائیں نے سب کو وہیں جمع ہونے کے لیے کہا تھا اور پھر مغرب کے بعد وہ سب وہیں تھے۔ ان میں صرف دو وجود نہیں تھے، ایک نادیہ اور دوسری فرح، اماں بی، زبیدہ، زہرہ بی، ظہیر شاہ اور شعیب وہاں موجود تھے۔ پیر سائیں ان میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ سبھی اس کے فیصلے کے منتظر اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر دادی اماں سے پوچھا۔

''کیا نادیہ ہماری بات سن رہی ہے؟''

''جی پیر سائیں۔! میں یہیں اس کمرے میں ہوں اور آپ کا فیصلہ سننے کی منتظر ہوں۔'' دوسرے کمرے میں سے نادیہ کی آواز ابھری۔ تو پیر سائیں پر سکون ہو گیا۔ جبکہ شعیب نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

''نادیہ بیٹی۔! تم نے تو اپنا فیصلہ سنا دیا جو شرط ہی ہے۔ کیا زبیدہ آپا کی بھی اس میں خواہش ہے، کیا تم نے ان سے پوچھ لیا ہے۔ اگر وہ انکار کر دیں تو۔'' پیر سائیں نے پوچھا۔

''پھوپھو آپ کے سامنے تشریف رکھتی ہیں۔ آپ چاہیں تو ان سے پوچھ لیں۔ ان کے انکار یا اقرار کے بعد صورت حال جو ہوگی، پھر اس پر بات کر لیں گے۔'' نادیہ نے اوٹ ہی سے جواب دیا۔

''جی، زبیدہ آپا۔! تو پھر کیا کہتی ہیں آپ۔ آپ نادیہ کی بات سے اتفاق کرتی ہیں یا انکار۔؟'' پیر سائیں نے پوچھا اور زبیدہ کی طرف دیکھنے لگا جو پہلے ہی شعیب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، نادیہ بولی۔

''مجھے یقین ہے کہ شعیب میرا مان رکھیں گے۔''

''تو پھر فیصلہ ہو چکا۔ جو تم چاہو گی، وہی ہوگا۔'' شعیب نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔ تو زبیدہ دھیرے سے بولی

''مجھے منظور ہے۔ اب تم کہو، کیا کہتے ہو۔''

''مجھے نادیہ کی شرط منظور ہے۔'' پیر سائیں نے کہا تو ماحول پر چھایا ہوا تناؤ ایک دم سے ختم ہو کر رہ گیا۔ بہت حد تک سب کے ذہن میں یہی تھا کہ وہ بات نہیں مانے گا۔ لیکن وہ مان گیا تو ایک اضطرابی کیفیت بھی ساتھ میں در آئی تھی۔ ظہیر شاہ اس سارے دورانیے میں بالکل خاموش رہا تھا۔ اس نے ہنکارا بھی نہیں بھرا تھا۔ تبھی زبیدہ نے کہا۔

''تو پھر مجھے بھی منظور ہے دلاور شاہ۔''

اس کے یوں قبول کرنے پر چند لمحے ان کے درمیان خاموشی رہی، پھر پیر سائیں نے شعیب کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے درمیان تعارف سے لے کر اب تک کوئی اتنا اچھا تعلق پیدا نہیں ہو سکا۔ اس کی بنیاد ہی میں کچھ ایسا ہوگا کہ جس میں کوئی اچھے جذبے پروان نہیں چڑھے بلکہ اس کے برعکس ہی ہوا۔ اب جبکہ تم ہمارے گھر کے فرد بننے جا رہے ہو۔ بلاشبہ وہ ساری باتیں بھلا دو گے جو انجانے میں ہمارے درمیان ہوئیں۔ کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارا اور میرا تعلق اور رشتہ کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب تم اپنے دل میں کچھ نہیں رکھو گے۔''

''جی نہیں، میرے دل میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔'' شعیب نے آہستگی سے کہا اور خاموش ہو گیا۔ تو پیر سائیں نیدادی اماں سے کہا۔

''ٹھیک ہے، نیچے دیوان نکاح خواں کو لے آیا ہوگا۔ میں، ظہیر شاہ اور شعیب جارہے ہیں۔ آپ نادیہ اور فرح کو تیار کر دیں۔ اس نے کہا اور اٹھ کر چل دیا۔ اس کے ساتھ ظہیر شاہ اٹھا تو شعیب کو بھی اٹھنا پڑا۔

حویلی کی نچلی منزل پر نکاح خواں کے ساتھ شہر کے دو معززین بھی موجود تھے۔ تبھی شعیب کو خیال آیا کہ یہاں دو گواہوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ وہ اگر لاہور میں ہوتا تو ان میں سے ایک بھا حمید ضرور ہوتا۔ لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اچانک اسے ثنااللہ کا خیال آیا۔ اس نے فون پر نمبر پش کیئے تو لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ تب اس نے پوچھا۔

''اس وقت کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں آپ۔؟'' اس نے پوچھا۔

''میں گھر میں ہوں اور کچھ نہیں کر رہا۔'' اس نے جواب دیا۔

''پیر سائیں کی حویلی تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا'' اس نے پوچھا۔

''بس ذرا سا وقت، خیریت تو ہے نا'' اس نے تشویش زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''تو بس پھر فوراً پہنچیں۔ ساتھ میں کوئی ایسا بااعتماد شخص بھی لیتے آئیں جو ہمارا گواہ ہو'' شعیب نے کہا۔

''جی، ابھی آیا'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

نکاح خواں، تیار تھا۔ سامنے پڑا رجسٹر کے پرت پُر کر لیے گئے تھے۔ صرف ثنااللہ کا انتظار تھا دیئے گئے مخصوص وقت سے چند منٹ کی دیر سے وہ پہنچ گیا۔ ملنے ملانے کے بعد انہوں نے احوال جانا تو ثنااللہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے مگر اس نے کوئی سوال نہ کیا۔ اس نے اور اس کے ساتھ آئے شخص نے دستخط کر دیئے۔ دیوان کے ساتھ ثنااللہ کو اندر بھجوا دیا گیا۔ وہاں سے تصدیق کے بعد ایجاب و قبول ہوا اور مختصر خطبے کے بعد دعا مانگ لی گئی۔

''شعیب اپنے دوستوں کو روکنا، یہ کھانا کھا کر جائیں۔'' پیر سائیں نے کہا اور اٹھ گیا۔ تبھی شعیب نے ظہیر شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا رقیب تھا۔ اگر اس کے دل میں بہت سارے خیال آرہے تھے تو بلاشبہ وہ بھی اس کے بارے میں بہت سوچ رہا ہوگا۔ اس کے دل پر کیا گذر رہی ہو گی۔ اسے یہ تو معلوم ہی ہے کہ نادیہ فقط میرے لیے حویلی چھوڑ کر لاہور چلی گئی تھی۔ اگر دلاور شاہ اسے اپنی انا کا سوال نہ بناتا تو شاید اس کا نکاح ظہیر شاہ سے نہ ہو پاتا۔ اور اس پر انہیں ایسی قیمت دینا پڑی ہے کہ فرح کا نکاح اس کے ساتھ کرنا پڑا۔ وہ سوچوں کی وادی میں کھویا ہوا تھا۔ لیکن دل میں کچھ کھو جانے کا احساس اس کے لیے چبھن بن رہا تھا۔ اک اضطراب تھا کہ بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ماضی کے ان حوالوں کو یاد کرے جس میں نادیہ نے اپنی محبت کا وہ احساس دیا تھا جو نشہ بن کر اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا۔ جبکہ اس کا ذہن موجودہ صورت حال کو قبول ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا اور کیا ہو گیا، کہاں حویلی میں داخلے پر اجازت طلب کرنا پڑی تھی اور اب وہ اسی حویلی ہی کا حصہ تھا۔ یہ انہونی تھی اور اس کی وجہ نادیہ ہی کی درخواست تھی۔

نادیہ کے کھو جانے کا احساس جہاں حسرت بن کر اسے مایوس کر رہا تھا، وہاں اسے یہ بھی دکھ ہو رہا تھا جس کے لیے دل میں محبت بھرے

جذبات ابھرے ہیں، نہ اسے دیکھ سکا اور نہ ہی اسے پا سکا، ورنہ اس کی زندگی میں نجانے کتنے لوگ آئے اور گئے۔ کسی کے لیے بھی اس کے من میں محبت بھرے جذبات نہیں اٹھے تھے۔ یہ کیسی محبت تھی کہ جسے دیکھا بھی نہیں صرف چاہا ہی چاہا ہے، وہی اسے نہ مل سکا، یہاں تک کہ اس کی اپنی ہی محبت نے اسے انجان راہوں پر پھینک دیا۔ جس کے بارے کوئی خبر نہیں تھی کہ کون سا راستہ کدھر جاتا ہے۔ چند گھڑیاں پہلے جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا، وہی اس کے ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کے لیے وہ کسی کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہتا تھا بلکہ یہ سراسر اس کا اپنا ذاتی فیصلہ تھا۔ ایک ہی لمحے میں جو اس نے فیصلہ کیا تھا تو اس کے سامنے جہاں نادیہ کی ذات تھی، وہاں اسے اپنی ماں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ نادیہ کی شرط مان کر وہی اپنی ماں کو اس حویلی میں دوبارہ مقام دلا سکتا تھا۔ وہ جو اسے دیکھنے کے روادار نہیں تھے، جس کے بارے میں بات کرنا تو کجا، اس کے وجود ہی سے انکاری تھے۔ اپنے تئیں انہوں نے زبیدہ کا مار دیا تھا۔ زندگی سے نکال دیا تھا، اب اسے ہی قبول کرنے کو تیار تھے۔ وقت ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ ان لمحات کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کی ماں جب بھی حویلی میں آیا کرے گی تو ایک حیثیت اور مقام کے ساتھ، پہلے کی طرح صدر دروازے پر اجازت کی طلب گار نہیں ہوا کرے گی۔ پیر سائیں جو اس کی جان کا دشمن تھا، اب اسے داماد کے طور پر قبول کر چکا تھا۔ کیا یہ اعجاز محبت تھا یا وقت و حالات کی مہربانی، جو کچھ بھی تھا، اسے اپنی محبت قربان کر کے، اپنی ماں کے لیے بہت کچھ مل گیا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ اسے اندر سے بلاوا آ گیا۔ اس نے سب کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ حویلی کے در و دیوار اس کے لیے اب اجنبی نہیں رہے تھے۔ حویلی کی انہی دیواروں کے درمیان کہیں نادیہ موجود تھی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس کی محبت کو کبھی دل سے نہیں نکال پائے گی۔

☆☆☆
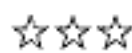
حجلۂ عروسی میں سمٹی ہوئی نادیہ کے دل میں نہ کوئی ترنگ تھی اور نہ ہی کوئی امنگ، مستقبل کے سپنوں کی جگہ ماضی کی یادیں اسے کچوکے بھر رہی تھیں۔ اس کی آنکھ میں کوئی اک ذرا آنسو نہیں تھا اور نہ ہی لبوں پر کوئی مسکان مچل رہی تھی۔ خالی الذہن سی، ویران دل کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کا سفر نہ تو کوئی خوشگواریت لایا تھا اور نہ ہی کوئی تلخی اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا وجود یوں ہو گیا تھا کہ جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو اور اس کے اندر سے سارے جذبات و احساسات کھینچ لیے ہوں۔ وجود تھا کہ مٹی کا ایک ڈھیر بیڈ پر تھا جیسے عروسی جوڑا پہنا دیا گیا ہو۔ سرخ جوڑے میں ملبوس نادیہ زیوارت سے لدی پھندی خاموشی سے ایک ٹک اپنے پیروں کو تکے جا رہی تھی۔ اس نے بہت پڑھا تھا کہ شادی ہونے سے جو رسومات ہوتی ہیں۔ ان میں کتنا ہلا گلا ہوتا ہے۔ سکھیاں کس طرح چھیڑتی ہیں۔ ایک گھر سے دوسرے گھر تک کے سفر میں اگر آئیں ،سسکیاں اور آنسو ہوتے ہیں تو ان میں امنگ بھری خوشیاں، ترنگ بھرے جذبے اور رنگ بھرے احساسات بھی ہوتے ہیں۔ زندگی ہمک رہی ہوتی ہے کہ جس سے مستقبل سے تار و پود ترتیب پاتے ہیں۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا، خلا کی سی کیفیت تھی، جس میں کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ اگرچہ دادی اماں نے خود سامنے بیٹھ کر ملازماؤں کو اسے سجانے سنوارنے کے لیے کہا تھا۔ اتنی توجہ اس نے فرح پر نہیں دی تھی۔ جتنی اس پر دی تھی۔ ملازماؤں نے بھی اسے بڑے شوق سے تیار کیا تھا۔ وہ کسی کی بے جان بت کی مانند سجتی سنورتی رہی۔ اسے، اس کے کمرے سے اٹھایا اور ظہیر شاہ کیسے ہوئے

کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں وہ بے نیاز بیٹھی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ سوچوں تک میں سناٹا تھا۔ اختر رومانوی کا لہجہ بھی یاد کرنے کی کوشش تو بھی اسے یاد نہ آیا۔ تبھی دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ظہیر شاہ تھا۔ پتہ نہیں اسے لگا، یا حقیقت میں ہی ایسا تھا، اسے ظہیر شاہ کے چہرے پر بھی کوئی خوشگواریت دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے نگاہیں پھیر لیں اور دوبارہ سے اپنے پیروں کو دیکھنے لگی۔ جس پر سونے کی پائل خوب جچ رہی تھی۔ ظہیر شاہ اس کے قریب بیڈ پر آ بیٹھا اور بڑی آہستگی سے سلام کیا۔ اس نے بھی زیر لب جواب دے دیا۔ چند لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ یوں جیسے دونوں نے جان بت ایک دوسرے کے سامنے موجود ہوں۔ پھر ظہیر شاہ نے اپنی جیب سے ہاتھ ڈالا اور سنہری ڈبیہ نکالی، اسے کھولا اور نادیہ کے سامنے کر دیا۔ اس میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

''یہ میری طرف سے تحفہ ہے تمہارے لیے۔''

چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام کر، بڑے پیار اور نزاکت سے اسے پہناتا، لیکن وہ یونہی اس کے سامنے کیے رہا۔ کتنے ہی لمحے یونہی گذر گئے۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا کہ وہ سمجھ جاتا۔ تبھی ظہیر شاہ نے اس ڈبیہ کو ایک طرف رکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

''کیا تم اب بھی اس شادی پر ناخوش ہو۔؟''

''بہت سارے فیصلے انسان اپنی مرضی سے نہیں کر پاتا۔ حالات و واقعات اسے مجبور کر دیتے ہیں۔ اب ان پر خوش ہوا جائے یا ناخوش۔ یہ بھی حالات و واقعات کی مرضی کے تحت ہوتا ہے نا۔''

''تو دوسرے لفظوں میں تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تیری اور میری شادی حالات و واقعات کی مجبوری کے تحت ہوئی ہے۔'' وہ خاصے تحمل سے بولا۔

''میں دوسرے تیسرے لفظوں میں بات نہیں کر رہی ہوں ظہیر شاہ، میں نے صاف لفظوں میں بات کہ ہے۔ بلکہ آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں ان سارے حالات و واقعات کو جس کے تحت یہ شادی ہوئی۔'' وہ بھی عام سے انداز میں بولی۔

''خیر۔! وہ ہوا سو ہوا۔ لیکن میں یہاں یہ الجھن دور کر لینا چاہتا ہوں کہ حویلی سے بھاگ جانے کی وجہ کیا تھی۔ میری ذات سے نفرت، اختر رومانوی یا شعیب سے محبت۔۔۔ یا کوئی بات۔۔۔؟''

''آپ کے والد۔۔۔ پیر سائیں کا لالچ۔۔۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان فرسودہ اور جھوٹی روایات کو توڑ دوں۔۔۔ اور میں نے توڑیں۔۔۔ آپ کی ذات سے نفرت ہوتی   ناتو جو چاہے ہو جاتا میں آپ سے شادی نہ کرتی۔۔۔ اور نہ ہی مجھے کوئی مجبور کر سکتا تھا۔ شعیب سے محبت۔۔۔ تو میرے پاس ہر طرح سے آپشن تھا۔۔۔ آپ نے بھی تو میرے ساتھ شادی اپنے لالچ کے لیے کی ہے۔ میں آپ سے یہ سوال کروں کہ کیا آپ کو میرے ساتھ محبت ہے۔؟ تو آپ کیا جواب دیں گے۔۔۔ بولیں۔'' نادیہ نے بڑے تحمل کے ساتھ صاف گوئی سے کہہ دیا۔

''میں نے بابا سائیں کا حکم مانا ہے۔۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''تو سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے ہو آپ کہ آپ بھی اپنے بابا سائیں کے لالچ میں پوری طرح شریک ہیں۔ آپ کی اور میری شادی نہیں ہوئی، مگر میری جائیداد اپنے نام کروانے کے لیے فائل بہت پہلے ہی پہنچا دی گئی۔ میں اسے کیا سمجھوں۔۔۔ یا پھر آپ انکار کریں کہ آپ اپنے بابا

سائیں کے منصوبے سے آگاہ نہیں ہیں۔'' اس بار وہ کافی حد تک ہتھے سے اکھڑ گئی تھی تو ظہیر شاہ نے تحمل سے کہا۔

''خیر۔! ہم یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس وقت شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہیں۔ اور ایک چھت کے نیچے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں اپنی آئندہ کی زندگی کے لیے یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہم نے اپنی زندگی کیسے گذارنی ہے۔''

''زندگی تو ویسے ہی گذرتی ہے جیسے ہم چاہیں گے۔۔ یہ تو ہم دونوں کے رویئے پر ہے نا۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اعتماد بنیں گے تو ہی اچھا رہے گا، ورنہ ہم میں بدگمانی اور تلخیاں ہی پیدا ہوتی رہیں گی۔'' نادیہ نے سکون سے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہوگا۔ کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور ہم ایک اچھی زندگی گذار سکیں؟'' اس نے سمجھوتہ کر لینے والے انداز میں پوچھا تو وہ بولی۔

''یہی کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور کیا۔۔ حالات و واقعات کی بجائے عزت اور مان دیں۔''

''کیسے۔۔ کیسے ہوگا یہ۔۔؟'' اس نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ جس طرح زندگی کی سانسوں بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح کسی دوسرے کی نیت بارے کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو زندگی کی راہوں پر چلنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہم سفر کیسا ہے۔'' اس نے بڑے محتاط انداز میں کہا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ابھی تک الجھن میں ہو ہمارے اس رشتے کے بارے میں۔ الجھن ہے تمہیں، یقین نہیں۔'' ظہیر شاہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ظہیر شاہ۔! میری زندگی میں جو محرومیاں ہیں۔ اس کے بارے میں آپ پوری طرح آگاہ ہو۔ جانتے ہو کہ اس حویلی میں ہم عورتیں کیسے رہتی ہیں۔ ہمیں تو اپنی مرضی سے سوچنے تک کا اختیار نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو آج یہ مجبوریاں نہ ہوتیں۔ وہ مجبوریاں جو محرومیوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔''

''یہ ہماری روایات ہیں انہیں قبول تو کرنا پڑے گا۔ میں بھی انہی روایات کا پابند ہوں اور رہوں گا۔ تمہارے ساتھ شادی کرنے کے بعد ایسا نہیں ہے کہ میں ان روایات سے انحراف کر لوں گا۔ جہاں تک جائیداد کا معاملہ ہے، وہ تم رکھوا اپنے پاس، مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ کبھی بھی یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہارے ساتھ جائیداد کے لالچ میں شادی کی ہے۔ میری اور تمہاری شادی فقط حویلی کی روایات کے لیے ہے۔'' ظہیر شاہ نے اس واضح کرنے کی کوشش کی۔

''میں آپ کی بات کو جھٹلاتی نہیں، اگرچہ میرے پاس بہت سارے دلائل ہیں کہ پیر سائیں نے کیا کچھ کیا۔ تاہم میں آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔'' اس نے بحث کو سمیٹ دینا چاہا۔

''میں فقط یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ماضی کو نظر انداز کر سکتا ہوں، اگر تم آئندہ حویلی کی روایات کی پاسداری کرو۔ اور یہ کبھی بھی جتانے کی کوشش نہ کرنا کہ میرے ساتھ شادی کر کے تم نے مجھ پر یا میرے والدین پر احسان کیا ہے۔ کیونکہ یہ شادی تم نے شرط سے کہ ہے۔ تمہاری شرط پوری

ہوئی اور اب تمہیں اپنی زندگی میرے مطابق گذارنا ہوگی۔'' ظہیر شاہ نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا تو وہ بہت زیادہ تحمل سے بولی۔

''اب میں آپ کے نکاح میں آگئی ہوں۔آپ میرے شوہر ہیں اور آپ کا ہر حکم ماننا میرا فرض ہے۔لیکن آپ کا لہجہ اور انداز مجھے یہ جتا رہا ہے کہ میں اب آپ کی زر خرید لونڈی بن کر رہوں تو زندگی گذارنے کا حق رکھتی ہوں۔ورنہ نجانے میرے ساتھ کیا ہو جائے گا۔میرے سارے حق سلب ہو جائیں گے اور میں انہی در و دیوار میں گھٹ کر رہ جاؤں گی؟''

''ہاں، تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔جیسے پرکھوں سے ہماری یہ روایات چلی آرہی ہیں۔اور اس پر میں کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گی۔میں تمہیں یہی باور کرا رہا ہوں۔۔'' وہ قدرے کھردرے لہجے میں بولا۔

''تو ٹھیک ہے۔۔میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔لیکن آپ کو میرا حق مجھے دینا ہوگا۔جس سے آپ فرار نہیں لے سکتے۔۔'' وہ پھر اسی تحمل سے بولی۔

''کیسا حق۔۔میں نے تمہیں اپنے عقد میں لے لیا ہے تو حقوق بھی پورے کروں گا۔۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''تو پھر سنیں۔!یا تو آپ مجھے اپنے ساتھ لندن لے جائیں۔یا پھر آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔میرے ساتھ۔۔یہ میرا حق ہے کہ جہاں آپ رہیں گے، میں نے بھی وہیں رہنا ہے۔کیونکہ آپ میرے ذمے دار ہیں۔دوسرا اور کوئی نہیں۔۔'' وہ پرسکون انداز میں بولی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ ایسا ناممکن ہے۔مجھے اپنی تعلیم مکمل کر کے ہی یہاں آنا ہے۔جو میرے باپ کا خواب ہے۔اور ویسے بھی میں ابھی اپنے ساتھ تمہیں لے جا نہیں سکتا۔'' اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ جانیں، آپ فیصلہ کر کے مجھے بتا دیں۔تب ہم زندگی کی شروعات کر لیں گے۔'' اس نے ظہیر شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھنا کر بولا۔

''یہ تم خواہ مخواہ کی ضد کر رہی ہو۔یہ اقرار کر لو کہ تم نے مجھے اپنے دل سے شوہر تسلیم ہی نہیں کیا۔''

''اور کیا آپ نے دل سے مجھے بیوی تسلیم کر لیا؟'' وہ تنک کر بولی تو کافی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔پھر بولا۔

''دیکھو نادیہ۔!میں تمہیں بار بار یہ بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر ہم زندگی کی راہ پر سمجھوتے کے ساتھ چلے تو زندگی سہل ہو بھی سکتی ہے۔لیکن مجھے لگتا ہے تم کچھ اور ہی سوچ رہی ہو۔ٹھیک ہے، اب میں تمہیں اپنے فیصلے ہی سے آگاہ کروں گا۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔وہ اسے دیکھتی رہی۔اس کے دل میں قطعاً احساس نہیں تھا کہ وہ اس کی سہاگ رات ہے اور اس کا دولہا اس سے روٹھ کر حجلۂ عروسی سے جا رہا ہے۔وہ کمرے میں تنہا ہو گئی تو نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ وہ اب تک گھٹن کی شکار تھی اب کھل کر سانس لے سکتی ہے۔اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنے زیور اتارنے لگی۔اس کا خیال تھا کہ اب وہ اپنا عروسی جوڑا اتار کر سکون سے سو جائے گی۔

☆☆☆

شعیب اپنے آپ ہی میں خود کو اجنبی محسوس کرر ہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے حالات و واقعات کے ساتھ ہوائیں بھی بدل جاتی ہیں ۔ایک ہی دن میں اتنا کچھ بدل جائے گا یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ تو اپنی امی سے پوری بات سن کر نادیہ کو لے آنے کے لیے اس گھر سے نکلا تھا۔لیکن ہوا کیا؟ فرح اس سے نکاح دی گئی جسے وہ اپنے ساتھ لے آیا اور اب وہ حجلۂ عروسی میں اس کی منتظر تھی۔ زندگی اپنے رنگ کیسے بدلتی ہے، یہ اس دن اس کی سمجھ میں آیا۔ مقدر کس قدر طاقت ور ہوتا ہے یہ اس دن اسے پتہ چلا۔ انسان اپنے ذہن میں نجانے کیسے منصوبے بناتا ہے۔ کس قدر ارادے باندھتا ہے لیکن ہوتا کیا ہے؟ یہاں تک کہ کچھ بھی اس کی دسترس میں نہیں رہتا۔ گھر میں موجود تین فرد، وہ، فرح اور اس کی امی کے ساتھ فقط دو ملازمین۔ خاموشی انتہائی گہری تھی۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ رات تھی کہ گذرتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ لان میں بیٹھا ان لمحات کی بھل بھلیوں میں کھویا ہوا تھا جو نادیہ سے بات کرتے ہوئے گذرتے تھے۔ کہیں بھی کچھ ایسا نہیں تھا۔ جس سے ان کے درمیان کوئی کسی قسم کا وعدہ ہوا ہو۔ وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ زندگی کا ایسا کون سا موضوع تھا جو ان کے زیرِ بحث نہیں آیا تھا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اظہار ہو، جس سے دونوں کی محبت عیاں ہوتی ہو۔ وہ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ بہت قریب آگئے لیکن جب ان دونوں ہی کے ملنے کا وقت آیا۔ تب نادیہ نے عجیب رویہ دکھا دیا۔ کیا اسے مجھ سے محبت کبھی تھی ہی نہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو پھر حویلی سے اختر رومانوی تک جانا کس زمرے میں جاتا ہے؟ ظہیر شاہ سے اگر اس نے شادی کرنا تھی تو پھر حویلی سے جانے کا کیا مطلب۔۔ اگر وہ حویلی سے نہ جاتی تو کیا اس کے بارے میں علم ہوتا۔۔؟ ایسے ہی نجانے کتنے سوال اس کے ذہن میں ایک کے بعد آتے چلے جا رہے تھے۔ اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ فرح اس کے انتظار میں ہے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جو اس کی ہمسفر بن چکی تھی، اس کے بارے میں اندر سے ذرا سا جذبہ بھی نہیں اٹھا تھا۔ اور وہ جو اس سے بچھڑ گئی تھی وہ اسے ہی یاد کرتا چلا جا رہا تھا۔

''ایسا کیا سوچ رہے ہو بیٹا۔'' اس کے کانوں میں اس کی امی کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی دائیں کاندھے پر دباؤ کا احساس ہوا تو وہ چونک گیا۔

''نہیں۔۔ کچھ نہیں امی۔۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تو اس کی امی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں جانتی ہوں بیٹا۔! تم نے اگر کبھی نادیہ کے لیے اظہار نہیں بھی کیا تو ان دنوں تمہاری اس کے لیے تڑپ دیکھ کر میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ تم اسے کتنا چاہتے ہو۔ لیکن فرح بھی تو اس کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ نجانے کس مصلحت کے تحت اس نے فرح کو اپنا مقام دے دیا ہے اور خود حویلی کی چار دیواری میں دفن ہو گئی۔۔''

''ہاں امی۔! پہلے مجھے اتنا احساس نہیں تھا۔ لیکن اس کے کھو جانے کے بعد وہ مجھے بہت یاد آ رہی ہے۔'' اس نے واضح طور اعتراف کر لیا۔

''میں سمجھتی ہوں بیٹا۔! لیکن اب وہ ماضی کا حصہ بن گئی ہے۔ اس میں نہ حالات کا کوئی دوش ہے اور نہ ہماری کوئی کوتاہی، یہ فیصلہ اس نے خود کیا۔ اب اس پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' اس کی امی نے پیار سے کہا۔

''ہاں امی۔! شاید اس لیے میں نے فرح کو قبول کرلیا۔ ورنہ شاید۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا لیکن مصلحت کے تحت خاموش ہو گیا۔

''اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ماضی کو بھول جاؤ اور آنے والے وقت کو اچھا اور خوشگوار بنانے کی کوشش کرو۔ جس طرح بھی سوچا جائے، اس میں فرح بے چاری کا تو کوئی بھی قصور نہیں ہے۔ اس بے چاری کو تم ایک بیوی کا مان دینا کہ وہ خوشگوار زندگی کا سکھ پائے۔'' امی نے سمجھایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے امی۔۔۔ جیسا آپ چاہیں۔''

''تو چلو اٹھو، وہ بے چاری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اسے کبھی دکھ مت دینا۔'' امی نے اسے سمجھایا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر دونوں ماں بیٹا رہائش گاہ کے اندر چل دیئے۔

شعیب جس وقت اپنے کمرے میں داخل ہوا تو فرح ایک گٹھڑی کی مانند بیڈ کے ایک کونے پر ٹکی ہوئی تھی۔ زیورات سے لدی پھندی وہ سر نیہوڑے یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ جیسے خود میں ہی کہیں گم ہونے جا رہی ہے۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی حالت کا اندازہ کرتا رہا۔ پھر وہ آہستگی سے آگے بڑھا اور بیڈ کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھا۔ اس نے محسوس کیا کہ فرح ہلکے ہلکے کانپ رہی ہے۔ نجانے کیوں اسے فرح پر ایک دم سے ترس آ گیا۔ وہ اگر نادیہ کا تصور ذہن میں لیے ہوئے ہے تو ممکن ہے فرح کے ذہن میں بھی کوئی تصور ہو۔ اس نے ہولے سے اسے سلام کہا تو عجیب مردنی سی آواز میں فرح نے جواب دیا۔ تب شعیب کو احساس ہوا کہ اسے باتوں ہی باتوں میں حوصلہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ شاید وہ بات ہی نہ کر پائے۔ اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ اس لیے وہ بڑے نرم لہجے میں بولا۔

''فرح۔! میں مانتا ہوں کہ ہماری شادی ایسے حالات میں ہوئی ہے جس کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آج کیا، دوپہر تک تمہارے ذہن میں نہیں ہوگا کہ آج رات تمہاری سہاگ رات ہوگی۔ قسمت کے اس کھیل میں ہمارے لیے کیا ہے، نہ تم جانتی ہو اور نہ میں جانتا ہوں۔ تم جو کہنا چاہو اور جیسی زندگی چاہو، میں اس طرح کی زندگی تمہیں دینے کی کوشش کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اسے اپنی جانب لا کر ایک کنگن اس کی کلائی میں پہنا دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ فرح کا بدن مزید لرزنے لگا ہے۔ کافی لمحات کی خاموشی کے بعد وہ اس ہلکی سی آواز میں بولی۔

''شکریہ۔''

''کیا تم کچھ نہیں کہو گی؟'' شعیب نے اسے بات کرنے پر ابھارا تو اس نے حوصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کیا کہنا ہے۔ کیونکہ مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی نے جو دیا اور جیسا دیا مجھے قبول ہے۔ آئندہ بھی میں کوئی گلہ نہیں کروں گی۔ حویلی کی روایت میں ہے کہ عورتیں اپنے فیصلے نہیں کر سکتیں تو میں بھی اپنا آپ اور اپنی زندگی کے سارے فیصلے آپ کے سپرد کرتی ہوں۔''

''کیا تم نے کبھی سوچا تھا کہ ایسی انہونی ہو سکتی ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔! یہ انہونی ہی ہے۔ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ خاندان کے باہر شادی نہ کرنا بھی حویلی کی روایت میں ہے۔ خاندان میں کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا کہ جس سے میری شادی ہو سکتی۔ میں نے تو سوچ لیا تھا کہ میں نے ساری زندگی یونہی گزار دینا ہے۔ اب یہ قسمت۔۔۔'' فرح نے کہا

توشعیب نے پوچھا۔

''میرے خیال میں قسمت سے زیادہ یہ نادیہ کا فیصلہ ہے۔تم سوچ سکتی ہو کہ ایسا اس نے کیوں کیا؟''

''میں نہیں جانتی۔وہ آج سے نہیں بہت پہلے سے، کئی مہینوں سے ڈسٹرب ہے۔کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ تنہائی کا شکار ہو کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔اس لیے ایسی حرکتیں کرتی ہے جن کے بارے میں اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے جارہی ہے۔'' وہ کافی حد تک حوصلہ سے بات کرنے لگی تھی۔

''اتنی تنہائی ہے حویلی میں؟'' اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تنہائی تو ہے اور یہ سب حویلی کی روایات کی وجہ سے۔۔۔اور پھر ہم تین ہی تو تھیں حویلی میں، امی۔۔۔وہ تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔۔۔نہ کسی معاملے میں دلچسپی اور نہ ہی کوئی اپنی مرضی۔۔بس باباسائیں کے حکم کی پابند ہیں۔'' اس نے اعتماد سے کہا تو وہ بڑے نرم لہجے میں بولا۔

''خیر۔!تمہارا یہ فیصلہ اچھا ہے کہ اپنے سارے فیصلے میرے سپرد کر دیئے ہیں۔لیکن میں تم پر کوئی جبر یا ظلم نہیں کروں گا۔بلکہ میں تمہیں اپنی مرضی سے جینے کا پورا پورا حق دیتا ہوں۔۔تم جس طرح خوش رہنا چاہو، ویسے ہی رہو۔۔۔مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔۔''

''کہیں آپ مجھ پر ترس کھا کر تو ایسا نہیں کہہ رہے ہیں۔۔۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''کیوں تمہیں ایسا کیوں لگا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کے لیے کوئی مانگی ہوئی دعا تو نہیں ہوں نا۔۔آپ پر مسلط کی گئی ایک شرط ہوں۔شرط تو مجبوری ہی میں پوری کی جاتی ہے نا۔۔۔آپ کی بات سے تو مجھے یوں لگا جیسے آپ کو مجھ سے کوئی رغبت نہ ہو۔اور آپ بس مجھے نبھائیں گے۔۔'' اس کے لہجے میں نجانے اتنا درد کہاں سے سمٹ آیا تھا۔

''ابھی تم میری مزاج آشنا نہیں ہو۔۔اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔زندگی میں جب تم میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلو گی نا، تب تجھے محسوس ہوگا کہ میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔۔ابھی تو ویسے بھی میری باتوں کی سمجھ نہیں آئے گی۔اگر میں نے مجبوری میں بھی تجھے نبھایا نا تو اس میں بھی میں تجھے مان دوں گا۔۔جس طرح حویلی میں روایات کے نام پر جبر ہے۔۔انسانی رویے کی تضحیک کی جاتی ہے۔۔ویسا میں کر ہی نہیں سکتا۔۔تم نے اتنی زندگی حویلی کی چار دیواری میں گذاری ہے۔۔اس لیے تمہیں احساس نہیں ہے کہ باہر کی دنیا کتنی کھلی ہے۔اس میں کتنی روشنی ہے۔۔جبر سے نہیں۔۔خلوص سے دل جیتے جاتے ہیں۔۔'' اس نے کافی حد تک جذباتی لہجے میں کہا۔

''لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے نا۔۔آپ نادیہ کو چاہتے تھے اور میں۔۔۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ میرے دل میں اس کے لیے محبت ہے، احترام ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی اس لیے تج دوں کہ وہ مجھے نہیں ملی۔۔۔زندگی کی حقیقتیں کچھ اور بھی ہیں۔ان میں بھی نبرد آزما ہونا ضروری ہے۔ایک کو نہ پا کر سارے رشتوں سے ناطہ توڑ لیا جائے۔یہ تو پاگل پن ہے ہوا نا۔۔اور پھر فرح یہ جان لو۔۔ہم میں لاکھ گہرا تعلق رہا ہو۔۔دوستی کی حدیں جتنی مرضی وسعت رکھتی ہوں مگر۔!ہمارے درمیان کوئی وعدہ نہیں ہوا یہاں تک کہ کوئی اظہار تک نہیں۔۔اس لیے ہم دونوں میں کوئی شرمندگی نہیں اور نہ ہی ہم ایک دوسرے کو بے وفا کہہ سکتے

ہیں۔ ہر رشتے اور تعلق کا مان الگ ہوتا ہے۔ اسے اس کے مقام پر رکھا جائے تو ہی زندگی سہل ہوتی ہے۔ ورنہ الجھنیں اس قدر بڑھتی ہیں کہ سوچیں ہی انسان کی قاتل بن جاتی ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میرے خیال میں نادیہ کے اندر آپ کی محبت سے زیادہ حویلی کی روایات سے نفرت کا عنصر زیادہ ہے۔۔۔اس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتی رہتی ہے۔ شاید آپ کے پاس جانے میں اس کی بغاوت نے اسے اکسایا ہو'' فرح نے آہستگی سے کہا تو وہ بولا۔

''تمہارے ساتھ نکاح ہونے تک میں سمجھتا رہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے، لیکن جب اس نے شرط عائد کی تو مجھے گمان ہوا یہ محبت نہیں، بغاوت ہی ہے۔ ورنہ اسے اپنی محبت پالینے کا پورا پورا اختیار تھا۔ وہ جو چاہتی سو کرتی۔۔۔''

''خیر! میں جو بھی ہوں، جیسی بھی ہوں۔۔۔ آپ کی زندگی میں آگئی ہوں۔۔ مجھے زندگی کو برتنے کا ابھی اتنا سلیقہ نہیں ہے۔ میرے لیے باہر کی دنیا کی معمولی سی چیز بھی بہت غیر معمولی ہوگی۔۔۔ اب میں نے آپ ہی کی نگاہ سے دنیا کو دیکھنا ہے۔۔۔ پلیز! مجھے نہ صرف مان دیجے گا۔۔۔ بلکہ وہ اٹوٹ سہارا بھی جس سے میں کہیں اس حیرت کدے میں گم ہو کر نہ رہ جاؤں۔'' فرح نے بڑے نپے تلے لفظوں میں اپنا مدعا کہہ دیا۔ شعیب کو اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ اس لیے خوش دلی سے بولا۔

''تم بات بڑے سلیقے سے کرلیتی ہوں۔۔۔ اس کی کیا وجہ ہے۔؟''

''یہ شاید نادیہ ہی کی وجہ سے۔۔۔ اس نے بہت پڑھا ہے اور میں نے بھی۔۔۔ اس کے اندر بغاوت اترتی چلی گئی اور میں اپنے آپ میں کھو کر رہ گئی۔۔۔ میرے سپنے کچھ اور ہی طرح کے تھے۔۔۔ میں نے اپنی دنیا تخلیق کر لی تھی اور اس میں خوش تھی کیونکہ میں جانتی تھی کہ اب میں نے تنہا زندگی گذارنی ہے اور اپنی بنائی ہوئی دنیا میں زندہ رہنا ہے۔۔۔ یہ اپنے آپ کو سہارا دینے کی کوشش تھی۔۔۔ آپ اسے خود فریبی کہہ سکتے ہیں۔۔''

''زندگی میں ہر انسان نے اپنی دنیا بنائی ہوئی ہے فرح۔۔۔ جہاں وہ اپنی مرضی سے زندگی گذارنے پر مجبور ہے یہ دنیا جس قدر خوبصورت ہے نا۔۔ یہ اتنی بدصورت اور کریہہ بھی ہے کہ خوف آنے لگتا ہے۔ یہاں انسان کا اپنے آپ میں سمٹنا بھی بہت ضروری ہے ورنہ باہر کے حالات اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ تم فکر نہیں کرو فرح۔۔۔ تمہیں نہ صرف عزت ملے گی بلکہ وہ مان بھی جو تم چاہتی ہو۔ بس ایک بات یاد رکھنا اعتماد ہی سارے رشتے ناطے اور تعلق کو مضبوط اور گہرا بناتا ہے۔ یقین جیسی دولت انسان کے پاس ہو نا تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

''میں آپ سے یہی چاہتی ہوں۔۔۔ جہاں کہیں قدم ڈگمگا جائیں تو آپ ہی میرا سہارا ہوں۔'' اس نے جذب سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ماتھے سے لگا لیا۔ شعیب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تھپتھپا کر دھیرے سے چھوڑ دیا۔ ان کے درمیان یقین نے تعلق کو گہرے رنگ دے دیئے تھے۔ شعیب اٹھا اور ایزی ہونے کے لیے لباس تبدیل کرنے لگا۔ فرح اٹھی اس نے اپنے زیور اتارے، عروسی جوڑا اتارنے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔۔۔ وہ جب ایزی ہو کر آئی تو ہلکی پھلکی سے گڑیا دکھائی دے رہی تھی۔ وہ شرماتے ہوئے دوبارہ بیڈ پر آ بیٹھی جہاں شعیب اپنی ہی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی کہ کب وہ اپنی سوچوں میں سے باہر آتا ہے۔ تبھی وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کمرے سے باہر رات گہری تھی جہاں فقط رنگینیاں ہی اپنا آپ منوانے کے لیے بے تاب تھیں۔

☆☆☆

مشرقی افق سے سورج بلند ہوگیا تھا۔ نارنجی رنگ دھیرے دھیرے پیلاہٹ میں بدل گیا۔ روشنی پھیلی اور ہر طرف اجالا ہوگیا۔ پرسکون زندگی میں ہلچل ہوگئی۔ ایسے میں مردان خانے میں پیر سائیں اپنے کمرے خاص میں بیٹھا ہوا، زندگی کی اس حقیقت بارے سوچ رہا تھا کہ بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی بندے کے اختیار میں بہت کچھ آ جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شدید خواہش کے باوجود ہاتھ میں کچھ نہیں آتا۔ انسانی خواہشات چاہے جتنی وسعت رکھتی ہوں ان کی ایک حد ہوتی ہے، پھر اس سے آگے کوئی ایسی طاقت ہے جس کی اپنی ویٹو پاور شروع ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنے تئیں جو کچھ بھی سوچا تھا، لیکن ہوا وہی جو قدرت کی مرضی تھی۔ انسانی نظام کے ساتھ ساتھ قدرت کا بھی ایک نظام ہے جو اپنی دسترس رکھتا ہے۔ وقت کو قابو کرنے کی خواہش میں انسان اپنی عظمت اور وقعت کھو دیتا ہے۔ وہ تنہا بیٹھا ہوا یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ مخصوص دستک تھی جیسے وہ پہچان گیا تھا۔ دستک دینے کے چند لمحوں بعد دیوان اندر آ گیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پیر سائیں نے اس کے چہرے پر دیکھا اور تشویش سے پوچھا۔

''کیا بات دیوان، تھوڑا پریشان لگ رہے ہو؟''

''سرکار بات پریشانی والی ہی ہے۔۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''تو پھر بولونا۔۔۔ بات کیا ہے؟'' اس بار پیر سائیں نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''اپنے ظہیر شاہ صاحب واپس برطانیہ چلے گئے ہیں۔'' دیوان نے اپنے لہجے کو کافی حد تک نرم رکھتے ہوئے کہا تو پیر سائیں نے حیرت سے کہا۔

''ظہیر شاہ لندن چلا گیا۔ یہ کیا بات ہوئی، کسی کو بتایا، نہ پوچھا۔ ابھی کل شام ہی تو اس کی شادی ہوئی ہے، یہ کیا ہے، کون کہتا ہے۔''

''سرکار، زنان خانے سے یہ پیغام بڑی بی بی جی نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ ظہیر شاہ جی وہاں کوئی خط چھوڑ گئے ہیں۔ وہ رات ہی کسی وقت ڈرائیور کو لے کر نکل گئے تھے۔'' دیوان نے وضاحت کی۔

''خط چھوڑ گیا ہے۔۔ اور رات ہی کسی وقت نکل گیا ہے۔۔ یہ کیا ماجرا ہوا۔ خیر، میں دیکھتا ہوں۔۔ تم کسی نہ کسی طرح اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔۔ میرے خیال میں وہ ابھی تک ایئر پورٹ بھی نہیں پہنچا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔

''جی سرکار۔ میں نے رابطہ کیا ہے، لیکن ان کا فون ادھر حویلی میں ہے۔۔ وہ ساتھ لے کر نہیں گئے۔ ڈرائیور کا فون بھی بند ہے۔۔'' دیوان نے اپنی کارگزاری سنادی۔

''ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔'' پیر سائیں نے کہا اور اپنے خاص کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اگر چہ وہ اپنی معمول کے مطابق دھیمی چال ہی چل رہا تھا مگر اس میں تیزی واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔

حویلی کی دوسری منزل پر کاریڈور کے پاس کھلی جگہ میں بڑی بی بی جی کے پاس زہرہ بی دونوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے افسردہ تھے۔ یوں جیسے کہ بہت بڑا نقصان ہوگیا ہو۔ پیر سائیں ان کے پاس آیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کب گیا وہ۔؟'' اس نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو بڑی اماں نے بتایا۔

''پتہ نہیں، صبح اس کا انتظار کیا لیکن وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں آیا۔ تو پتہ کروایا۔ دروازہ بند تھا اور دروازے کے باہر یہ کاغذ ٹنگا ہوا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے کاغذ کا ایک پرزہ پیر سائیں کی طرف بڑھا دیا۔ جسے اس نے پکڑ لیا اور پڑھنے لگا۔ اس میں انتہائی مختصر انداز میں یہی لکھا ہوا تھا کہ وہ برطانیہ واپس جا رہا ہے۔ وہاں جا کر فون کر کے تفصیل سے بتائے گا کہ وہ کیوں فوراً واپس چلا گیا ہے۔ لہذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پیر سائیں نے پڑھا اور پھر دونوں سے پوچھا۔

''اس نے تو کوئی وجہ نہیں لکھی۔۔ کیا اس کے کمرے میں نادیہ نہیں ہے۔۔ اس سے نہیں پوچھا؟''

''نادیہ نے تو یہی بتایا ہے کہ رات کے پہلے پہر وہ اس کمرے میں گیا تھا، کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ کافی دیر انتظار کر کے وہ تو سو گئی لیکن یہ کمرے میں نہیں پلٹا۔'' زہرہ بی نے دھیمے سے لہجے میں بتایا تو وہ تیزی سے بولا۔

''صاف ظاہر ہے، ان دونوں میں کوئی بات ہوئی ہو گی۔ اور بات بھی کوئی بہت اہم، ورنہ وہ اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتا۔ آپ نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''میں نے نادیہ سے پوچھا تھا۔۔ وہ تو کہہ رہی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جھگڑے والی۔۔ وہ کچھ دیر آیا، باتیں کیں اور اٹھ کر چلا گیا۔۔'' زہرہ بی نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

''وہ باتیں کیا تھیں۔۔ اصل میں انہی باتوں میں۔۔۔'' پیر سائیں کہتے کہتے رک گئے، پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اپنی والدہ کی طرف دیکھ کر بولا'' آپ۔! اماں بی آپ نادیہ سے پوچھیں۔ اس نے کوئی ایسی بات کی ہو گی۔ جسے ظہیر شاہ نے اپنی توہین سمجھا ہو گا۔۔ پتہ کریں آپ۔۔۔''

''مان لیا دلاور شاہ کہ نادیہ نے کوئی توہین آمیز رویہ رکھا ہو گا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ظہیر شاہ حویلی چھوڑ کر لندن کو سدھار جائے۔۔ اسے اگر حویلی کے کسی فرد پر اعتبار رہتا تو وہ ضرور کوئی بات کرتا۔ ایسے بنا بتائے چلے جانا کوئی دانش مندی تو نہیں ہے۔'' لاشعوری طور پر اماں بی نے نادیہ کی وکالت کر ڈالی۔

''وجہ تنازعہ تو پھر بھی یہیں کہیں ہے نا۔۔۔'' پیر سائیں نے اپنے بیٹے کے طرزِ عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا تو دادی اماں چند لمحے خاموش رہی۔ پھر دھیمے سے لہجے میں بولیں۔

''چلیں۔! میں پوچھتی ہوں نادیہ سے کہ اصل معاملہ کیا ہوا ہے۔۔ لیکن مجھے نہیں یقین کہ وہ کچھ ایسا بتائے گی۔ جواب تک اس نے بتایا ہے اس سے زیادہ ہو۔۔ یہ تو ظہیر کے فون آنے پر ہی معلوم ہو گا کہ وہ کیا کہتا ہے۔'' اماں بی نے واضح لفظوں میں پیر سائیں کو باور کرا دیا کہ وہ مزید کی کوئی توقع نہ رکھے۔

''خیر۔! میں کوشش کرتا ہوں کہ ابھی وہ ملک سے باہر نہ جا سکے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا تو دادی اماں نے کہا۔

''بیٹے کی پریشانی تو ہوگئی۔لیکن کیا بیٹی فرح کا بھی خیال ہے کہ نہیں۔اب اس کی طرف کون جائے گا۔آپ جائیں گے یا ہم سے کوئی۔۔۔''

اماں بی نے جب توجہ اس طرف مبذول کرائی تو پیر سائیں چونک گیا۔یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ بیٹی کو بھی لینے جانا ہے۔بیٹی کو لانے کی بات اپنے اندر بہت سارے سوال چھپائے ہوئے تھا۔یہ پیر سائیں کی شان کے خلاف تھا کہ وہ کسی کے گھر میں جاتا۔۔۔چاہے وہ کسی کا بھی ہو۔اور پھر بیٹی کے گھر میں،اس شعیب کے گھر میں جس سے اس کی مخالفت رہی ہو۔نجانے وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔۔پتہ نہیں فرح کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا ہوگا۔شرط کے ساتھ جو مجبوری بندھی ہوئی ہوتی ہے کیا اس کے اثرات فرح پر نہ پڑے ہوں گے۔؟اس نے تو اپنی بات منوا کر نادیہ کو ظہیر شاہ سے بیاہ دیا تھا،لیکن کیا اب فرح کی زندگی میں اپنی مرضی سے خوشیاں دے پائے گا۔اگر شعیب نے اپنا رنج و دکھ فرح کی ذات میں سے نکالنا چاہا تو وہ انہیں روک پائے گا۔کیا شعیب کے ساتھ فرح کو بیاہ کر اس نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟کیا یہ کوئی نادیہ ہی کی چال تھی کہ اس طرح وہ پیر سائیں کو نیچا دکھا سکے گی۔۔کیا اس کی پلاننگ میں زبیدہ پوری طرح ساتھ دے رہی ہے؟کیا اسے گھیرنے کا پورا پورا منصوبہ بنا لیا گیا ہے؟یہ سوچتے ہی وہ ایک دم سے پسینے میں نہا گیا۔اپنی ضد اور انا کی خاطر اس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا اور ایک بہت بڑا نقصان کر لیا۔

''پیر سائیں۔!کیا ہو گیا آپ کو طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟''زہرہ نے اس کی حالت دیکھ کر تیزی سے پوچھا تو وہ آہستگی سے بولا۔

''نہیں۔میں ٹھیک ہوں۔''

''تو پھر یہ۔۔۔؟''اس نے پھر آہستگی ہی سے پوچھا تھا لیکن اس کے لہجے میں فکر مندی در آئی تھی۔

''کچھ نہیں۔۔''یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا۔پھر کچھ سوچ کر بولا۔''ابھی ظہیر شاہ کا معاملہ ختم ہو جائے تو پھر سوچتے ہیں کہ فرح کی طرف کون جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ کاریڈر میں نیچے جانے کے لیے چل پڑا۔فرح کا خیال آتے ہی ظہیر شاہ والا معاملہ بالکل ہی معمولی لگ رہا تھا۔وہ عجیب کشمکش میں آ گیا تھا۔وہ خود اگر جاتا ہے تو نجانے شعیب کا رویہ کیا ہو اور اگر حویلی کی خواتین کو اس کے گھر بھجواتا ہے تو پرکھوں کی روایات ٹوٹ جاتیں۔اگرچہ انہوں نے اپنے ہی رشتے داروں کے ہاں جانا تھا۔پہلے کبھی ایسا ہوا ہی نہیں تھا کہ حویلی سے باہر جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔کیا شعیب اور زبیدہ کو حویلی میں لانا ہوگا؟کیا وہ مان جائیں گے؟اگر وہ مان گئے اور حویلی میں آ گئے تو کیا وہ پھر بھی حویلی کی روایات کو برقرار رکھ پائے گا؟شعیب اگر اپنی بیوی کو کہیں لے جانا چاہے تو کیا وہ اسے روک پائے گا؟کیا اس طرح اس کی اپنے داماد کے ساتھ براہ راست مخالفت نہ شروع ہو جائے گی۔۔یا پھر اسے اپنا آپ تج کر شعیب کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔کیسی غلطی کر گیا وہ؟اگر وہ حویلی میں آنے کے بارے میں نہ مانا تو پھر؟فرح اب اس کی بیٹی ہی نہیں شعیب کی بیوی بھی ہے۔وہ دسترس جو کل دوپہر سے پہلے اسے حاصل تھی اب نہیں ہے۔اسے زبیدہ اور شعیب کے سامنے ہر حال میں سرنگوں ہونا پڑے گا۔اگر نہیں ہوتا تو پھر معاملات زیادہ خراب ہونے کا قوی امکان تھا۔لیکن یہ ظہیر شاہ نے بھی تو حویلی سے جا کر اچھا نہیں کیا۔۔۔یہ تو سیدھے سیدھے فرار کا راستہ ہے۔۔اس کی ضد اور انا ہار گئی اور نادیہ کا صبر جیت گیا۔پہلے تو وہ فقط اس کی بھتیجی ہی تھی اور اسے اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے ظہیر شاہ سے شادی کے بندھن میں باندھنا چاہتا تھا۔اب جبکہ وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی تھی تو اسے حاصل کچھ

بھی نہ ہوا۔ وہ خالی ہاتھ رہ گیا۔ نادیہ زیادہ مضبوط ہوگئی بظاہر اس کا سب کچھ کھو گیا تھا لیکن اس کا ذرا نقصان نہیں ہوا اور وہ زیادہ مضبوط ہوگئی۔ پیر سائیں اپنی سوچوں میں گھرا ہوا مردان خانے میں اپنے مخصوص کمرہ خاص میں جا پہنچا۔ صحن میں مریدین کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ دیوان پوری طرح جانتا تھا کہ پیر سائیں کس حال میں ہیں۔ وہ اس کے پاس جا پہنچا۔

''سرکار۔! ہنوز وہی حال ہے۔۔۔ ڈرائیور کا فون بند ہے۔۔ اور وہ پتہ نہیں کہاں پر ہیں؟''

''اب کیا ہوسکتا ہے۔؟'' پیر سائیں نے کہا تو اس کے لہجے میں شکستہ پن نمایاں تھا۔ دیوان چونک گیا اور بولا۔

''سرکار۔! لاہور ائیر پورٹ سے لندن جانے والی فلائیٹ کو روکا جا سکتا ہے۔ ظہیر شاہ کو ملک سے باہر جانے سے بھی روکا جا سکتا ہے۔ اتنے تعلقات تو ہیں کہ۔۔۔''

''نہیں۔! دیوان، میں بازی ہار گیا ہوں۔ جو کچھ میں نے سوچا تھا، وہ نہیں ہو پایا۔ ظہیر شاہ نے یوں حویلی سے جا کر بہت کچھ غلط کر دیا ہے۔ آج شام تک اگر وہ واپس نہیں آتا تو پھر ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔''

''آپ ایسی مایوسی والی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کسی سے کہتا ہوں۔ وہ ائیر پورٹ سے ظہیر کو نہیں جانے دیں گے۔۔'' دیوان نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔۔ شام تک ظہیر شاہ کو یہاں ہونا چاہئے۔'' یہ کہہ کر اس نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا دی۔

''سرکار، میں پوری کوشش کرتا ہوں۔'' دیوان نے کہا اور الٹے قدموں باہر کی جانب چلا گیا۔ جبکہ پیر سائیں اپنی سوچوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

نادیہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ ظہیر شاہ حویلی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اسے احساس تو تھا کہ اب اس کی اپنے شوہر کے ساتھ وابستگی تو نہیں رہے گی جو ہونی چاہیے۔ کیونکہ اس تعلق کی توہین خود اس کے شوہر نے کی تھی۔ وہ تو سپردگی کے لیے تیار تھی۔ اس نے اپنی ہار کو ذہنی طور پر تسلیم کر کے اپنا وجود حالات کے دوش پر چھوڑ دیا تھا۔ تعلق میں کوئی خوبصورت اور مضبوطی لانے سے پہلے ہی اس میں ضد اور انا کا زہر گھول دیا گیا تھا۔ مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ یہ اسے پوری طرح احساس تھا کہ اس کے ظہیر کے درمیان ایسا ہی اجنبیت والا تعلق ہی ہوگا۔ ہاں یہ اس کے شعور میں نہیں تھا کہ وہ تعلق کے بندھن میں باندھ کر یوں اجنبی بن جائے گا۔ وہ تو چاہتی تھی کہ ظہیر شاہ یہاں رہے۔ وہ یہاں رہتا تو ہی معاملات میں ہلچل رہتی۔ اب تو جمود طاری ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی میں اور حالات کے بہاؤ میں۔ اسے اپنا آپ بہت عجیب سا لگ رہا تھا کہ چلا تو گیا ہے ظہیر شاہ۔ لیکن پوچھا اس سے جا رہا ہے کہ وہ کیوں چلا گیا؟ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ خود پر ان حالات میں ترس کھائے، بے حس ہو جائے یا پھر اپنی مظلومیت کا احساس دلائے۔ اسے واویلا کرنا چاہیے یا پھر خاموش ہو جانا چاہئے۔ وہ ظہیر شاہ کے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی مسلسل یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ دادی اماں اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اماں بی چلتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔ چند لمحے ان کے درمیان خاموشی رہی جسے نادیہ ہی نے تلخ لہجے میں توڑا۔

''آپ شاید پھر یہ پوچھنے آئی ہیں کہ ظہیر شاہ کیوں چلا گیا؟''

''نہیں، میں سمجھتی ہوں کہ وہ کیوں چلا گیا۔ اسے آج نہیں تو کل چلے ہی جانا تھا۔ لیکن اتنی جلدی چلے جائے گا۔ یہ امید نہیں تھی۔'' اماں بی نے نجانے کس جذبے کے تحت خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟۔'' نادیہ نے سوچتے ہوئے پوچھا تو دادی اماں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ اس لیے نادیہ کہ وہ اب حویلی کی چھوٹی سی دنیا تک محدود نہیں رہا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں جا چکا ہے جہاں سے یہ حویلی بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے یہاں کبھی رہنا ہی نہیں تھا۔ کیا صرف تمہی اس حویلی میں گھٹن محسوس کرتی ہو؟ وہ بھی یہاں کچھ ایسا ہی احساس رکھتا تھا۔ اسے کوئی بہانہ چاہئے تھا، وہ اسے مل گیا۔ اب وہ تمام تر قصور تمہی میں نکالیں گے۔''

''یہ تو ہمارے اس معاشرے میں عورت کا مقدر ہے کہ تمام تر الزامات اسی پر لگتے ہیں۔ مرد صاف بچ جاتا ہے۔ لیکن شاید مرد کو یہ نہیں معلوم، گھٹن جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر سانس لینا مشکل ہوتا ہے۔ عورت کا سانس رک گیا تو مرد کی دنیا ویران ہو جائے گی۔''

''یہ بات اگر مرد کی سمجھ میں آجائے تو گھٹن ہی نہ ہو۔ ہمارے اردگرد ساری خوبصورتی عورت کی وجہ سے ہے۔ اگر عورت کی سوچ میں زہر بھر دیا گیا تو سارے منظر زہر آلود ہو سکتے ہیں۔ یہی بات میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں بیٹی۔! باہر کے منظر، حالات اور وقت جیسا بھی آجائے۔ تم اپنی سوچوں کو زہر آلود مت ہونے دینا، یوں تمہاری زندگی سہل ہو جائے گی۔'' دادی اماں نے بہت پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو خیالوں میں کھوئے ہوئے بولی۔

''میں جانتی ہوں دادی اماں۔! میں نے اختر رومانوی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانی ذہن میں پڑی ہوئی سوچ ہی اس کی زندگی کی راہیں متعین کرتی ہے۔ سوچ اگر منفی ہے تو انگلی کی پور تک اعمال منفی ہو جاتے ہیں۔ اور مثبت ہوں تو پھر دنیا کے سارے منظروں میں خوبصورت رنگ بھرے جا سکتے ہیں۔ تبھی عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ کہ اس کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ ہیں۔''

''تم اختر رومانوی کیوں کہتی ہو۔۔۔ تم شعیب بھی تو کہہ سکتی ہو۔۔؟'' دادی اماں نے نجانے کس سوچ کے تحت اس سے پوچھا

''میری زندگی میں اختر رومانوی آیا تھا۔ جس نے نہ صرف میری سوچ پر بلکہ میری زندگی پر بھرپور اثرات ڈالے ہیں۔ اس کے دیئے ہوئے خیال اور سوچیں ہی نے میری زندگی کی راہیں متعین کر دی ہیں۔ میں شاید زندگی کو اس نگاہ سے نہ دیکھ سکتی، جیسا مجھے دیکھنا چاہئے تھا۔ میرے اندر بغاوت آگ بن کر مجھے جلا دیتی۔ لیکن بغاوت کی اسی آگ کو اس نے میری قوت بنا دیا ہے۔ میں اب سمجھ سکتی ہوں کہ زندگی کا سامنا کیسے کرنا ہے۔ جبکہ شعیب۔۔۔ وہ میرے لیے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔۔ وہ صرف ایک ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جس کے سارے خواب اس کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے وہ میرے لیے لڑتا۔ لیکن جہاں اختر رومانوی آباد ہے۔ وہاں شعیب بسیرا نہیں کر سکتا۔۔۔''

''کیا تم شعیب سے نفرت کرتی ہو۔۔۔؟'' اماں بی نے مزید کرید کی۔

''نہ نفرت نہ محبت۔! وہ میرے لیے محض ایک اجنبی ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''مگر اب تو وہ ہمارے خاندان کا حصہ بن گیا ہے۔ وہ اس حویلی کا داماد ہے۔ اس سے ناطہ جڑ گیا ہے تو تعلق بھی رکھنا پڑے گا۔ اب

کیسے۔۔'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ نادیہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

'' وہ اس حویلی کا نہیں، پیر سائیں کا داماد بنا ہے۔۔ میرا اس سے کیا تعلق۔۔اور مجھے ضرورت بھی نہیں ہے اس سے تعلق رکھنے کی۔۔ میں نے کہا نا، وہ ایک ماں کا بیٹا ہے۔ جس کے سارے خواب اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ میرے ساتھ تعلق رکھنا چاہتا، اس کی چاہت میں ہوتی تو وہ احتجاج کرتا۔ انکار کر دیتا۔۔۔ وہ میرے لیے لڑتا۔ اس نے تو خاموشی سے میری بات مان لی۔ جیسے کہ وہ اسی کے انتظار میں ہو۔ اس نے ان سارے تعلقات کو ماں کے رشتے سے دیکھا۔ کہاں وہ پیر سائیں کے ساتھ اپنی مخالفت رکھتا تھا اور کہاں میرے ذرا سے کہنے پر اس کا داماد بن گیا۔ نہیں دادی اماں۔ ! میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور میں اس کی کسی خواہش کی پابند نہیں ہوں۔''

'' لیکن ظہیر شاہ کے ساتھ بھی تیرا کوئی تعلق نہیں بن سکا۔ وہ تجھے توہین آمیز سلوک کے ساتھ ٹھکرا کر چلا گیا۔ کیا تمہارا اس کے ساتھ تعلق بن پائے گا۔۔'' اماں بی نے ایک دوسرے پہلو سے اسے کریدا۔

'' میرا نام اب ظہیر شاہ کے ساتھ جڑ گیا ہے۔۔ وہ جیسا بھی ہے۔ اب میرے سر اک سائیں ہے۔ وہ مجھے جیسے رکھے، وہ مجھے قبول ہے۔ توہین کرے یا عزت دے۔۔'' نادیہ نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا تو دادی اماں خاموش ہو گئیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی پوتی کی حالت زار پر رو دے لیکن وہ نادیہ کو کمزور نہیں دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اس کے اندر جو اس وقت جینے کا حوصلہ تھا وہ اسے قائم و دائم رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

'' تو بتا۔ ! میری بیٹی، اب تو کیسے رہنا چاہتی ہے۔ اب مجھے دلاور شاہ سے لڑنا بھی پڑا تو میں لڑوں گی''

'' جیسے پہلے رہ رہی ہوں ویسے ہی رہوں گی۔۔ آپ میرے لیے کیوں پیر سائیں سے لڑیں گی۔۔؟'' نادیہ نے حیرت سے کہا۔

'' ظہیر شاہ کے بارے میں تم جو بھی چاہتی ہو۔ مجھے بتاؤ۔۔ اب میں منواؤں گی۔۔'' دادی اماں نے پورے خلوص سے کہا۔

'' نہیں۔ ! میں کچھ نہیں چاہتی۔ اب فیصلہ میں نے اپنی قسمت پر چھوڑ دیا ہے، جو ہونا ہے سو ہو۔۔ میں اب اپنی قسمت کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔۔'' نادیہ نے دکھی لہجے میں آہستگی سے مسکراتے ہوئے کہا تو دادی اماں خاموش ہو گئیں۔ کافی وقت یونہی گذر گیا تو نادیہ اٹھی اور اس نے اپنا عروسی جوڑا اٹھایا۔ اسے تہہ لگا کر ایک ڈبے میں بند کر دیا۔ سارے زیورات بھی اٹھا کر انہیں ان کے ڈبوں میں رکھا۔ اس کے علاوہ یہاں اس کمرے میں اس کا کچھ نہیں تھا۔ اس نے وہ عروسی جوڑا اور زیوارت دادی اماں کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ '' یہ پیر سائیں کے گھر کی امانت ہیں، آپ انہیں دے دیجے گا۔۔ میں اب اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔''

اس کے یوں کہنے پر دادی اماں ایک بار پوری جان سے لرز گئی، پھر گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ '' یہ ٹھیک ہے کہ تم اس حویلی ہی میں رہو گی۔ ایک ہی چھت کے نیچے۔۔ مگر یہاں رہوں گی۔۔ تو انہیں یہ احساس تو ہو گا نا کہ ان کی بہو ان کے ساتھ ہے۔۔''

'' ظہیر شاہ نے میرے ساتھ نکاح تو کیا، لیکن ایک بیوی کا مان مجھے نہ دے سکا۔ میں اب کس ناطے انہیں اپنا سسرال تسلیم کر لوں۔۔ میں اکیلی تھی۔۔۔ اکیلی ہوں۔۔۔ اور اکیلی رہوں گی۔۔۔ میں انتظار کروں گی کہ ظہیر شاہ کب واپس لوٹتا ہے۔۔ پھر دیکھوں گی، میرا فیصلہ کیا ہو

گا۔'' نادیہ نے کہا اور اٹھ گئی۔ وہ چند لمحے اس کمرے میں کھڑی گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ پھر باہر کی جانب چل دی۔ دادی اماں اسے غور سے دیکھتی رہی اسے روک نہیں سکی۔

اپنے کمرے میں آتے ہی اسے سکون کا احساس ہوا۔ تاجاں مائی نے کمرے کو یوں صاف کر کے چمکا دیا ہوا تھا کہ جیسے نادیہ ابھی اٹھ کر وہاں سے گئی ہو۔ وہ اپنے کمرے میں چند لمحے سکون سے کھڑی رہی پھر اس کھڑکی سے آ گئی جہاں سے دور تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس منظر میں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا تھا، ویسے ہی رنگ تھے اور ویسے ہی نقش۔ وہ چند لمحوں تک اسی منظر میں کھوئی کسی تبدیلی کا سراغ لگاتی رہی لیکن اسے ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ شاید وہ مزید کچھ دیر کھڑی رہتی تاہم تاجاں کے کمرے میں آجانے سے وہ کھڑکی سے پلٹ کر صوفے پر آن بیٹھی۔

''بی بی سئین۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔۔ میں ناشتہ لاؤں آپ کے لیے۔۔''

''ہاں۔! میں آج بھرپور ناشتہ کروں گی۔ لیکن میں پہلے نہالوں۔۔'' نادیہ نے زندگی سے بھرپور لہجے میں کہا اور اٹھ گئی۔ تاجاں کمرے سے پلٹنے لگی تو اس نے حکم صادر کر دیا۔'' تاجاں مائی۔! آج سے تم صرف میرے ساتھ رہو گی۔ اور میری معاملات دیکھوں گی۔۔ حویلی سے تمہیں اب کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔''

''جی بی بی سئین۔'' تاجاں مائی نے آہستگی سے کہا اور باہر چلی گئی۔ نادیہ نے ایک طویل سانس لی اور زندگی کے اک نئے دور کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل گئی تھی اور دن تھا کہ تیزی سے گذرتا چلا جا رہا تھا۔فرح کی بے چینی حد سے زیادہ بڑھنے لگی تھی۔وہ دن کا پہلا پہر تو سوئی رہی تھی جب بیدار ہوئی تو گھر میں سکوت تھا۔وہی سکوت جو حویلی میں ہوا کرتا تھا۔وہ کمرے میں تنہا تھی۔اس کی زندگی کی پہلی صبح یوں کسی ایسے کمرے میں ہوئی تھی جو حویلی میں نہیں تھا۔ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔پھر گذرتے لمحوں میں اس نے خود کو یقین دلایا کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور اپنے میاں کے کمرے میں ہے۔لیکن وہ کہاں ہے؟اسی سوال نے اسے بیڈ پر سے اٹھایا۔وہ کمرے سے باہر آئی۔وہاں بھی وہی حویلی والا سناٹا تھا۔وہ ڈرائینگ روم میں آئی تو وہاں زبیدہ پھوپھو سکون سے بیٹھی تسبیح کر رہی تھی۔وہ ظہر کی نماز کے بعد وہیں قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔جیسے ہی س کی نگاہ فرح پر پڑی تو بولی۔

''آؤ بیٹا۔!لگتا ہے خوب سوئی ہو۔''

''جی،بڑی بھرپور نیند آئی ہے۔''اس نے حیا بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا،تم فریش ہو کر آؤ۔میں تمہارے لیے ناشتہ بنواتی ہوں۔''زبیدہ نے کہا۔

''وہ شعیب کہاں ہیں۔؟انہوں نے۔۔فرح نے شرمندہ لہجے میں ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو آفس گیا ہے۔۔ابھی کچھ دیر میں آجائے گا۔۔''زبیدہ نے اسے بتایا تو وہ چونک گئی۔

''پھوپھو۔!مجھے جگا دیتے۔۔انہیں تیار ہونے میں۔۔''وہ پھر کہتے کہتے رک گئی تو زبیدہ نے سمجھایا۔

''کوئی بات نہیں۔۔تم ایسے کرو۔۔فریش ہو جاؤ،ناشتہ کرو اور اس کے آنے سے پہلے پہلے تیار ہو جاؤ۔ہو سکتا ہے حویلی سے بھی تمہیں لینے کے لیے کوئی آجائے۔۔''

''جی بہتر۔۔''اس نے مزید کوئی بات نہیں کی،فوراً ہی مان گئی۔پھر وہ تیار ہو کر بھی بیٹھ گئی اور سہ پہر کا وقت ہو گیا۔نہ تو شعیب آیا اور نہ ہی کوئی حویلی سے ان کے ہاں اسے لینے کے لیے آیا۔وہ اپنے کمرے میں بیٹھی یونہی اوٹ پٹانگ سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔تبھی اسے لگا جیسے باہر گاڑی رکی ہے اور شعیب آگیا ہے۔وہ جلدی سے اٹھی اور ڈرائنگ روم میں گئی۔وہ آچکا تھا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔اسے دیکھتے ہی بولا۔

''سوری مجھے دیر ہوگئی۔۔آج یکدم ہی کئی کام نکل آئے تھے۔۔امی کہاں ہیں؟''

''وہ۔۔۔اپنے کمرے میں ہیں۔۔بلاؤں انہیں۔''وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''نہیں،وہ خود ہی یہاں آجائیں گی،اگر نہیں آنا ہوا تو۔۔۔''اس نے کہا تو ملازم پانی کا گلاس لے کر آگیا۔تبھی فرح کو خیال آیا یہ کام تو اسے خود کرنے چاہیں تھے۔اس لیے بولی۔

''آپ کھانا کھائیں گے۔۔مطلب،اتنی دیر ہوگئی۔۔''

''میں نے کھانا کھا لیا ہوا ہے،بس ایک کپ چائے پیوں گا۔لیکن پہلے میں ذرا چینج کر لوں۔۔''شعیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔تو وہ بھی اٹھ گئی۔تب شعیب نے پوچھا''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''میں آپ کے لیے چائے بنالاؤں۔''

''نہیں۔وہ ملازم بنالائے گا۔تم جاؤ کمرے میں۔۔میں ذرا امی سے مل کر آتا ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے''اس نے دھیمے سے کہا اور کمرے کی جانب چل دی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں زبیدہ کے کمرے میں اس کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''آج آفس میں کوئی ضروری کام تھا۔''زبیدہ نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں۔!بہت ضروری تھے۔ورنہ شاید میں نہ جاتا۔۔انہیں ہی نمٹاتے ہوئے اتنی دیر ہوگئی۔دراصل مجھے کہیں انکوائری پر جانا تھا۔پہلے سے طے تھا،میرے نہ ہونے سے بہت سارے لوگ ڈسٹرب ہوتے''

''چلو،وہ تو ہوگیا۔اب تم تیار ہو جاؤ،تمہیں حویلی جانا ہوگا فرح کے ساتھ۔''زبیدہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا وہاں سے فرح کو لینے کوئی نہیں آیا۔''شعیب نے پوچھا۔

''نہیں،پتہ نہیں کیا بات ہے۔''زبیدہ نے تشویش سے کہا۔

''کوئی فون۔۔؟''اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''فرح نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

''وہ لوگ جنہیں اپنی بیٹی کا اتنا بھی احساس نہیں،وہاں ہمیں کیا کرنے جانا ہے۔۔وہ جب آئیں گے تو لے جائیں گے۔اگر انہیں فرصت نہیں تو یہاں کون فارغ بیٹھا ہوا ہے۔''اس نے کافی حد تک تلخی سے کہا۔

''ہوسکتا ہے بیٹا،ان کے پاس کوئی ایسا معاملہ ہوگیا ہو جس کی وجہ سے۔۔۔۔''زبیدہ نے کہنا چاہا تو وہ پھر تلخی ہی سے بولا۔

''نہیں امی،دل نہیں مانتا۔ایسا ہی کوئی گھمبیر مسئلہ ہوتا تو اب تک ہمیں ضرور اطلاع مل چکی ہوتی۔اور اگر آپ کو حویلی والوں سے ہمدردی ہے تو آپ فون کرلیتیں۔یہ فرح فون کرلیتی۔۔''

''اب تم اپنی ضد نہ کوئی بنالینا۔جب ان سے رشتہ بنالیا ہے تو پھر اس رشتے کو نبھانا تو ہے۔''زبیدہ نے ایک کمزور سی دلیل کا سہارا لیا۔

''امی۔!یہ رشتہ صرف ہم ہی نے نبھانا ہے۔۔صاف بات ہے۔وہ آئیں اور فرح کو لے جائیں۔بات ختم۔اس میں اتنی الجھن والی بات کیا ہے۔''اس نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''بات تمہاری ٹھیک ہے،لیکن یہ حالات،انہیں بھی تو دیکھنا ہے۔''زبیدہ نے پھر ایک نئی مگر کمزور دلیل دی۔

''امی۔!آپ حویلی والوں کی بے جا وکالت کر رہی ہیں۔میں آج آپ کو صاف بات بتادوں۔جن حالات میں میری شادی ہوئی۔وہ ایک شرط کا شاخسانہ ہے۔میں نے قبول کی۔لیکن اب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں حویلی والوں کا دست نگر ہو کر اپنی انا گنوا دوں۔آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بیٹے نے ہر طرح کی مزدوری تو کی ہے لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔یہی انا میرا سرمایہ ہے۔اور میں اسے کسی قیمت پر گنوانا نہیں

چاہتا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا تو فرح چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ زبیدہ بول پڑی۔

''اس میں انا کہاں سے آ گئی؟'' زبیدہ نے پھر بات کو بڑھانا چاہا۔

''دیکھیں امی۔! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ کے بھائی دلاور شاہ نے کہا ہے کہ آپ یہ جو کچھ بھی کر رہی ہیں، جائیداد میں حصہ لینے کے خاطر کر رہی ہیں۔ آپ کا اور آپ کے بھائی کا معاملہ کیا ہے اور کیا ہوگا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ پر یہ انگلی اٹھائے کہ میں بھی حویلی سے کچھ حاصل کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ ناطہ جوڑے ہوئے ہوں۔ آج میں آپ پر واضح کر دوں کہ میں کبھی بھی حویلی نہیں جاؤں گا۔ آپ نے اپنا تعلق رکھنا ہے۔ آپ جائیں، میں آپ کو کبھی نہیں روکوں گا۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔'' شعیب نے کہا اور اٹھ گیا۔ زبیدہ اسے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائی۔ زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ بس وہ اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی۔ اور وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ وہ چونکی اس وقت جب فرح کی سسکی کمرے میں گونجی۔

''یہ کیا ہو گیا پھوپھو۔!'' وہ روہانسا ہوتے ہوئے بھیگے لہجے میں بولی تو زبیدہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

''تو بھی اچھی طرح جانتی ہے فرح۔ حویلی والوں کو اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس اک ہی خیال تو کم از کم تیرے بارے میں سوچ لیتے۔ تم ان کی بیٹی، تمہیں لینے کے لیے اب تک کسی کو آ جانا چاہئے تھا۔ کیوں نہیں آیا کوئی۔؟''

''آنا تو چاہیے تھا، مگر پتہ نہیں کیوں۔'' وہ حیرت اور مایوسی کے ملے جلے لہجے میں بولی۔

''ویسے تمہیں ہی فون کر لینا چاہئے تھا۔'' زبیدہ نے تاسف سے کہا۔

''اب کیا ہو سکتا ہے۔؟'' فرح نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ تبھی زبیدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میری بیٹی۔! شعیب جتنا نرم ہے اتنا سخت بھی ہے۔ نرمی پر آئے تو بہت کچھ برداشت کر جاتا ہے۔ جیسے کہ میرے بارے میں اس نے سنا اور ایک لفظ کہے بغیر سب کچھ برداشت کر گیا۔ ایک ذرا بھی ماتھے پر شکن نہیں ڈالی۔ اس کے رویے میں بھی تبدیلی نہیں آئی۔ مطلب اس نے میرے ماضی کو کھلے دل سے تسلیم کر لیا۔ لیکن اب اگر اس نے حویلی والوں کے بارے میں، ان کے رویے پر اپنا خیال بتایا ہے تو اب وہ اسی پر قائم رہے گا۔۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اس لیے تم اسے ایسی بات پر کچھ مت کہنا کیونکہ وہ مزید سخت ہوتا چلا جائے گا۔ ممکن ہے وقت کے ساتھ اس میں نرمی آ جائے۔''

''جی پھوپھو۔! میں سمجھ گئی، لیکن حویلی، فون کریں نا آپ۔۔''

''اب فون کیا کرنا، ہم دونوں ہی چلتی ہیں۔ شام تک لوٹ آئیں گی۔۔ میں خود جا کر معلوم کروں گی کہ بات کیا ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔''

''مگر وہ ان کی اجازت۔۔۔'' فرح نے لرزتے ہوئے یوں پوچھا جیسے کہ وہ کسی شکنجے میں آ چکی ہو۔ اسے کون سا ان باتوں کا تجربہ تھا۔ یا پھر احساس۔۔ جس کے تحت اسے اپنی ہی کسی سوچ کا سہارا مل جاتا۔

''تم جاؤ، اسے بتا دو۔ پھر جو کہے اس پر بحث مت کرنا۔'' زبیدہ نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو فرح اٹھ گئی۔ وہ اندر سے بری طرح

کانپ رہی تھی۔شعیب کا رویہ جہاں اسے دہلائے دے رہا تھا۔وہاں حویلی والوں کا اسے نظرانداز کر دینا بھی خوف زدہ کر رہا تھا۔یہی سوچ اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی کہ وہ کہیں اکیلی تو نہیں ہوگئی۔حویلی کے شجر سے گرا ہوا پھول جیسے زندگی کی شاہراہ پر پھینک دیا گیا ہو۔اس کی ذات ایک ایسی کشتی کی مانند ہوگئی ہو جیسے ناخدا کے بغیر سمندر میں دھکیل دیا گیا ہو۔وہ دبے قدموں جا کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔اس کی آمد کا احساس کر کے شعیب نے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں۔۔۔میں۔۔۔اور پھوپھو۔حویلی۔۔ہو آئیں۔''

''بالکل۔!تم جب چاہے اور جس وقت چاہے جا سکتی ہو۔میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔وہاں جانے کے لیئے مجھ سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔''اس نے خوشدلی سے کہا۔

''آپ کہیں ناراض تو نہیں؟''اس نے لرزتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔۔دیکھو فرح۔اعزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔جنہیں ہم اپنا کہتے ہیں تو انہیں فقط لفظوں میں اپنا نہیں کہنا چاہئے۔بلکہ اپنے عمل سے ثابت کرنا چاہیے۔اب حویلی والوں کا رویہ تمہارے سامنے ہے۔خود بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''آپ کا فیصلہ ٹھیک ہے۔اگر آپ کہیں کہ میں نہ جاؤں تو نہیں جاتی۔۔''اس نے کافی حد تک اعتماد پکڑتے ہوئے کہا۔

''فرح تم کبھی بھی خود کو ڈانواں ڈول محسوس نہیں کرنا۔کبھی بھی یہ مت سمجھنا کہ اگر حویلی والوں نے تمہیں نظرانداز کر دیا ہے تو میں تمہیں اکیلا چھوڑ دوں گا۔دیکھو، تم میری عزت ہو، میں ہی تمہیں مان نہیں دوں گا تو پھر کون دے گا؟رات میں نے یونہی لفاظی نہیں کی، جو کہا اس پر کاربند رہوں گا۔''شعیب نے کہا تو فرح کے آنسو نکل آئے۔وہ جذبات میں مغلوب لہجے میں بولی۔

''میرا مان تو آپ ہی ہیں۔۔''

''ڈونٹ وری۔۔تم جاؤ امی کے ساتھ۔۔''اس نے پیار سے کہا تو وہ اٹھ کر تیار ہونے لگی۔وہ بہت حد تک سنبھل گئی تھی۔اسے شعیب کا رویہ بہت اچھا لگا۔یوں جیسے تپتی دوپہر میں کوئی سائبان میسر آ گیا ہو۔اسے زندگی کا رخ ہی کچھ اور طرح کا لگا جیسے دھوپ چھاؤں میں زندگی کا حسن اس پر عیاں ہونے لگا ہو۔نادیہ کی وہ باتیں جو کبھی اسے اوٹ پٹانگ سی لگتی تھیں۔کچھ کچھ اس کی سمجھ آنے لگی تھی۔وہ جو دنیا کے متضاد رویے کی بات کیا کرتی تھی۔تب اسے معلوم ہی نہیں تھا رویہ کیا ہوتا ہے اور پھر اس پر متضاد رویہ۔اب اسے احساس ہو گیا تھا۔

شام ڈھلنے سے پہلے فرح اپنی پھوپھو زبیدہ کے ساتھ حویلی پہنچ گئی۔شعیب کا ڈرائیور انہیں پورچ تک لے آیا تو انہوں نے وہیں سے اسے واپس بھجوا دیا۔حویلی میں داخل ہوتے ہی انہیں حویلی کا سناٹا کہیں گہرا لگا۔وہ دونوں چلتی ہوئی دادی اماں کے کمرے میں گئیں۔وہ افسردہ سی اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی نجانے کن سوچوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔انہیں دیکھ کر یکبارگی وہ کھل اٹھی۔پھر اٹھ کر انہیں گلے لگایا تو آنسو روک ہی نہ سکی۔

''اماں بی کیا ہوا۔بتائیں تو۔۔خیریت تو ہے۔''زبیدہ نے چونکتے ہوئے کہا تو فرح بھی اپنے تیئں دہل گئی۔

''بیٹھو۔!''اماں بی نے انہیں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔پھر ملازمہ کو بلانے کے لیئے گھنٹی دے دی۔

''اماں بی، سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا۔۔امی کہاں ہیں۔۔؟'' فرح نے پوچھا تو دادی اماں نے کھوئے لہجے میں کہا

''پتہ نہیں ٹھیک ہے یا نہیں۔۔۔تمہاری امی کمرے ہی میں ہوں گی۔۔میں اسے یہیں بلوا لیتی ہوں۔''

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ملازمہ اندر آ گئی۔وہ فرح بی بی سے ملی، زبیدہ سے حال احوال پوچھا اور دادی اماں کا حکم پا کر واپس الٹے قدموں چلی گئی۔

''اماں کچھ تو ہے جو فرح کو لینے کوئی۔۔۔'' زبیدہ نے کہنا چاہا تو دادی اماں نے کہا۔

''ظہیر شاہ رات ہی کسی وقت حویلی سے چلا گیا۔پتہ چلا ہے کہ واپس لندن چلا گیا۔۔دلاور شاہ نے اسے روکنے کی بھی کوشش کی۔لیکن وہ پاکستان سے پرواز کر گیا ہے۔ابھی کچھ دیر پہلے ڈرائیور واپس آ گیا ہے۔ساری تفصیل اسی نے بتائی ہے۔''

''اوہ۔!بے چاری نادیہ۔میں پہلے ہی کہتی تھی اسے۔۔۔اس حویلی سے اسے کبھی وفا نہیں ملے گی۔یتیم بچی ہے نا۔اس لیے اس کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔ہر کوئی اس پر ظلم کرنا چاہتا ہے۔اور کرتا چلا جا رہا ہے۔کہاں ہے وہ؟'' زبیدہ نے ایک دم سے تلخ ہوتے ہوئے کہا۔

''اپنے کمرے میں ہی ہو گی۔'' اماں بی نے دھیرے سے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اٹھ گئی۔

''میں معلوم تو کروں وہ بے چاری کس حال میں ہے۔بہت ظلم کیا ہے حویلی والوں نے اس کے ساتھ۔۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔جبکہ فرح نجانے کن سوچوں کے تحت لرز کر رہ گئی۔اسے لگ رہا تھا کہ جیسے صحرا بالکل اس کے قریب آ گیا ہے۔تپتی ہوئی لو اسے ابھی سے جھلسانے لگی ہے۔نادیہ کی زندگی اگر تلخ ہو گئی ہے تو پھر اس کی زندگی کو بھی زہر آلود ہونے سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔یہ مکافاتِ عمل ہو یا کیا ہو وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

☆☆☆

گہری رات کا سناٹا مزید گہرا ہو گیا تھا۔آخری دنوں کا چاند ابھی تک نہیں نکلا تھا۔نادیہ اندھیرے میں ٹمٹماتے ہوئے برقی قمقموں کو دیکھ رہی تھی۔حویلی سے چھن کر جانے والی روشنی میں ذرا فاصلے تک منظر سسک رہے تھے۔اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں اور اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں کہ اندھیرے انہیں نگل نہ جائے۔وہ اپنے آپ سے فرار حاصل کر کے دنیا سے بے خود ہو کر سو گئی تھی۔شاید وہ تنہا ہوتی تو اتنی چبھن نہ ہوتی۔جتنا ارد گرد کی باتوں نے اسے دکھ دیا تھا۔ظہیر شاہ تو پہلے ہی اس کی زندگی میں نہیں تھا۔اب اگر وہ لندن چلا گیا ہے تو اس کی زندگی میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔مگر ایسا کر کے اس نے نادیہ کو کم مائیگی کا احساس ضرور دلا دیا تھا۔اس نے بڑے مان اور حق سے ظہیر شاہ کے سامنے شرط رکھی تھی۔اگر اس کے دل میں نادیہ کے لیے ذرا سا پیار یا تھوڑی سی ہمدردی بھی ہو گی نا تو وہ ضرور اس کی بات پر غور کرتا۔اگر اس کے بس میں نہ ہوتا تو اچھی طرح سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔اس کی انا پر ذرا سی ٹھیس کیا آتی وہ پوری طرح کھل گیا۔اس کے اندر کا سخت گیر انسان جو پیر سائیں کا جانشین تھا۔ایک دم سے بول پڑا۔اس نے اپنا آپ ظاہر کر دیا کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔وہ جتنا بھی تعلیم یافتہ ہو گیا تھا مگر اس کے ضمیر میں وہی حاکمانہ انداز تھا۔ضد اس کی گھٹی میں تھی اور اپنی عظمت کو منوانا ان کی فطرت بن گئی ہوئی۔انہوں نے روایات کے سہارے تو خود کو بنا سنوار لیا تھا لیکن زندگی کی حقیقت اور فطرت

کے تقاضوں کو نہیں اپنایا تھا۔ انہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ جو خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے وہی خون اس کی رگوں میں بھی تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اس کی ذہنی رو شعیب کی جانب ہوگئی تو ایک دم جیسے اس کے پورے وجود میں سناٹا پھیل گیا۔ ویسا ہی مہیب سناٹا جو حویلی کے در و بام ہمیشہ لپٹا رہتا ہے۔ یہی سناٹا اس کی بغاوت کی بنیاد تھا۔ وہ ایک دم سے خوف زدہ ہوگئی۔ تبھی اس کے اندر سے ایک چیختی ہوئی صدا بلند ہوئی۔

''کیوں اب تم کیوں خوف زدہ ہوگئی ہو۔ یہ سناٹے تم نے خود چنے ہیں۔۔۔ اب کیوں ڈرتی ہو؟''

''میں نے۔۔؟ نہیں تو۔۔۔ میں نے کیوں یہ سناٹے چنے تھے؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیوں جھوٹ بولتی ہو۔۔ محبت خود چل کر تیرے در تک آگئی۔۔ لیکن تم نے اس کی قدر نہیں کی۔۔ شعیب تجھے لینے کے لیے حویلی میں آ گیا تھا۔۔''

''میں نے کب اسے کہا تھا کہ وہ یوں خاموشی سے سر نیہوڑے ہر حکم مان لے۔۔ وہ لڑتا میرے لیے۔ وہ مجھے لے جانے کے لیے ضد کرتا۔۔ وہ پاگل ہو جاتا میرے لیے۔۔''

''کس برتے۔۔۔ کس ناطے وہ تیرے لیے یہ سب کرتا۔۔۔ کیا تو نے اسے مان دیا۔۔۔ عزت اور احترام کے اس استھان پر رکھا، جہاں پر کھڑا ہو کر وہ پورے اعتماد کے ساتھ تمہارے لیے لڑ سکتا۔ اجنبیوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک نہیں کیا جاتا جو تو نے اس کے ساتھ کیا ہے۔۔''

اس کے اندر سے احتجاج اٹھا تو وہ لمحے اس کی نگاہوں کے سامنے آگئے جب شعیب کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ کمرے سے باہر دروازے کی درز میں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کس قدر بے بسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ وہاں بیٹھا کسی اجنبی کی طرح سب کو دیکھ رہا تھا اور جب اس نے شرط رکھی تھی تو اس کا چہرہ کس قدر سرخ ہوا تھا۔ وہ کیا تھے۔۔۔ جذبات تھے۔۔۔ یا غصہ تھا۔۔۔ کیا تھا۔۔۔

''تو نے وقت خود اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا ہے۔ تم لاہور میں اس کی تصویر دیکھنے سے لے کر اسے حقیقت میں اپنے سامنے دیکھنے تک، کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔ یہ مان لو کہ تم اپنے ہی فیصلے کے بوجھ تلے دب گئی ہو۔ اب اگر سناٹے تمہارے اندر پھیل گئے ہیں تو اس میں کسی کا قصور نہیں ہے۔ نہ حالات کا اور نہ ہی قسمت کا۔۔ تم نے اپنی خوشیاں خود دوسروں کو دے دی ہیں۔ اب تہی دامن ہو جانے کا کیا فائدہ۔ اپنی قسمت کو ریت کی مانند اپنی مٹھی سے اُڑا دیا ہے۔''

''نہیں، میں نے قربانی دی ہے۔۔'' اس نے چونکتے ہوئے سوچا۔

''غلط کہہ رہی ہو۔۔ اگر تم نے قربانی دینا ہوتی نا تو یوں تنہائی محسوس نہ کرتی۔ اپنے فیصلے پر افسوس زدہ، ماتم نہ کر رہی ہوتی۔ تم اپنے ذہن میں کچھ اور ہی لیے بیٹھی ہو۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا تم پیر سائیں سے نفرت نہیں کرتی ہو؟''

''ہاں۔۔! مجھے نفرت ہے۔۔ لیکن مجھے شعیب پر بھی غصہ ہے اور میں۔۔۔۔''

''تم خود الجھی ہوئی ہو۔۔ تمہیں اپنی ذات کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے پا رہا ہے۔ اور اگر کچھ دکھائی بھی دے رہا ہے تو تم سمجھ نہیں پا رہی ہو کہ آخر کرنا کیا ہے۔۔ اور اپنے اسی احمق پن کی وجہ سے تم اپنی بازی خود ہار گئی ہو۔ نہ تمہاری بغاوت تمہارے کسی کام آئی۔۔ اور نہ تمہاری محبت۔۔۔''

''نہیں شعیب کو مجھ سے محبت ہے۔ ورنہ وہ یوں تڑپ کر میرے لیے حویلی نہ بھاگا آتا۔۔''

''تو پھر تو نے اس کا مان کیا رکھا۔ اس کے سامنے تک نہیں گئی۔۔ اور اگر تجھے اب شعیب کی محبت کا احساس ہے تو کیا۔۔۔؟ وہ تو اب فرح کا ہو چکا۔ اب اگر تم اپنی محبت کا اظہار بھی کرو گی تو فرح کی گنہہ گار ہو گی۔ جیسے تم نے خود اپنے ہاتھوں سے سونپا ہے۔ مان لو، زندگی تمہارے دَر پر خوشیاں لے کر آئی، جیسے تم نے خود لوٹا دیا۔

''میں اگر مان بھی لوں کہ میں نے خود اپنی خوشیاں دوسروں کو سونپ دی ہیں تو پھر کیا میری زندگی کی تنہائی ختم ہو جائے گی۔۔؟''

''ختم نہیں ہو گی، لیکن سکون تو ہو جائے گا۔ اپنا قصور مان لینے میں بڑا حوصلہ چاہیے۔''

''میں کیا کروں۔؟''

''کچھ بھی نہیں، بس تسلیم کرو کہ تم نے زندگی کے تحفوں کو ٹھکرا دیا۔ جس کے لیے تنہائی تمہارے سنگ اب چلے گی۔ کرنا یہ ہوگا کہ بجائے تنہائی کو عذاب سمجھنے کے۔۔ اس تنہائی کو اپنا دوست بنا لو۔۔ کسی کے سامنے اپنا دست سوال دراز نہ کرو۔ اپنی ذات میں کھو جاؤ۔ اپنی بے وقوفی، اپنے احمق پن۔ یا جذباتی لمحوں کا شاخسانہ۔۔ جو بھی نام دو۔۔ اسے بھول جاؤ۔ اور دنیا پر یہ ظاہر کروں کہ تم نے قربانی دی۔ اس پر قائم ہو۔۔''

''یہ تو منافقت ہوئی۔۔ میں تو منافقت نہیں کر سکتی۔۔''

''نہ کرو منافقت۔ لیکن کسی پر اپنی کمزوری تو ظاہر نہ کرو۔''

''کیسے۔۔ کیسے۔۔ میں تنہائی کو اپنا دوست بنا سکتی ہوں۔''

''یہ سوچنا ہوگا۔۔۔ یہ مجبوری ہے۔ کرنا ہوگا یہ۔۔۔''

''ہاں۔! میں اپنی تنہائی کو اپنا دوست بنا لوں گی۔ گذری یادوں کے سہارے۔۔'' اس نے بے بسی سے سوچا تو کافی حد تک اس کے دل میں سکون اتر گیا۔ اسے لگا جیسے بہت بڑا بوجھ اس کے ذہن سے ہٹ گیا ہو۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بیڈ کر آن لیٹی۔ تبھی خوشبو کے آوارہ جھونکے کی مانند شعیب کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اختر رومانوی کی ہیولا جو اس کے ذہن میں بنا تھا۔ وہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ اس نے اختر کے بارے میں یہی ہیولا بنایا تھا کہ وہ پتلے سے بدن کا، عام سے لباس میں ملبوس ہوگا۔ اس کے چہرے پر بے روزگاری نے کافی حد تک شباہت کو چھین لیا ہوگا۔ ایک عام سا نوجوان جیسے زندگی سے تو کوئی حصہ نہیں لیکن زندگی کے لیے خاص جدوجہد کرنا بھی کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والے اکثر عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ لیکن جب اس نے شعیب کو دیکھا تو اس کا خیال یکسر بدل گیا۔ تصویر تو پھر تصویر ہوتی ہے۔ زندہ وجود جب سامنے آ جائے اور جذبات واحساسات کی مہکتی ہوئی پرچھائیں اس کے ساتھ خود پر اثر انداز ہو جائے تو بندے کو بے خود کر دیتی ہے۔ اس فون پر کی جانے والی طویل باتیں یاد آنے لگیں۔ گذری ہوئی راتوں کے وہ جذباتی لمحات، جن میں اپنا آپ کسی کو سونپ دینے کو جی ہمک اٹھتا ہے۔ باتوں کی آبشار میں وجود بھیگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دل بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو کرنے کے لیے دل ہی نہیں چاہتا۔ ہوا کے دوش پر بہہ جانے کو جی چاہتا ہے اور بدن سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی مہک بالکل کچی مٹی پر پانی چھڑکنے جیسی ہو جاتی ہے۔ جس سے بے خود ہو جانا اچھا لگتا ہے۔ وہ لمحے

اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے گرد منڈلانے لگے۔ جیسے پرندے کسی سرسبز درخت پر ایک کے بعد ایک آکر بیٹھنے لگتے ہیں۔ تبھی ان گذرے لمحوں نے اس کے احساسات اور جذبات میں ہلچل مچادی۔ لیکن اس باران لمحات کی خوشبو تو پھیلی مگر اس میں ہجر کی وہ ٹیس بھی شامل تھی جس نے اسے بے قابو کر دیا۔ مایوسی کی لہر پورے وجود میں زہر بن کر پھیلنے کو تیار ہو بیٹھی۔ کھو دینے کا احساس نے اسے پوری طرح جکڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ تبھی وہ چونک گئی۔ زندگی کی راہ پر اپنے فیصلے کا زادراہ لے کر ابھی تو وہ محض ایک قدم ہی چلی تھی کہ ہانپ کر بیٹھ گئی۔ کیا وہ روز اسی طرح خود جنگ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ سارا دن خود کو سمیٹنے اور رات بکھرتے گذرے گی۔؟ وہ تو کسی منزل تک پہنچنے سے قبل ہی اپنا وجود ریزہ ریزہ کر بیٹھے گی۔۔ کیا وہ تنہائی کے سراب میں کسی سہارے کی تلاش میں سراب دیکھتی رہے گی یا پھر اس صحرا میں تڑپتی ہوئی پیاسی دم توڑ جائے گی۔۔ کیا اس کے مقدر میں زندگی کی لطافتوں سے بھرا ہوا کوئی سائبان نہیں ہوگا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا پورا بدن پسینے میں نہا چکا تھا۔ وہ کیوں بہک رہی ہے۔ اسے تو اپنے فیصلے پر قائم رہنا ہے۔ اس نے بے بسی سے خود پر غور کیا۔ بدن کی تڑپ پکار رہی تھی اور وہ بے حال ہو کر خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اگر بے بس ہے تو اس کے بنانے والا تو بے بس نہیں اسے اپنے رب سے مدد مانگنی چاہیے۔ وہی تو سارے بے سہاروں کا سہارا ہے۔ وہ اگر اس کے ساتھ ہوگا تو کبھی بھی کمزوری اسے راہ سے بھٹکا نہیں سکے گی۔ اسے اپنے رب ہی سے مدد مانگنا ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی اسے یوں لگا جیسے دہکتی ہوئی آگ پر چھاجوں پانی برس جائے۔ ایک سکون کی لہر پورے وجود میں پھیل گئی۔ ٹھنڈک کا احساس اس کے پورے وجود میں مہکنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ کتنی ہی دیر تک پانی کے چھینٹے منہ پر مارتی رہی۔ پھر بڑے اہتمام سے وضو کیا اور کمرے میں آگئی۔ اس نے جائے نماز بچھائی اور اپنے رب کے حضور کھڑی ہوگئی۔ کمرے سے باہر رات کا اندھیرا اپنا آپ منوا رہا تھا اور کمرے کے اندر نادیہ اس روشنی کا سراغ پانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ جس میں وہ اپنے شعور کی لگامیں خود تھام سکتی تھی۔ ہر طرف سکون چھا گیا تھا۔

☆☆☆
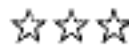
زندگی میں جب بنا خواہش کے بہت زیادہ خوشیاں مل جائیں تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ خوشیاں جن کے بارے میں بندہ بالکل ناامید ہوتا ہے۔ سوکھے ہوئے پیڑ پر اچانک بہار آجائے تو اس درخت کے ثمرات کو پانے کی بے چینی بندے کو بے حال کر دیتی ہے۔ ناامیدی سے امید تک کے سفر میں کھو دینے کا تو احساس ہی نہیں ہوتا، بس پانے کی جستجو اور خواہش بڑھتی رہتی ہے۔ جب پا لیا تو پھر کھو جانے کا خوف اپنی پوری ہیبت کے ساتھ بندے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ فرح کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا نہیں تھا کہ اس کی شادی ہو جائے گی۔ اب جبکہ وہ خواب کہیں جیسے لمحات میں سے گذر رہی تھی۔ شعیب کی محبت نے اسے نہال کر دیا ہوا تھا۔ ایسے میں حویلی کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں خوف زدہ کر دینے والے احساسات اسے دہلا دیتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنی ہی سوچوں سے گھبرا جایا کرتی تھی۔ اس کے شادی کے پہلے ہی دن جب وہ حویلی گئی تھی۔ تبھی نادیہ کو تہی داماں پایا تھا۔ لیکن آفرین ہے نادیہ پر اس نے شکوہ یا شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ بلکہ اسے زیادہ محبت سے اپنے اور خدمت کرنے کی تلقین کرتی رہی تھی۔ نجانے اسے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ خوشیاں جو اس کے حصے میں آتی ہیں، اس کی اپنی نہیں، نادیہ کی دی ہوئی ہیں۔

''فرح۔۔اری او فرح۔۔کہاں ہو بیٹی۔۔'' زبیدہ پھوپھو کی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونکی، وہ باہر کہیں کھڑی اسے آوازیں دے رہی تھی۔تب وہ جلدی سے نکل کر کمرے سے باہر آگئی۔زبیدہ کاریڈور کے کنارے کھڑی تھی۔

''جی پھوپھو۔!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے پاس چلی گئی۔

''ارے بیٹا، شعیب کے آنے کا وقت ہوگیا ہے اور ابھی تک تم ویسے ہی پھر رہی ہو۔تھوڑا بہت تیار ہو جاتے ہیں بیٹی۔'' زبیدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

''ابھی میں نے کھانا بنوایا ہے خانساماں سے۔۔کچن سے آکر بیٹھی ہوں۔'' اس نے وجہ بتائی تو زبیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا، تم تیار ہو کر آجاؤ ڈرائینگ روم میں۔'' زبیدہ نے کہا اور اس طرف بڑھ گئی۔اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ یونہی سوچنے لگی کہ سنا ہے ساس بہت ظالم ہوتی ہے۔یہاں تو یہ نعمت میسر تھی کہ وہ بالکل بڑوں کی مانند اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔وہ اپنی قسمت پر مسکرا دی۔

وہ تیار ہو کر ڈرائینگ روم میں آگئی تو زبیدہ پھوپھو کو اپنی سوچوں میں گم پایا تب وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''پھوپھو۔!میں نے دیکھا ہے کہ آپ زیادہ تر سوچوں میں گم رہتی ہیں آخر ایسی کیا بات ہے۔''

''بیٹی۔!یہ جو یادیں ہوتی ہیں نا۔۔۔یہ انسان کا بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔اچھے دن چاہے وہ بہت تھوڑے سے بھی ہوں۔۔وہ یاد آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں۔۔۔''

''اگر میں غلط نہیں تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ پھوپھا کاشف کو یاد کرتی ہیں۔'' اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹی۔!وہی تو میری زندگی کا حاصل تھا۔اس کا اور میرا ساتھ جتنا بھی تھا۔وہ ایسا تھا کہ بندہ چاہتے ہوئے بھی اسے نہیں بھلا سکتا'' اس نے یادوں میں بھٹکتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔پھر چونکتے ہوئے بولی۔''بیٹی۔!یہ جو تعلق ہوتے ہیں نا، بڑے نصیبوں سے بنتے ہیں۔ان کی حفاظت کرنا۔۔۔خوشگوار تعلق ہوں نا تو زندگی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ورنہ تعلق نبھانے میں خونِ جگر بھی رائیگاں چلا جاتا ہے۔قسمت والے ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی میں اچھا ساتھ مل جاتا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔میں جو کبھی ایسے تعلق کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔مجھے یوں مل گیا کہ سوچنا بھی نہیں پڑا۔اور نادیہ کے من میں کیا ہے۔یہ میں نہیں جانتی۔لیکن اس نے نہ صرف اپنے ہر فیصلے پر خود لکیر پھیری ہے بلکہ وہ کسی بھی فیصلے تک پہنچنے میں خود اپنی سوچوں کو سہارا نہیں لیتی۔ڈٹ جانے کی اس میں ہمت ہی نہیں ہے۔'' زبیدہ نے اپنے تئیں تجزیہ کرتے ہوئے کہا تو فرح تیزی سے بولی۔

''لیکن پھوپھو۔!آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ ایسی میں حوصلہ ہے، ورنہ وہ حویلی کی روایات کو توڑ کر اتنی دور نہ چلی جاتی۔''

''وہی تو میں کہہ رہی ہوں، فیصلہ کر کے اس پر ثابت قدم رہنا نہیں آتا اس کو۔۔اگر وہ شعیب کے لیے گئی تھی تو پھر اسے ہر حال میں شادی بھی اسی سے کر لینی چاہیے تھی۔اپنے فیصلے پر قائم رہتی۔۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''شاید یہاں قدرت کا فیصلہ تھا۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''خیر۔!جو ہوا سو ہوا۔نجانے آنے والے حالات میں کیا ہے۔اس بارے کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔لیکن۔!تم اپنے اس تعلق کو بہت خوشگوار رکھنا۔اس کے لیے زندگی کی راہوں پر چلتے ہوئے بہت ساری قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔شوہر اور بیوی کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ ٹوٹے نہیں ٹوٹ سکتا۔لیکن اگر اس میں کہیں شک کی دراڑ پڑ جائے تو کچے دھاگے سے بھی نازک تعلق ہوتا ہے۔یہ سارا تعلق اعتماد اور یقین پر ہوتا ہے۔''

''جی پھوپھو۔!آپ میری راہنمائی کرتی رہیں نا۔''اس نے کافی حد تک خوف زدہ لہجے میں کہا۔اس پر زبیدہ مسکرا دی اور بڑے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔اور بڑے نرم لہجے میں بولی۔

''میں ہوں نا ادھر۔لیکن تم خود کو مضبوط رکھنا۔''

یہ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''لگتا ہے شعیب آگئے۔''یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو زبیدہ نے اطمینان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا، میں نے شعیب سے بات کرنی ہے،تم لوگوں کے بارے میں،میری ہاں میں ہاں ملاتی رہنا۔''

''ٹھیک ہے، پھوپھو۔''فرح نے سعادت مندی سے کہا اور شعیب کی راہ تکنے لگی۔

وہ جب کھانا کھا چکے اور گپ شپ کے لیے ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ زبیدہ نے یونہی بات چھیڑ دی۔

''شعیب تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری شادی کو آج ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔''

''جی امی۔''اس نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔پھر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سوال ایویں نہیں، کسی خاص بات کہ تمہید ہے۔

''اب تمہیں بھی معلوم ہے کہ یہ شادی کس حال میں ہوئی اور حالات کیا تھے۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں اپنے بیٹے کی بارات دھوم سے لے کر جاتی، چار دن خوب ہلا گلا رہتا اور میں ہر ماں کی طرح اپنے ارمان پورے کرتی۔''وہ بڑی مسرت سے بولی تو شعیب نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''امی۔!اس ساری تمہید کو چھوڑیں اور جو آپ نے اصل بات کہنی ہیں وہ کہیں۔ورنہ پھر میں نے یہ ضد کر لینی ہے کہ میری بارات لے کر جائیں اور فرح کو دوبارہ سے دلہن بنا کر لے آئیں۔''

''ویسے ہونا تو یہی چاہیے،لیکن اب اس میں وہ مزہ نہیں رہے گا۔''اس نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''تو اصل بات بتائیں پھر۔؟''وہ بولا۔

''دیکھو، میرے تو ارمان پورے نہیں ہوئے۔لیکن بے چاری کا کیا قصور ہے۔اسے تو کہیں لے کر جاؤ، گھماؤ۔پھراؤ۔''زبیدہ نے فرح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی، یہ سارا قصور آپ کا ہے۔آپ نے پہلے کہا ہی نہیں۔ورنہ میں اسے کب کا لے جاتا، ویسے کیا، یہ بات فرح نے آپ سے کہی ہے؟''وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں نے خود سوچا ہے۔اب ایسا کرو، پورے ایک ہفتے کی یا دس دن کی چھٹی لو،اور نکلو یہاں سے ۔ مجھے بھی لاہور سے آئے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں۔''

''تو یوں کہیں نا، آپ کا جی یہاں نہیں لگ رہا۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''نہیں، اب میں نے کہاں جانا ہے پتر۔ مرنا جینا تم دونوں کے ساتھ ہے۔تم ذرا شمالی علاقوں میں گھوم آنا اور میں اتنے دن لاہور رہ لوں گیا۔بس اتنی سے بات ہے۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

''امی۔کیوں نہ ایسا کریں۔یہاں سے تبادلہ کروالیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔نجانے اس کے لہجے میں حسرت کہاں سے اتر آئی تھی۔زبیدہ نے اس کے لہجے پر توجہ دیئے بغیر کہا۔

''اگر تو لاہور میں ہوتا ہے تو پھر ٹھیک ہے، ورنہ کسی اور شہر میں ہو تو پھر کوئی فائدہ نہیں، وہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہاں تو پھر حویلی نزدیک ہے ۔فرح کے لیے آسانی ہوگی۔''

''او کے۔!تو پھر آپ سامان باندھیں۔میں نے پہلے ہی سے پندرہ دن کی چھٹی لے لی ہوئی ہے۔میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں جاؤں لاہور۔۔۔اپنے دوستوں یاروں سے ملوں۔۔کیوں فرح تم تیار ہو؟'' آخری فقرہ اس نے فرح کی طرف دیکھ کر کہا جو ان کی باتوں کے درمیان بالکل بھی نہیں بول تھی۔

''جی، جیسا آپ چاہیں۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''تو ٹھیک ہے کل دن کے وقت نکلتے ہیں۔'' شعیب نے حتمی انداز میں کہا اور اٹھ گیا۔زبیدہ نے فرح کی طرف دیکھا تو دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرادیں۔ان کے دل کی بات شعیب نے پہلے ہی بوجھ لی ہوئی تھی۔

اگلی صبح جب وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تو شعیب نے فرح کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں تو پھر چلنے کے لیے تیار ہو؟''

''جی، میں بالکل تیار ہوں۔''

''اور امی۔؟''

''وہ بھی تیار ہیں۔''

''تو پھر نکلیں۔سامان رکھواؤ گاڑی میں۔''

''وہ پھوپھو نے رکھوا دیا ہے۔ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔''

''چلو پھر۔'' یہ کہتے ہوئے شعیب اٹھا اور ڈرائنگ روم میں آگیا۔جہاں زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔اسے دیکھ کر وہ بولا ''چلیں امی۔''

''ہاں، وہ ذرا ڈرائیور سے کہہ دینا،حویلی کی طرف سے ہوتا ہوا چلے، جاتے ہوئے ان سے مل لیں۔'' زبیدہ نے اٹھتے ہوئے تو وہ ایک

دم سے چونک گیا۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''امی۔! اب چھوڑیں، وہاں پتہ نہیں کتنا وقت لگ جائے واپسی پر بھی۔''

''کتنا وقت لگے، زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ آدھا گھنٹہ۔ وہاں ہم نے سارا دن تھوڑی رہنا ہے۔'' وہ حیرت سے بولیں۔

''تو امی، آپ پہلے حویلی سے ہو کر آ جائیں۔ پھر ہم نکل چلتے ہیں۔ میں آپ کا یہاں انتظار کرتا ہوں۔ اس نے کہا اور صوفے پر ٹک گیا۔ تب فرح کے چہرے پر پھیلی ہوئی ساری خوشگوار ختم ہوگئی۔ جیسے سورج کے آگے بادل آ گئے ہوں۔

''کیا تمہیں حویلی جانا اچھا نہیں لگتا؟'' زبیدہ نے پوچھا تو اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

''اچھا لگنے یا نہ لگنے کی بات نہیں، بس میں نے سوچ لیا ہے کہ وہاں نہیں جانا تو بس نہیں جانا۔''

''اس کی وجہ؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''میں نہیں جانتا۔ اس نے یہ کہہ کر لا جواب کر دیا۔ ماحول میں ایک دم سے تلخی در آئی تو گزرتے ہوئے لمحے بھاری لگنے لگے۔ تبھی فرح نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''پھوپھو۔ اگر شعیب حویلی نہیں جانا چاہتے تو اس میں سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ جائیں یا نہ جائیں۔ انہوں نے ہمیں تو نہیں روکا۔ اگر آپ حویلی جانا چاہیں تو آپ ہو آئیں۔ میں بھی یہیں آپ کا انتظار کروں گی۔''

اس کے یوں کہنے پر زبیدہ نے بڑی گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ وقت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی کوئی بات منوا سکے۔ جب فرح ہی اپنے حق سے دستبردار ہو رہی ہے تو وہ اپنے بیٹے کی ضد کو تسلیم کیوں نہ کرے۔ یہ ایسا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے حویلی نہ جانے کی وجہ پوچھے۔ وہ جتنا پوچھتی ماحول اتنا ہی کشیدہ ہو جانا تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو۔! سیدھے نکلتے ہیں۔ بعد میں جب آؤں گی تو حویلی چلی جاؤں گی۔''

اس نے یوں کہنے پر شعیب چند لمحے اپنی ماں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر تحمل سے بولا

''امی۔! آپ حویلی سے ہو آئیں بلکہ فرح کو بھی ساتھ میں لے جائیں۔ وہ ہمارا یوں اچانک جانا کسی اور ہی معنی میں نہ لے لیں۔''

''میں انہیں فون پر بتا دوں گی۔ اور ہم ان کے پابند تھوڑی ہیں۔ جو انہیں بتاتے پھریں۔ جیسے ضرورت ہوگی وہ خود ہی فون کر لے گا۔ چلو نکلو، اب دیر مت کرو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب چل دیں۔ وہ صوفے پر بیٹھا چند لمحے سوچتا رہا، پھر اٹھ گیا۔ فرح اس کے پیچھے پیچھے پورچ تک آ گئی۔ ذرا سی تلخی اب بھی اس کے من میں تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔ فرح نے پہلی بار سلامت نگر دیکھا تھا۔ بچپن میں شاید وہ ان گلیوں اور راستوں سے گزری ہوگی، جو اب بہت بدل گئے تھے۔ اب اس کے سامنے جو منظر بھی تھے، وہ سب نئے تھے۔ وہ ان مناظر میں کھو جانا چاہتی تھی جو اسے شعیب دکھاتا۔

☆☆☆
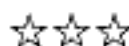
کئی دن گذر گئے تھے۔ نادیہ کا من نجانے کیوں بھاری بھاری رہتا تھا۔ وہ لاکھ اپنی توجہ شعیب اور فرح کی طرف سے ہٹاتی، مگر پھر بھی ذہنی روان کی طرف چلی جاتی۔ نجانے کب کے کہانیوں میں پڑھے ہوئے واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو جاتے۔ اگرچہ ہر کہانی اور افسانے کا ہیروئین اور ہیرو الگ الگ تھے لیکن نادیہ کے ذہن میں آنے والے واقعات میں سارے ہیرو اب شعیب اور ہیروئین فرح بن چکے تھے۔ جو بھی واقعہ اس کے ذہن میں در آتا۔ اس میں صورت حال جو بھی ہوتی، اس ساری صورت حال میں اسے وہ دونوں دکھائی دیتے۔ انسان چاہے جتنا بھی خود کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ دماغ بھی عجیب شے ہے۔ سوچوں کے اتنے پہلو اس میں ابھرتے ہیں، شعور اور لاشعور کی اتنی کارفرمایاں اس میں ہیں کہ انسان خود اسی کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ ان دونوں کے بارے میں سوچے لیکن کوئی نہ کوئی سوچ وہ سوچتی چلی جاتی۔ وہ چونکتی اس وقت جب من میں ایک طرح کی یابت اور کھو دینے کا احساس جاگزیں ہو جاتا۔ دل سے اٹھنے والی ہوک اسے کہیں کا نہ رکھتی تو وہ خود سے شرمندہ ہو جاتی۔ جب اسے نے اپنی محبت کسی دوسرے کی جھولی میں ڈال دی تو پھر پچھتانا کاہے کا۔ یہیں سے اس کے اندر کشمکش کا آغاز ہو جاتا اور اس کے اندر بیٹھی ہوئی نادیہ سے گفتگو اس قدر بڑھتی کہ بحث تک جا پہنچتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بحث کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہ گفتگو، یہ بحث، یہ ہمکلامی، اس پر سوچیں، ہمکلامی میں کبھی ہار جاتی اور کبھی جیت جاتی لیکن اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس نے غلط کیا، کیونکہ اسی دوران اس کا اپنا مقصد پوری طرح تن کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ باوجود شدید خواہش کے وہ اپنے مقصد کے لیے ایک وہ بھرپور کوشش نہیں کر پائی تھی۔ وہ ابھی اس حصار ہی سے باہر نہیں نکلی تھی جو خود اس نے اپنے گرد باندھ لیا تھا۔ شاید وہ ان دونوں کو بھول کر اپنی دنیا میں کھو جاتی، جہاں اس کے اپنے تصورات تھے اور اپنی مرضی کی مملکت تھی مگر اس کی دنیا میں روزانہ ہی ہلچل پیدا ہو جاتی۔ اماں بی، زہرہ بی، یا پھر پیر سائیں کسی نہ کسی حوالے سے ان دونوں کا ذکر کر دیتے۔ بات یہیں سے شروع ہوئی تھی کہ وہ حویلی میں آئے بغیر لاہور کیوں چلے گئے؟ یہی سوال ان کے لیے سوہان روح تھا۔ کہیں محبت کا تقاضہ تھا، لیکن کھو جانے کا خوف تھا اور کہیں انا پر ٹھیس پڑی تھی۔ خود اس کی سوچ میں کیا تھا۔ یہ جاننے کی اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کے اندر سے خود بخود کوئی واقعہ ابھرتا اور چشم زدن میں وہ ان دونوں کو پا لیتی۔ تب من کی دنیا ہی عجیب طرح کی لہریں اٹھ جاتیں۔ جنہیں وہ خود بجھ نہ پائیں اور جو بجھ آئیں اسے نظر انداز کر جاتی۔

چاہیے تو یہ تھا کہ گذرتے دنوں کے ساتھ اس کی یہ کیفیات ماند پڑ جاتیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب تو اس میں جذبات بھی شامل ہو گئے۔ حسرتیں بھی منہ کھولے آ جاتیں۔ امیدیں آنکھیں کھولے اس کی طرف تکنے لگتیں۔ اور خواہشات اپنے بال کھولے اس کا طواف کرنے لگتیں۔ ایسے میں وہ بے انتہا گھبرا جاتی۔ فرار کی کوئی راہ اس کے پاس نہیں تھی۔ یہی وہ کمزور ترین لمحات تھے جن میں وہ بے بسی محسوس کرتی تھی۔ وہ بے حال ہو جاتی۔ وہ جب ایسے لمحات پاتی، تو اپنی توجہ مبذول کرنے کی بجائے فرار چاہتی۔ تب اس کے علاوہ اس لے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ سیدھے جا کر وضو کرتی اور اپنے رب کے حضور جا کر کھڑی ہو جاتی۔ یہی وہ وقت ہوتا جب وہ دنیا سے ناطہ توڑنے میں پوری طرح تو نہیں مگر کافی حد تک کامیاب ہو جاتی۔ وہ جب تک حاضر رہی، تب تک سکون میں ہوتی۔ پھر معمولات زندگی کی ابتداء ہوتی اور ایک دورانیے میں پھنس کر دوبارہ اسی کیفیت میں آ جاتی۔ رسائل، کتابوں اور میگزین کے انبار لگ گئے تھے لیکن ایک لفظ بھی پڑھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وجہ صرف یہی تھی کہ کسی بھی کہانی کا

ہیرو شعیب ہوتا اور ہیروین فرح۔ دوسرا اسے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس لیے پڑھنے والی چیزیں اس کی منتظر رہنے لگی۔ سوائے رب کے حضور کھڑے ہوئے کے، اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اس سہ پہر بارش ٹوٹ کر برسی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ سارے بادل آج ہی برس جائیں گے۔ کچھ دیر پہلے ہی دادی اماں اسے بتا کر گئیں تھیں کہ شعیب اور فرح سوات کی حسین وادی میں ہیں۔ وہیں سے انہوں نے فون کر کے بتایا ہے کہ وہ کہاں کہاں کی سیر کر رہے ہیں۔ اور کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ وہ تو چلی گئیں لیکن موسم کی گھٹن کے ساتھ اس کے اندر کی گھٹن بھی بڑھنے لگی تھی۔ پھر اچانک ہی بارش ہونے لگی تو وہ اپنی کھڑکی سے آن لگی۔ دور تک برستا ہوا پانی سارے منظروں کو دھندلا کر رہا تھا۔ اور وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے وجود کو بھلانے کی ناکام کوشش میں تھی۔ بارش کا شور کم اور اس کے اندر کا شور کہیں زیادہ تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب بارش تھم گئی، اس کے اپنے اندر کی اور باہر بھی۔ اس نے اچانک ہی ایک فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل کرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنا بہترین لباس چنا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

کافی دیر بعد جب سورج مغرب میں غروب ہو گیا اور شہر کے سارے برقی قمقمے روشن ہو گئے تب وہ کاسنی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس اور بڑی ساری سیاہ چادر میں خود کو چھپائے ڈرائینگ روم میں تھی۔ اس کے ساتھ تاجاں مائی تھی، جس کے ہاتھ میں اگر بتیاں اور ڈھیرے سارے پھول تھے۔ اماں بی اور زہرہ بی دونوں وہیں براجمان تھیں۔ اسے یوں دیکھ کر دادی اماں نے پوچھا۔

''نادیہ بیٹی۔! کہاں جا رہی ہو؟''

''میں مزار پر جا رہی ہوں۔۔ میں صاحب مزار کے لیے شاید اتنا نہیں، بلکہ اپنے والدین کی آخری آرام گاہ پر جانا چاہتی ہوں۔''

''لیکن تمہیں معلوم ہے کہ پیر سائیں نے حویلی کی سب خواتین کو مزار پر جانے سے منع کیا ہوا ہے۔'' زہرہ بی نے دھیمے سے لہجے میں اسے یاد دلایا۔

''آپ ایسا کریں، انہیں اطلاع دے دیں۔ میرے خیال میں وہ مجھے منع نہیں کریں گے۔۔ اور اگر انہوں نے منع کر دیا تو میں نہیں جاؤں گی۔ واپس اپنے کمرے میں چلی جاؤں گی۔۔ ایک ذرا بحث نہیں کروں گی۔'' نادیہ نے بڑے تحمل سے کہا۔ اس پر دادی اماں جب لمحے سوچتی رہیں۔ پھر نادیہ کے چہرے پر پھیلے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر بولی۔

''ٹھیک ہے، میں ایک بار پوچھ لوں۔''

''جی ضرور۔!'' نادیہ نے کہا اور وہیں سے پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اماں بی نے تاجاں بی بی ہی سے کہا کہ وہ جائے اور پیر سائیں سے اجازت لے آئے۔ وہ فوراً ہی مردان خانے کی جانب چلی گئی۔ کافی دیر بعد جب کہ مغربی افق پر سرخی ختم ہو گئی۔ تاجاں اس کے کمرے میں آئی۔

''بی بی سئیں۔ پیر سائیں نے اجازت دے دی ہے۔ بس اتنا کہا ہے کہ عشاء کی اذان ہوتے ہی واپس حویلی پلٹ آئیں۔''

''اماں بی اور زہرہ بی کو بتا دی ہے یہ بات۔۔۔'' نادیہ نے پوچھا۔

''جی، میں انہیں بتا آئی ہوں۔''

''تو پھر چلو، ہمارے پاس تھوڑا سا وقت ہوگا۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنی سیاہ چادر کو اپنے اردگرد یوں لپیٹ لیا کہ صرف آنکھیں دکھائی دیں۔

وہ درگاہ کے احاطے میں پہنچی تو وہ روشن تھا۔ لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ یوں جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔ اچانک اسے درگاہ کی ایک جانب مزار کی جالی کے پاس بہت ساری خواتین دکھائی دیں ورنہ وہاں کسی مرد کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ اس حیرت میں تھی کہ وہ ادھیڑ عمر خاتون اس کی طرف بڑھ آئی جو درگاہ کی خدمت گذاروں میں سے ایک تھی۔ وہ اسے دیکھ بچھی چلی جا رہی تھی۔ اس کے انداز سے یہی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس کی آمد کی منتظر ہو۔ پھر اس نے اظہار کر ہی دیا۔

''بڑی خوشی ہوئی بی بی سئین آپ یہاں تشریف لائیں۔ عرصے بعد مرشد خاندان کی کوئی بی بی یہاں تشریف لائیں ہیں۔

''تو کون ہے اور تجھے میری آمد کے بارے میں کیسے پتہ ہے۔'' نادیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بی بی سئین آپ ہم سے کیا بھولی ہوئیں ہیں۔ زندگی گذار دی ہے یہاں خدمت کرتے۔ پہلے حویلی میں تھی اب یہاں ہوں۔۔۔اور باقی رہی بات کہ آپ کی آمد بارے کیسے پتہ ہے تو ابھی کچھ دیر پہلے پیر سائیں کا حکم ہوا تھا کہ بی بی سئین درگاہ پر آ رہی ہیں۔ اس لیے کوئی بھی مرد احاطے میں نہ ہو۔ اور جب تک آپ یہاں ہوں، کسی کو آنے کی اجازت نہ دی۔ صرف خواتین رہ سکتی ہیں ادھر۔''

''اچھا تو یہ پیر سائیں کا حکم تھا۔'' وہ ہمکلامی کے سے انداز میں بولی۔

''جی بی بی سئین۔'' وہ خدمت گار خاتون کو سمجھ نہ آیا تو اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، تم جاؤ اپنا کام کرو۔'' نادیہ نے کہا اور درگاہ کے اس کونے کی جانب دیکھا جو احاطہ پار کر کے تھوڑا فاصلے پر تھا اور اسی کونے میں پہلو بہ پہلو اس کے والدین دفن تھے۔ وہ مزار پر حاضری دینے کی بجائے سیدھا وہ اپنے والدین کے مرقد پر گئی۔ وہاں جاتے ہی اس نے قبر پر پھول ڈالے، اگربتیاں سلگائیں اور دونوں قبروں کے درمیان بیٹھ گئی۔ سفید پتھروں سے آراستہ پختہ قبروں کے درمیان، سیاہ چادر ڈالے، آنکھیں بند کر کے سر جھکائے وہ کافی دیر تک زیرلب پڑھتی رہی۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ سیاہ چادر کے پس منظر میں اس کے دونوں گورے ہاتھ یوں دکھائی دینے لگے۔ جیسے چمک رہے ہوں، حنائی ہاتھ، جڑاؤ کنگن اور بھرے بھرے ہاتھ۔ آنکھیں بند، ہلتے لب اور روشن چہرہ، اس وقت وہ کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگ رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک یونہی بیٹھی دعا مانگتی رہی۔ پھر جیسے اسے سکون آ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے اردگرد دیکھا، ویسا ہی سناٹے سے بھرا ماحول تھا۔ دور کہیں اکا دکا خواتین آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے والدین کے مرقد سے اٹھی اور درگاہ کے صاحب مزار کی جانب بڑھ گئی۔ وہ اس کے پڑدادا تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صاحب کرامات اور مستجاب الدعا شخصیت تھے۔ ان دنوں ان کی نہ حویلی تھی اور نہ ہی جاگیر، وہ فقیر آدمی تھا اور نجانے کہاں سے آ کر بستی کے باہر ڈیرے ڈالے تھے۔ ادھیڑ عمری میں انہوں نے یہاں کی ایک خاتون سے شادی کی اور پھر ایک گھر بنا کر رہنے لگے تھے۔ یہ حویلی تو ان کے دادا کی جوانی کے دور میں بنی تھی جب مریدین نے اصرار پر درگاہ تعمیر کی تھی۔ انہی دنوں ملک تقسیم ہوا تو درگاہ کے نام پر کافی سارا زمین دادا کی کوششوں سے الاٹ ہو گئی۔ انہوں نے اپنے مریدین کے ذریعے ان زمینوں کو

آباد کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستی تیسری نسل آنے تک تحصیل کا درجہ پا گئی اور بڑے قصبے کا روپ دھار گئی۔ نادیہ کو اپنے خاندان بارے ساری معلومات تھیں۔ وہ انہیں خیالوں میں کھوئی ہوئی مزار کی جالی کے پاس چلی گئی۔ جہاں کچھ خواتین پہلے ہی سے موجود تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ وہاں سے ہٹ گئیں۔ جالی سے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سنگ مرمر کی جالی منقش تھی۔ اور اس پر لوگوں نے مختلف رنگوں کے دھاگے باندھے ہوئے تھے۔ بڑے چھوٹے، نیلے پیلے، سرخ، سبز، ہر رنگ اور ہر طرح کے دھاگے۔۔۔ وہ انہیں دیکھنے لگی۔ بظاہر تو ان دھاگوں کی کوئی قدرو قیمت نہیں تھی، لیکن جس وقت یہ دھاگے اس جالی سے باندھے گئے تھے، تب دھاگہ باندھنے والے کے من میں نجانے کیسی خواہش ہو گی۔ وہاں جتنے بھی دھاگے بندھے ہوتے تھے ہر دھاگے کی گرہ میں کم از کم ایک خواہش تو پنہاں تھیں۔ اس جالی پر نجانے کتنی خواہشیں پوری ہونے کی منتظر تھیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ پوری بھی ہو گئی ہوں۔ یہ گرہیں خواہش کی نجانے کتنے سپنوں میں لپٹی ہوتی ہوں گی۔ کاش اس میں کوئی ایسی صلاحیت ہوتی کہ وہ جس گرہ پر ہاتھ رکھتی اسے معلوم ہو جاتا کہ اس میں کون سی خواہش پنہاں ہے۔ تب کتنا اچھا لگتا۔ تب اگلے ہی لمحے وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گری۔ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ کس گرہ میں کون سی خواہش بندھی ہوئی ہے تو کیا وہ کسی بھی خواہش کو پورا کرنے کی مجاز ہے؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔ یہ تو قدرت کے کارخانے میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ رنگوں بھری یہ گرہیں خواہش کیں نجانے اپنے اندر کتنی رنگیں و سنگین حسرتیں رکھتی ہوں گی۔ وہ یہ سوچ تو سکتی ہے کہ ان گرہوں میں خواہشیں لپٹی ہوئی ہیں، وہ خواہشیں کیسی ہیں یہ نہیں جان سکتی تھی۔ وہ پوری توجہ سے اس بارے سوچتی چلی گئی تھی۔ تب اس نے ایک گہری سانس لی، اور مزار کے اندر دیکھنے لگی، وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک احساس اس کے سراپے میں پھیل گیا کہ زبیدہ پھوپھو نے یہیں کاشف پھوپھا کو دیکھا تھا، اسی جالی سے جہاں رنگین دھاگوں میں خواہش وقت کی صلیب پر ٹنگی ہوتیں ہیں۔ انہوں نے جو خواہش کی وہ پوری تو ہوئی لیکن یوں کہ پوری زندگی ایک گرہ کی مانند ہو کر رہ گئی۔ کاشف پھوپھا، کچھ عرصہ زندہ رہے اور پھر یہ دنیا چھوڑ گئے۔ ساری رنگینیاں پھر سنگینی میں بدل گئی۔ اور پھر اس کے اپنے ساتھ کیا ہوا۔۔۔؟ یہ سوچ آتے ہی وہ چونک گئی۔ وہ گھوم پھر کر اپنی ہی ذات کے بارے میں سوچنے لگ جایا کرتی تھی۔ کیا وہ خود کو مظلوم سمجھتی ہے؟ یہ سوال بذات خود اسے اپنی ذات کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ اور ایصال ثواب کے لیے قرآنی آیات پڑھنے لگی۔

دعا مانگنے کے بعد جب اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے تو ایک سکون اس کے من میں اترتا چلا گیا۔ وہ اٹھ گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ مزار پر ڈالنے کے لیے پھول تو ابھی تاجاں مائی ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ آگے بڑھی اور تاجاں مائی سے پھول لیے اور اس کمرے میں داخل ہو گئی جہاں مزار تھا اور اس میں کسی عورت کو جانے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ دہلیز پار کرتے ہی وہاں موجود خواتین کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ تاجاں مائی کے ساتھ ساتھ وہاں پر موجود خدمت گار خواتین کے رنگ بھی فق ہو گئے۔ ایک طرف انہیں یہ خوف تھا کہ پیر سائیں کو کیا جواب دیں گی اور دوسری طرف بی بی سئین کو روک بھی نہیں سکتی تھیں۔ مزار پر آتے ہی نادیہ نے اس روایت کو بھی توڑ ڈالا تھا۔ اس نے مزار پر پھول چڑھائے۔ واپس پلٹنے لگی تو نجانے اس کے دل میں کیا آئی۔ اس نے مزار پر پڑی بہت ساری چادروں میں سے ایک چادر اٹھا کر اپنی سیاہ چادر پر اوڑھ لی۔ چند لمحے وہاں کھڑی رہی اور پھر وہاں سے نکل آئی۔ وہ کمرے سے نکلی اور احاطے میں آ گئی۔ واپسی پر درگاہ کے احاطے میں موجود ایک پرانے درخت پر اس کی نگاہ پڑی۔

جس پر مختلف رنگوں کے دھاگے باندھے ہوئے تھے۔ وہاں اور کچھ بھی باندھا ہوا تھا۔ رنگین رومال، رنگ برنگے شیشوں والے پراندے، چھوٹی بڑی گھنٹیاں، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے جھولے۔۔۔ اور نجانے کیا کچھ اندھیرے اور ذرا اونچائی کے باعث وہ اچھی طرح دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس نے سوچا، یہ بھی تو گرہیں خواہش کیں ہیں۔ کس گرہ میں کیا ہوگا؟ لیکن یہ وقت سوچنے کا نہیں تھا۔ وہ اب واپسی پر راہ پر تھی۔

اپنے کمرے میں آتے ہی وہ سیدھے آئینے کے سامنے گئی۔ اس نے مزار سے لی ہوئی چادر کو دیکھا، سبز رنگ کی رنگ برنگی چمکیلی کڑھائی اور لیس سے آراستہ، اسے خود کو آئینے میں دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔ وہ دنیا، جس میں وہ خود کر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ ایک الوہی ہالہ اس کے اردگرد پھیل گیا تھا۔ وہ چند لمحے خود کو دیکھتی رہی، پھر وہ چادر اتار کر اونچی جگہ پر رکھ دی۔ ایسے میں تاجاں مائی اس کے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ اس نے ذرا سا چکھا اور پھر اپنے ہی خیالوں میں کھو گئی۔ وہ چونکی اس وقت جب عشاء کی اذان نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اٹھی اور اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ کتنی دیر تک وہ اس خواب کے حصار میں رہی جس کے ٹوٹ جانے سے وہ بیدار ہوئی تھی۔ عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ کوئی بھی دیکھا گیا خواب پوری طرح یاد نہیں رہتا۔ اس کا کچھ حصہ شعور سے محو ہو جاتا ہے کچھ دھندلا رہ جاتا ہے اور تھوڑا بہت یاد رہتا ہے۔ مگر وہ خواب اسے پوری طرح یاد تھا۔ اس کی ایک ایک جزئیات اس کے ذہن میں پوری طرح عیاں تھی۔ وہ عشاء پڑھنے کے بعد بیڈ پر لیٹی تو پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگی تھی۔ سوتے ہوئے اس کے ذہن میں درگاہ اور اس کا ماحول تھا۔ سنگ مرمر کی جالیوں پر دھاگوں سے پڑی ہوئی گرہیں خواہش کیں۔ درخت پر بندھیں خواہشیں۔ مزار کے اندر کا ماحول، والدین کی قبر اور وہاں جو اسے سکون ملا، سب کو وہ محسوس کرتے ہوئے سو گئی تھی۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑی ہے۔ حالانکہ اس نے پوری زندگی میں کبھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔ بس قصے کہانیوں میں پڑھا تھا۔ یا پھر تصویریں دیکھی تھیں۔ مگر وہاں کا ماحول ہی کچھ دوسرا تھا۔ وہ کنارے پر کھڑی ہے اور دور افق پر سورج طلوع ہو رہا ہے۔ جس کی نارنجی روشنی میں وہ سمندر کا نیلگوں پانی دیکھ رہی ہے۔ تواتر سے اور ایک دورانیے میں لہریں آ رہی ہیں اور اس کے قدموں کے پاس آ کر بنا چھوئے واپس پلٹ رہی ہیں۔ تبھی وہ آگے بڑھتی ہے اور ایک لہر پر سوار ہو جاتی ہے۔ وہ لہر اسے لے کر چل پڑتی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا، نیلگوں پانی، زمین نجانے کہاں چلی گئی تھی اور وہ سمندر پر کھڑی تھی، لہر اسے خود پر سوار کیئے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے لمبے گھنیرے بال ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اچانک اسے دور ایک جزیرہ دکھائی دی، جس میں ایک محل کے برج دکھائی دینے لگے۔ سفید محل لحہ بہ لحہ اس کے نزدیک ہونے لگا۔ یہاں تک کہ وہ جزیرے کے کنارے تک آ پہنچی۔ گہرے سبز درختوں اور رنگ برنگے پھولوں کی بہار، ہلکی ہلکی باد نسیم اور پرندوں کی مختلف آوازیں۔ ایک عجیب فرحت آگیں منظر تھا۔ جس میں خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جہاں سمندر ختم ہو رہا تھا وہیں سے جزیرے کے کنارے سے، ایک خوبصورت روش دور محل تک جا رہی تھی۔ اس نے اس روش پر قدم رکھ دیا۔ پھر وہ یہیں راستہ چلنے لگا۔ جس طرح لہر اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ بالکل ویسے ہی وہ روش اسے محل تک لے گئی۔ وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ محل میں داخل ہو گئی۔ وہاں ہر شے سفید تھی، جیسے ہی دروازے سے اندر گئی ایک بہت بڑے کمرے کے درمیان میں سفید چاندنی پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سفید ریش، سفید لباس۔ ان کے قریب ہی

ایک جواں سال جوڑا بھی تھا۔انہوں نے بھی سفید لباس پہنا ہوا تھا۔مرد نے سفید پگڑی اور خاتون نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی۔وہ تینوں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔وہ دھیرے چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی اور اس سفید چاندنی پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

''خوش آمدید بیٹی۔!ہم شاید تجھے ابھی نہ بلاتے مگر تو نے جس شدت سے ہمیں یاد کیا ہے۔ ہمیں خود چل کر تمہارے پاس آنا پڑا۔پہچانتی ہو میں کون ہوں؟''اس سفید ریش بزرگ نے بڑی محبت سے پوچھا۔

''نہیں۔!میں نے آپ کو نہیں دیکھا پہلے۔کون ہیں آپ۔۔؟''اس نے ہولے سے کہا۔

''میں تمہارا پڑدادا ہوں بیٹے۔!آج تم میرے پاس آئی ہو تو مجھے اچھا لگا۔تمہارا اخلوص اور تمہارے اندر اپنی تلاش، یہی ضرورت تھی۔۔اور انہیں دیکھو، یہ کون ہیں؟''اس بزرگ نے کہا تو نادیہ نے تب ان کی جانب دیکھا، وہ حیرت میں کھوگئی۔وہ بالکل اس کے ماں باپ جیسے تھے۔جن کی تصویر اس نے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔اس نے ان کی طرف دیکھ کر لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ میرے والدین ہیں۔۔''

''ہاں۔!یہ تمہارے والدین ہیں۔یہ تم سے بات نہیں کر پائیں گے۔۔بس تمہیں اتنی اجازت ہے کہ تم انہیں دیکھ سکو اور یہ اطمینان کر لو کہ یہ بہت اچھی جگہ پر ہیں۔ہاں اگر تم ان سے ہمکلام ہونا چاہو، ان سے باتیں کرنا چاہو یہ مرحلہ ابھی دور کا ہے۔اس سے تمہیں گذر کر آنا ہوگا۔''

''بتایئے۔!میں وہ مرحلہ طے کر کے اپنے والدین سے ضرور باتیں کروں گی۔وہ کیسا مرحلہ ہوں۔۔میں اسے ضرور پار کروں گی۔۔''

''وہ کوئی نیا مرحلہ نہیں ہے۔ایک ہی ہے۔۔سیدھا راستہ۔۔اس پر چلتی چلی جاؤ گی تو یہ مرحلہ بھی طے ہوتا چلا جائے گا۔بس تم میرے پاس آتی رہا کرو۔۔سارے مرحلے خود بخود طے ہوتے چلے جائیں گے۔''انہوں نے کہا تو اسے کچھ ڈھارس بندھی۔ایک ملال جو اس کے من میں بگولے کی طرح اٹھا تھا۔وہ ایک دم ختم ہو کر رہ گیا وہ دونوں اس کی جانب ایک ٹک دیکھے چلے جا رہے تھے۔ان کے چہروں پر کسی قسم کے کوئی جذبات نہیں تھے۔نادیہ ان کی طرف دیکھتی رہی۔لیکن دل میں یہ خواہش نہیں ابھری کہ وہ آگے بڑھ کر انہیں چھو لے۔وہ یوں ہو گئی تھی کہ جیسے اس کے اندر سے ساری توانائی کشید کر لی گئی ہو اور وہ بے جان سی ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔

''میں آپ کے پاس آتی رہا کروں گی۔۔میری رہنمائی کرتے رہیے گا۔''اس نے آہستگی سے کہا۔

''ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔کسی انسان سے کچھ مت مانگنا۔۔مانگنا تمہاری سرشت ہی سے خارج ہو جانا چاہیے۔جو کچھ بھی لینا ہے۔وہ صرف ایک ہی ہستی سے،بس عرض کر دینا ہے،تمہارے لیے بہتر ہوگا تو مل جائے گا۔نہیں بہتر ہوگا تو نہیں ملے گا۔اب تم جاؤ۔''سفید ریش بزرگ نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔اس کے ساتھ ہی اس کے والدین نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔کچھ دیر مزید بیٹھنے کی اسے چاہت ہی نہیں ہوئی، وہ اٹھی اور محل سے نکلتی چلی گئی۔یہاں تک کہ روش اسے جزیرے کے کنارے تک لے آئی۔وہاں لہر اس کے انتظار میں تھی۔اس نے سمندر میں اپنا پاؤں ڈالا تو وہ پھر لہروں کے دوش پر تھی۔یہاں تک کہ وہ ساحل تک آ پہنچی۔یہیں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔تب وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ جزیرے پر جو خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔وہ یہاں اس کے کمرے میں بھی ہے۔وہ آنکھیں بند کر کے اس خواب کو کئی بار اپنے ذہن میں دہرا چکی تھی۔ہر بار انہی جزئیات کے

ساتھ وہ اسے پوری طرح یاد تھا۔خوشبو تھی کہ اس کے کمرے میں اس خواب کو ماورائی بنا دینے کا بھرپور احساس دے رہی تھی۔کافی دیر تک یونہی بے خیالی میں بیٹھی رہی۔

''یہ کیسا خواب تھا؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''جو بھی تھا،تم خود جانتی ہو۔میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ خوابوں میں اشارے ہوتے ہیں۔تمہیں خواب پوری طرح یاد ہے تو ان جزئیات کو سمجھنے کی کوشش کرو''

''کون سمجھائے گا مجھے۔''

''تم سمجھنے کی کوشش تو کرو جس طرح یہ خواب تمہیں خود بخود آ گیا ہے۔ویسے ہی سمجھنے سمجھانے کے سارے مرحلے طے ہو جائیں گے۔۔''

''اور وہ سیدھا راستہ۔''

''ایک ہی تو ہے۔۔صراطِ مستقیم۔جو ہر ایک کے لیے ہے۔۔الوہی پیغام۔۔پڑھنا ہے تو اسے پڑھو۔۔سب سنور جائے گا۔''

''ہاں۔!پڑھنا بھی ہے۔۔مجھے سمجھنا بھی ہے۔۔خواب کی ایک ایک رمز کو جاننا ہے۔میں سمجھ لوں گی۔۔'' اس نے عزم سے سوچا۔پھر اٹھ کھڑی ہوئی،اس نے دیوار پر لگے کلاک کو بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔وہ اٹھی اور وضو کرنے کے لیے بڑھ گئی۔وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔اسے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اسے اگر کچھ لینا ہے تو ایک ہی ہستی ہے۔۔باتیں کرنی ہیں اپنے بارے میں کچھ کہنا ہے تو فقط اسی ایک ہستی سے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔انسانوں کے ساتھ سارے معاملات میں کہیں نہ کہیں مانگنے کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔زندگی کے گہرے راز کیا ہیں۔اسے یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔یہ راز سمجھے،سمجھ میں نہیں آتے جس پر رحمت نازل ہو جائے تو پھر کائنات کے راز بھی عیاں ہونے لگتے ہیں۔یہ اس کی عنایت ہے جس پر ہو جائے۔جب بات ٹھہری ہی اس کی رحمت پر تو پھر اس کی خوشنودی کیوں نہ حاصل کی جائے۔یہ نکتہ اسے الہام ہو گیا تو سارے تفکرات اس سے دور ہو گئے۔وہ پورے سکون سے جائے نماز پر آن کھڑی ہوئی۔خوشبو کا احساس تیز ہو گیا تھا تو اسی قدر سکون اس کے اندر اتر گیا۔

☆☆☆

مغرب کا وقت ختم ہو چکا تھا اور حویلی جگمگا اٹھی تھی۔رات بے تابی سے چھائی تو پھر بڑھتے ہی چلے جانے کو بے تاب ہو گئی۔ایسے میں پیر سائیں کھانے کی میز پر آ بیٹھے۔بہت دنوں بعد وہ حویلی میں یوں کھانے کے لیے آئے تھے۔ورنہ یہ وقت ان کا مردان خانے میں گذرتا اور دستر خوان وہیں لگایا جاتا تھا۔آج خاص طور پر کھانا حویلی میں کھانے کے لیے کہا تو خاصہ اہتمام کر لیا گیا۔اماں بی اور زہرہ بی وہاں موجود تھیں یا پھر حویلی کی خادمائیں جو ان سے ذرا فاصلے پر موجود تھیں۔

''نادیہ بیٹی نہیں آئی۔؟''

''نہیں۔اس نے آنے سے منع کر دیا تھا'' اماں بی نے ہولے سے کہا۔

''کیا اسے بتایا نہیں گیا تھا کہ آج۔۔۔'' پیر سائیں نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بتایا تھا مگر اس نے اپنا کھانا کمرے ہی میں منگوالیا۔'' انہوں نے دوبارہ کہا تو پھر وہ نہیں بولا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ سیر ہو گیا تو ڈرائنگ روم میں صوفے پر جا بیٹھا۔ چائے اسے وہیں دے دی گئی۔ تبھی اس نے دادی اماں سے کہا۔

''نادیہ بیٹی کو ذرا بلوائیں۔ کئی دن ہو گئے میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔''

اس کے یوں کہنے پر دادی اماں نے اپنی ملازمہ کو اشارہ کیا تو وہ چلی گئی۔ وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے لاشعوری طور پر نادیہ کے انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ بڑی ساری سیاہ چادر میں لپٹی وہیں آ گئی۔ اور ایک طرف کھڑی ہو کر پیر سائیں سے بولی۔

''جی پیر سائیں، حکم۔''

''آؤ بیٹھو بیٹا۔! میں نے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔'' پیر سائیں بولا تو وہ ایک طرف پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور خاموش رہی۔ کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے تو وہ بولا۔ ''نادیہ بیٹی۔! میں نہیں جانتا کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں بہت کچھ مثبت نہیں ہے۔ جس کا اظہار تم نہیں کر پاتی ہو مگر اپنے رویے سے اظہار بھی کر دیتی ہو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایسی کیا بات ہے، جو تم کہنا چاہتی ہو مگر کہہ نہیں پاتی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''نہ دلاور شاہ تمہیں کیا احساس ہے کہ ایسا سوچا تم نے۔'' اماں بی نے آہستگی سے پوچھا۔

''دیکھیں دادی اماں، کل نادیہ بیٹی نے دربار شریف پر جانے کی اجازت چاہی، جو میں نے دے دی، میں یہ اہتمام کر دیا کہ جب تک یہ وہاں پر ہے، کوئی مرد دربار کے احاطے میں داخل نہیں ہوگا۔ لیکن اس نے وہاں کی ایک ایسی روایت کو توڑ دیا، جو وہاں نہیں ہوتی تھی۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے وہ گڑبڑا گیا۔

''میں مزار کے اندر چلی گئی تھی جہاں بڑے پیر صاحب دفن ہیں۔'' نادیہ نے آہستگی سے کہا۔

''کیوں۔'' پیر سائیں نے تحمل سے پوچھا۔

''بس۔ میرا دل کیا اور میں چلی گئی۔'' وہ تیزی سے مگر دھیمی آواز میں بولی۔

''بیٹا۔! اگر ہم ہی اپنی روایات کی پاسبانی نہیں کریں گے تو پھر دوسرا کون کرے گا۔ یہ اور بات، اصول و ضوابط اس لیے بنائے گئے ہیں کہ لوگ اپنی جگہ حصار میں رہیں۔ ان کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ وہ جہاں رہیں، وہیں تک محدود ہو جائیں۔ انہیں یہ احساس ہو کہ ہم میں اور ان میں ایک فاصلہ ہے۔''

''مگر میں تو کسی سے نہ فاصلے کے بارے میں سوچتی ہوں اور نہ قربت کے بارے میں۔ مجھے ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ میں نے اب یہ سوچا کہ میں ہفتے میں ایک دن ضرور درگاہ پر جایا کروں۔''

اس نے کہا تو پیر سائیں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بجائے اس کی بات کو سمجھ کر اس پر آئندہ عمل کرنے کا وعدہ کرتی۔ وہ تو اپنا ارادہ ظاہر کرنے لگی تھی۔ اسے ایک دم سے غصہ تو بہت آیا لیکن خود پر قابو پا کر بولا۔

"دیکھو بیٹی۔! میں جو تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ ان روایات کی حفاظت ہمی نے کرنی ہے۔ اور یہ ہم پر کسی فرض کی مانند لاگو ہیں۔"

"پیر سائیں۔! آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا سارے فرائض کی ادائیگی ہم عورتوں کے لیے ہی ہے۔ ان کا حق کوئی نہیں۔ یا پھر ہم عورتوں کی مخلوق حقوق کے لیے بنی نہیں، ان پر صرف فرائض ہی لادے جاتے ہیں۔"

"نادیہ۔!" پیر سائیں نے ایک دم سے اسے جھڑک دیا۔ "میں اگر تم سے انتہائی تحمل سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ تمہیں وہی کرنا پڑے گا، جو میں کہتا ہوں۔"

"لیکن مجھے اپنی زندگی گذارنے کا پورا پورا حق ہے اور میں حق کو پوری طرح استعمال کروں گی۔ یا پھر آپ مجھ سے میری زندگی کا حق چھین لیں۔" اس نے آنکھیں نیچی کیئے بے خوف انداز میں کہہ دیا۔ جس پر پیر سائیں نے شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے منہ پر ہی اس کا حکم ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"اگر یہ کرنا پڑے گا تو میں کروں گا۔ لیکن یہ اچھا ہے کہ تم سنبھل جاؤ۔"

"مجھے معلوم ہے پیر سائیں۔ میں نے کیا کرنا ہے۔ میں اسی دن مرگئی تھی، جب میں نے حویلی سے قدم باہر نکالا تھا۔ یہ آپ ہی کی ضد ہے کہ میری زندہ لاش کو اس حویلی کے در و دیوار میں قید کر لیا ہے۔ لاشوں پر حکم نہیں چلایا جاتا، انہیں دفن کر دیا جاتا ہے یا پھر میری طرح در گور۔۔۔۔"

پیر سائیں حیرت سے سنا اور پھر ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ وہاں رہ گئی تو ان تینوں خواتین کے درمیان خاموشی ٹھہر گئی۔ جس میں حیرت کے ساتھ خوف بھی سانس لے رہا تھا۔ تمہید ادی اماں نے کہا۔

"یہ تم نے کیا کیا بیٹی۔! دلاور شاہ کا عتاب اگر تم پر آ گیا تو بہت برا ہوگا۔"

"اب اس سے بڑا عتاب کیا آئے گا دادی اماں۔ یہ جانتے بوجھتے بھی آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔" نادیہ نے کہا اور بنا اجازت کے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اسے اب کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

پیر سائیں اپنے خاص کمرے میں بیٹھا۔ اپنے غصے اور حیرت پر قابو پا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نادیہ اس کے لیے اتنی مشکل پیدا کر دے گی۔ وہ جس قدر اسے اپنی راہ پر چلانا چاہتا، اس قدر ناکامی ہو جاتی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ نادیہ کا ایسا رویہ کیوں ہے؟ ظہیر شاہ نے بھی تو اس کا دل جیتنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اپنا کر پہلی رات اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب نادیہ کا یہ رویہ عین فطری تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بس ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ ظہیر شاہ لوٹ کر حویلی میں آ جائے۔ وہی اسے محبت اور پیار سے اپنی ڈگر پر لے آئے ورنہ نادیہ کا رویہ ایسا ہو جائے گا کہ سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی ایک نکتے پر سوچتا رہا۔ پھر اس نے ارادہ کر لیا کہ ظہیر شاہ کو واپس بلوائے گا۔ اب اس کی تعلیم سے زیادہ یہاں پر ضرورت تھی، وہ تو پھر بھی مکمل ہو جائے گا۔ اس نے فون اٹھایا اور ظہیر شاہ کے نمبر ملا دیئے۔

"جی بابا سائیں۔!" تمہیدی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

''تم ایسا کرو، فوراً واپس یہاں سلامت نگر آ جاؤ، یہاں تمہاری ضرورت ہے۔'' پیر سائیں نے کہا۔

''بابا سائیں۔!اگر آپ مجھے نادیہ کی وجہ سے بلا رہے ہیں تو میں قطعاً نہیں آؤں گا۔ میں ایسی کسی عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا جو انتہائی درجے کی بدتمیز ہو اور اسے نہ خونی رشتوں کا پاس ہو اور نہ جیسے ادب و آداب چھو کر گزرے ہوں۔''

''میں یہ مانتا ہوں کہ وہ ایسی ہے لیکن تم نے اس کے لیے نہیں آنا، ہمیں اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے متعلق جو ہمارے معاملات ہیں۔ان کے لیے آنا ہے۔تم آؤ اور اس کا دل جیتو، ہمارا مطلب نکل گیا تو پھر ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔''

''معاف کیجئے گا بابا سائیں۔وہ جس نہج پر آ گئی ہے، اب اس کا بدل جانا یا ہمارے مطلب کے لیے تیار ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہمیں خراب کرے گی۔'' اس نے صاف اور دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

''تم تو مایوس ہو گئے۔ چلو تم ایسا کرو۔ میری بات مانو اور آ جاؤ۔ یہاں دیکھ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' پیر سائیں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''بابا سائیں۔!اچھی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔وہ عورت اسی دن میرے دل سے اتر گئی جب وہ حویلی سے بھاگی تھی۔ ایسی مغرور عورت کو میں اپنی عزت بناؤں، میرا ضمیر گوارہ ہی نہیں کرتا۔ ہمارے پاس زمین جائیداد کی کون سی کمی ہے۔آپ میری بات مانیں۔اسے اس کی جائیداد سے حصہ دے کر حویلی سے چلتا کریں۔ میرا تھوڑا سا وقت رہتا ہے۔میں یہاں سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آ جاؤں گا۔ پھر میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔''

''تم مجھے مایوس کر رہے ہو بیٹا۔'' پیر سائیں نے حتمی انداز میں کہا۔

''نہیں بابا سائیں، میں مایوس نہیں کر رہا ہوں۔آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں۔ کیونکہ آپ ایک بہت بڑی غلطی کر چکے ہیں۔شعیب کے ساتھ فرح کی شادی۔۔وہ لوگ جو کبھی بھی جائیداد کے وارث نہیں بن سکتے تھے۔وہ بھی زندہ ہو گئے ہیں۔آپ کہاں کہاں کس کو قابو میں کریں گے۔کیا اب آپ فرح کا حق اسے نہیں دیں گے۔نہیں دیں گے تو وہ لے لے گی۔'' ظہیر شاہ نے حقیقت بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو بعد کی بات ہے۔۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ حویلی ہی میں آ کر رہنا شروع کر دیں تو زیادہ اچھی بات ہے۔نادیہ والا کانٹا نکلے تو شعیب ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔فرح اپنی ازدواجی زندگی میں بہت خوش ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ وہ بہت جلد میری راہ پر آ جائے گا۔تم یہ سردردی چھوڑو اور فوراً آ جاؤ۔ نادیہ کا زہر نکالنا بہت ضروری ہے۔'' پیر سائیں نے اسے تحمل کے ساتھ پھر سمجھایا۔

''میں آپ کو کیسے سمجھاؤں بابا سائیں۔!میں اس عورت سے نفرت کرتا ہوں۔خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کیا جائے۔میری طرف سے اسے آج قتل کروا دیں۔جب تک وہ حویلی میں ہے، میں نہیں آؤں گا۔۔ اگر آپ مجھے اپنی جائیداد سے عاق بھی کر دیں گے تو مجھے منظور ہے۔اسے دفعان کریں تو میں آ جاتا ہوں۔'' اس نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔'' پیر سائیں نے غصے میں پوچھا۔

''جی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ آپ مجھے اگر قبول نہیں کریں گے تو میں یہاں اپنی باقی زندگی گذار لوں گا۔ یہ میری ضد سمجھ لیں یا میری

انا۔۔۔میں اسے حویلی میں برداشت نہیں کرسکتا۔اسی لیے میں نے اس رات حویلی کو چھوڑا تھا۔باقی جو آپ فیصلہ کریں۔۔''

''اب تو کوئی فیصلہ نہیں رہ گیا۔تم نے حکم عدولی کر کے اچھا نہیں کیا۔''اس نے آزردگی سے کہا۔

''میں مجبور ہوں بابا سائیں۔!میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں لیکن اپنی ہتک نہیں۔اسے معلوم تھا کہ میں حویلی میں ہوں اور اگلے دن میری اس سے شادی ہونے والی ہے۔صرف مجھے ذلیل کرنے کی خاطر وہ حویلی سے بھاگی۔۔۔میں نے اگر بھاگی ہوئی عورت کے ساتھ شادی کی ہے تو صرف آپ کی ضد کی خاطر۔۔۔ورنہ۔۔۔میں نے انکار کر دینا تھا۔۔لیکن میں نے سوچا،میں نے کون سا یہاں رہنا ہے۔آپ مجھے مجبور نہ کریں۔۔ورنہ میں اسے طلاق بھجوا دوں گا۔پھر میرا اور اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔''

''ٹھیک ہے تم جیسا چاہو۔آؤ یا نہ آؤ۔۔مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''پیر سائیں نے روہانسے انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ظہیر شاہ اس طرح جواب دے گا۔مایوسی اس کے اردگرد طواف کرنے لگی تھی۔اسے ظہیر شاہ ہی سے امید تھی۔وہ ہی نہیں رہی۔اب اسے کچھ اور ہی سوچنا تھا۔لیکن اب اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔

نادیہ کا وجود اس کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔وہ جس قدر اس کے بارے میں سوچتا،اس قدر اسے اپنی راہیں مسدود دکھائی دیتی تھیں۔وہ اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرتا،اسی میں ناکام ہو جاتا۔ایک کے بعد ایک فیصلہ اس کی نگاہوں میں گھومتا چلا گیا۔نادیہ کے معاملے میں اس کی ضد پوری نہیں ہو پائی تھی۔ورنہ اس نے جو بھی ارادہ کیا تھا،جو بھی فیصلہ اس نے کیا وہ پورا ہوتا چلا گیا تھا۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ظہیر شاہ اسے جواب دے دے گا۔اور اس قدر نفرت انگیز انداز میں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔آخر اسی کے معاملے میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟اس کے اندر کے ضدی انسان پر ایسی کاری ضرب تھی جس سے وہ حواس باختہ ہو گیا۔وہ بجائے یہ سوچنے کے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اسے اپنی ضد سے ہٹ جانا چاہئے۔وہ ان پہلوؤں پر غور کرنے لگا کہ اس سارے معاملے کو اپنے حق میں کیسے کیا جا سکتا ہے۔اس کے پاس آخری آپشن کے طور پر ظہیر شاہ ہی کا مہرہ تھا۔جسے چلتے ہوئے وہ نادیہ پر قابو پا سکتا تھا۔لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی سوچوں کے برعکس وہ ہوا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔یہ شرط اسے بہت خوف زدہ کر دینے والی تھی کہ جب تک نادیہ حویلی میں رہے گی،تب تک وہ حویلی میں نہیں آئے گا۔اگر ایسا ہی ہو گیا تو پھر حالات اس کی دسترس میں نہیں رہیں گے۔اور نہ ہی کھیل اس کے قابو میں آئے گا۔سب کچھ بگڑ جائے گا۔وہ ہی تو ایک سونے کی چڑیا تھی جسے اس نے پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔وہ تمام تر جائیداد میں سے آدھے کی اکیلی وارث تھی۔اس پر دباؤ کی صورت میں زبیدہ سامنے آ گئی،بلاشبہ اب وہ بھی وارث ہو گی۔وہ شعیب کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔مگر کیا تو بہت ٹوٹ پھوٹ ہو گی،تمام تر جائیداد کا اکیلا مالک ہونے کا جو خواب اس نے دیکھا تھا،وہ پورا نہیں ہو پار ہا تھا۔کیا ہو بچی کھچی جائیداد پر ہی اکتفا کرے۔۔۔یا پھر اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کچھ مزید سوچے،یہ وہ نکتہ تھا جس پر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پار ہا تھا۔نادیہ کو حویلی سے اگر چلے جانے کا بھی کہہ دیا جائے تو وہاں کہاں جائے گی۔یہ اچھا ہوتا کہ وہ شعیب کے ساتھ بیاہ دی جاتی اور وہ اپنی شرائط منوا لیتا۔مگر وہ موقعہ بھی تو ہاتھ سے نکل گیا تھا۔یہ فائدہ تو ہوا کہ وہ شعیب کے فرح کو بیاہ کر اب وہ اسے اپنے ساتھ شامل کر سکتا تھا۔اب اسے یہی امید کی کرن دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی اس قدر خوبصورت بھی ہو سکتی ہے، اس کا احساس اسے پہلے کبھی نہ تھا۔ وہ جو مایوسی کے حصار میں بند ہو کر اپنی ہی ذات میں قید ہو گئی تھی، حویلی کی چار دیواری سے نکلی تو دنیا کے ہجوم میں آ گئی۔ فرح کے لیے ہر منظر ہی نیا تھا۔ اتنی تعداد میں انسان اس نے شاید زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ باہر کی دنیا اس قدر پر ہجوم اور پر شور، کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا کہ جیسے وہ خود ان مناظر میں تحلیل ہو گئی ہے۔ پر شور، پر ہجوم اور رنگین دنیا کے ساتھ ایک محبت کرنے والا شوہر اس کے ساتھ تھا۔ اس لگا جیسے حویلی کی چار دیواری کے باہر جنت ہے۔ شمالی علاقوں کی سیر کے بعد جب وہ لاہور پہنچے تو اس کے انگ انگ کی تھکن خوشی میں بدل چکی تھی۔ وہ ایک ایک منظر کو اپنے ساتھ سمیٹ کر لے آئی تھی۔ دن کے اجالے میں پہاڑوں کے درمیان سیر کرتے گذر جاتا۔ بھوک لگتی تو قریبی ہوٹل میں گھس جاتے، رات آتی تو اپنے ساتھ زندگی حسین لمحات لے کر آتی۔ جہاں دل چاہتا پڑاؤ کرتے اور پھر آگے نکل جاتے۔ اس طرح دس دن گھر سے باہر رہنے کے بعد وہ لوٹی تو اپنے ساتھ ڈھیروں یادیں لے کر آئی تھی۔ وہ زندگی کے لمحے لمحے سے خوشیاں کشید کر لینا چاہتی تھی جو اس نے کیں۔ ایک دن اور ایک رات تھکن اتارتے گذر گیا۔ اس صبح جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو کچن میں جا گھسی جہاں زبیدہ پہلے ہی چائے بنا رہی تھی۔

''پھوپھو۔ اگر آپ بھی ہمارے ساتھ ہوتی نا۔ تو مزہ آ جاتا۔'' اس نے یادوں کا لطف لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔! پھر تم دونوں کو ہر دم میرا خیال رہتا۔ اب اگر زندگی رہی تو اگلے سال میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔۔ کیونکہ تب تم دونوں کو میری بہت ضرورت ہوگی۔'' زبیدہ نے پیار سے مسکراتے ہوئے پیار سے کہا۔

''میں سمجھی نہیں، ضرورت۔۔۔'' فرح نے کہنا چاہا، پھر ایک دم اسے سمجھ میں آیا تو شرما گئی۔

''تم نے تو مجھے نہیں بتایا لیکن میں سمجھ گئی ہوں۔'' زبیدہ نے اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے پر دیکھ کر کہا۔ تب وہ بولی۔

''میں نے چھپایا نہیں، بلکہ شعیب کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر کے پاس چلیں گے، تصدیق ہونے پر امی کو بتائیں گے، تا کہ کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہ رہے۔'' وہ پر وقار انداز میں بولی

''اچھا تو یہ بات تھی۔۔ کب جانا ہے ڈاکٹر کے پاس۔۔۔؟'' زبیدہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''آج کسی وقت۔۔۔'' وہ بولی تو زبیدہ نے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔

''اس کا پتہ نہیں وہ کب جائے، میں تمہیں خود لے کر جاؤں گی۔ بس تم یہ ناشتہ وغیرہ بنا کر جلدی سے تیار ہو جانا۔۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو جاتی ہوں۔'' فرح نے سعادت مندی سے کہا اور کچن میں ہاتھ بٹانے لگی۔ زبیدہ تو چائے کا مگ لے کر باہر جا بیٹھی اور فرح انہونی سوچوں میں کھو گئی۔ اسے خود پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں جیسے مقدس رتبے پر فائز ہونے جا رہی ہے۔

دوپہر ہونے سے کافی پہلے وہ ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر کے کلینک جا پہنچیں۔ اگرچہ وہاں اتنا رش نہیں تھا مگر پھر بھی ڈاکٹر تک رسائی ہوتے انہیں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اچھی طرح تصدیق کے بعد جب وہ واپس لوٹیں تو ان کے ہمراہ یہ خوشخبری تھی کہ فرح ماں بننے والی ہے۔ زبیدہ نے تو وہیں کلینک ہی میں شعیب کو بتا دیا۔ اور پھر جب وہ گھر پہنچیں تو وہ مٹھائی لیے ان دونوں کا منتظر تھا۔ وہ اپنے رب کی شکر گذار تھی کہ اس نے اسے سب کچھ دے دیا تھا۔ وہ اب جلد از جلد سلامت نگر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ ایک نئی زندگی کا احساس ان کے لیے بہت خوش آئند تھا۔ بکھرا بکھرا سا خاندان ایک لڑی

میں پرونے کے لیے بہانہ انہیں مل گیا تھا۔ جذبات ایک خواہ مخواہ کی نرمی در آئی تھی۔ اس وقت گہری ہو چلی تھی۔ جب وہ سلامت نگر پہنچ گئے۔

اگلی صبح فرح کا دل بہت مچل رہا تھا کہ وہ حویلی جائے اور یہ خوشخبری انہیں بھی سنا دے۔ اس کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ انہیں فون ہی کر دیتی۔ اسے یہ احساس اچھی طرح ہو گیا تھا کہ شعیب حویلی والوں سے رابطہ رکھنا اور تعلق بڑھانا پسند نہیں کرتا۔ اس کی شدت تبھی سامنے آئی تھی جب وہ یہاں سے نکلنے لگے تھے۔ راستے میں اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ خود حویلی والوں سے رابطہ نہیں کرے گی۔ اور اب جو بھی تعلق ہوگا وہ شعیب کے ذریعے ہی سے ہوگا۔ اب اس کی ترجیح شعیب تھا۔ جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی بتانا تھی تب سے اگر اس نے رابطہ نہیں کیا تھا تو حویلی والوں نے بھی فون نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے شعیب کے ساتھ رابطہ کیا ہو، اگر ایسا ہوا تھا تو اسے نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی یہ بھول گئی تھی اس نے خود حویلی والوں سے رابطہ کرنا ہے۔ اب جبکہ وہ سلامت نگر آ گئی تھی۔ تب نجانے ان فضاؤں میں کچھ ایسا تھا کہ حویلی جانے کو جی مچل گیا۔ مگر اس نے لب پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ ناشتہ وغیرہ کروانے کے بعد جب شعیب کو تیار کروایا تو اس دوران اس نے اپنی خواہش کا اظہار جھجکتے ہوئے کیا۔

''کیا آپ نے حویلی والوں کو نئے مہمان کے آنے کے بارے میں بتا دیا ہے۔۔''

''نہیں، میں نے تو نہیں بتایا ممکن ہے امی نے بات کی ہو، ان سے پوچھ لو۔'' یہ کہہ کر اس نے غور سے فرح کے چہرے پر دیکھا اور بڑی نرمی سے کہا۔ ''اگر تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔''

''لیکن آپ کیوں نہیں جاتے؟'' نجانے کیوں اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے لفظ پھسل گئے۔ تب پہلی بار شعیب نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ چند لمحے یونہی تکتا رہا، پھر دھیمے لہجے میں انتہائی نرمی سے بولا۔

''فرح یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی میرا حویلی جانے کو دل نہیں کرتا۔ میں چاہنے کے باوجود بھی اپنے آپ کو مطمئن نہیں کر پاتا۔ ایسی جگہ، جہاں جا کر میں بے چینی محسوس کروں۔ تم مجھے وہاں جانے کے لیے کہہ رہی ہو۔''

''جب آپ جائیں گے تو یہ بے چینی بھی دور ہو جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اچانک وہ چونک گئی اور تشویش زدہ لہجے میں گویا ہوئی۔ ''کہیں آپ نادیہ کی وجہ سے تو نہیں۔۔''

''ممکن ہے لاشعوری طور پر ایسی ہی کوئی وجہ ہو۔ مگر میرے ذہن میں تمہارے باپ کا رویہ ہے۔ وہ حاکمیت پسند ہے، اور ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کی حاکمیت اپنے اوپر مسلط کر لوں۔ میں مانتا ہوں کہ میرا اس سے میری ماں کی وجہ سے رشتہ ہے، لیکن یہ رشتہ کبھی بھی نہیں رہا۔ میرے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک میرا دوسرا تعلق اسی سے یہ بنا کہ اس نے ناجائز کام کروانا چاہا۔ اس وجہ سے اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ اور تیسرا تعلق تمہاری وجہ سے بنا، تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا اس نے اس تعلق کو بھی دل سے قبول کیا؟ اگر کیا ہے تو کوئی ایک دلیل دو۔'' شعیب نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں میرے پاس کوئی ایسی ایک دلیل نہیں ہے۔'' فرح نے صاف گوئی سے کہا۔

''پھر بھی میرا حویلی جانے کا جواز بنتا ہے؟'' اس نے اسی دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بنتا۔'' اس نے صاف لہجے میں کہا۔

''دیکھو۔!میں تمہارے باپ جتنا امیر نہیں ہوں۔نہ ہی میرا وہ اسٹیٹس ہے جو اس کا ہے۔میرے پاس مریدین کی قوت بھی نہیں، مگر اس کے پاس ہے، وہ کل میرے خلاف سلامت نگر میں جلوس نکلوا دے اور میرا تبادلہ ہو جائے۔مجھے کرپٹ اور بے ایمان ثابت کر دے۔۔میں۔۔۔''

''نہیں وہ ایسا نہیں کریں گے۔۔''فرح تیزی سے بولی۔

''میں جانتا ہوں کہ وہ نہیں کرے گا۔۔اس وقت تک نہیں جب تک میں کرپٹ نہیں ہو جاتا۔خیر۔میں کہنا تم سے یہ چاہ رہا تھا کہ اسٹیٹس کا فرق اس نے رکھا۔وہ پیر سائیں ہے، جاگیردار ہے، سیاست دان ہے، لیکن ایک بیٹی کا باپ نہیں ہے۔ورنہ وہ اب تک ایک بار ہی سہی یہاں ضرور آتا۔کیا میں غلط کہہ رہا ہوں''

''نہیں آپ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔''فرح نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

''اب تم خود بتاؤ۔جب اس نے وہ فرق رکھا ہوا ہے۔جس میں تمہاری تضحیک ہو تو کیا مجھے حویلی جانا چاہئے۔کیا اس تضحیک کو میں قبول کر لوں اور تمہارے باپ کے حضور جا کر گڑگڑاؤں کہ مجھے اپنا داماد دل سے تسلیم کر لیں۔''اس بار اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔جس پر وہ خاموش رہی تب وہ بولا۔''دیکھو فرح۔!میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے کہ جب میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور وہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی ترس جایا کرتا تھا اور ایسا وقت بھی دیکھا ہے، جب میری ضروریات سے اتنا زیادہ مل جایا کرتا تھا کہ کوئی خواہش نہیں رہتی تھی۔یاد رکھو۔!لالچ اور خواہش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔لالچ بڑھتا ہی چلا جایا کرتا ہے اور خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں۔میرے خیال میں تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔''آخری لفظ کہتے ہوئے شعیب کے لہجے میں پھر وہی نرمی اور تحمل در آیا تھا۔فرح کچھ نہیں بولی اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔کچھ دیر بعد وہ بھی آفس چلا گیا۔

فرح سارا دن شعیب کی باتوں کو سوچتی رہی۔اس دن وہ زبیدہ کے پاس بھی بہت کم بیٹھی۔زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہی۔زبیدہ نے بھی اسے نہیں پوچھا۔اس کے ذہن میں تھا کہ ممکن ہے تھکن ہو۔یا پھر طبیعت ٹھیک نہ ہو۔اس نے خود ملازمین سے کہہ کر دوپہر کا کھانا بنوا لیا۔دوپہر سے تھوڑی دیر قبل وہ ہونقوں کی طرح اپنے کمرے سے نکلی اور سیدھی زبیدہ کے پاس آئی۔وہ کافی شرمندہ سی لگ رہی تھی۔

''سوری پھوپھو۔!میری آنکھ لگ گئی تھی۔۔کھانے کو دیر ہو گئی۔۔''

''تم جاؤ، نہاؤ دھوؤ اور تیار ہو جاؤ۔کھانے کی فکر نہ کرو۔وہ بن جائے گا۔''زبیدہ نے پیار سے کہا تو اسے اطمینان ہو گیا۔وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شام کب کی ڈھل گئی تھی۔شعیب کچھ گھر آ کر دوبارہ نکل گیا تھا۔پوچھنے پر یہی بتایا تھا کہ کوئی ضروری کام ہے۔پھر انتظار بڑھتا گیا اور وہ اس وقت واپس پلٹا جب رات کافی گہری ہو گئی تھی۔وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔لیکن ڈھلتی شام سے رات گہری ہو جانے تک عجیب قسم کے وسوسوں کا شکار ہو گئی۔اگرچہ شعیب نے اسے بڑے تحمل سے سمجھایا تھا۔لیکن آج ہی اس نے بات کی اور آج ہی اس کے معمولات میں فرق آ گیا۔بلاشبہ اس نے جو گھر میں وقت نہیں گذارا، اسے میرا پوچھنا اچھا نہیں لگا ہو گا۔وہ جس قدر ممکن ہے مجھ سے دور رہ کر اس بات کو بھلانے کی کوشش کر رہا ہو گا۔کیا میں اپنے ہی ہاتھوں اپنے چمن کو آگ لگا رہی ہوں۔کیا یہ میرا عمل درست نہیں تھا۔ایسا تو تب ہوتا ہے کہ جب وہ کسی سے شدید قسم کی نفرت کر رہا ہو۔کیا اسے حویلی والوں سے نفرت ہو چکی ہے، کیا وہ محض نادیہ کی وجہ سے نہیں جا رہا یا بابا سائیں کی وجہ سے۔اس نے جھوٹ بولا یا

پھر بیج کیا۔ وہ ان سوچوں کا اظہار زبیدہ پھوپھو سے بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے لیے نفرت ایک معمولی سی بات تھی لیکن کیا محبت میں بدگمانی کا زہر گھل گیا۔ کیا اب شعیب مجھ سے متنفر ہو گیا۔ کیا اب اس کا رویہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ کیا میں اپنی بنتی سنورتی زندگی کو شک اور بدگمانی کی بھینٹ چڑھا دوں گی۔ میں نے اگر ضد کی تو کیا وہ مزید مجھ سے دور ہو جائے گا۔ ایسے ہی نجانے کتنے سوال اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے اور وہ خوف کے مہیب سناٹوں میں یوں پھیلتی گئی کہ خود کو روکنا بھی چاہا تو نہ کر سکی۔ اور جس وقت وہ پلٹ کر گھر میں آیا تو وہ انتہائی خوف زدہ ہو رہی تھی۔ وہ ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوا ہے تجھے۔ تمہارا رنگ اتنا پیلا کیوں ہو رہا ہے؟''

چاہتے ہوئے بھی وہ جواب نہ دے سکی۔ لفظ اس کے منہ ہی سے نہیں نکل پائے تھے۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن پوری کوشش کر کے بھی نہ کہہ پائی۔ پھر اس نے مزید کچھ ہو نہ سکا تو وہ شعیب کے سینے سے جا لگی۔ آنسو تھے کہ ساون بھادوں کی مانند برسنے لگے۔ اس نے بڑے پیار سے اسے تھام لیا اور پھر اسے تھپکتے ہوئے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''فرح پلیز۔! بتاؤ کیا بات ہے۔ امی نے کچھ کہا۔''

''نہ۔۔۔ نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔''

''تو پھر کیا بات ہے۔۔'' اس نے اسے کاندھوں سے پکڑا اور بیڈ پر بٹھا لیا۔ وہ اس وقت تک خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے ذہن میں چلنے والی شک کی آندھیوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ وہ کہتی چلی جا رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ مسکراتا چلا جا رہا تھا۔ وہ جب کہہ چکی تو شعیب نے اس کے سر پر ہلکی سی دھپ مارتے ہوئے کہا۔

''اتنی سے بات پر خود کو ہلکان کر رہی ہو۔۔ صبح کی بات تو میں اسی وقت ختم کر کے چلا گیا تھا۔ وہ تو میرے ذہن میں بھی نہیں۔ ہاں بس آج اتفاق ہی تھا جو میں اتنی دیر گھر سے باہر رہا، اب تو کئی دن تک ایسا چلے گا۔ اتنی چھٹیاں بھی تو گذار کر آئے ہیں۔ میں نوکر پیشہ بندہ ہوں۔ اس طرح کیا تم روزانہ ہلکان ہوتی رہو گی۔''

''مجھے بس آپ کا اعتماد چاہئے۔۔۔ میں۔۔۔ اور کچھ نہیں چاہتی۔۔۔'' وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اب بتاؤ۔ تمہیں کیسا اعتماد چاہیے۔ اب اس سے زیادہ تجھے اور اعتماد کیا دوں۔۔ کہ تم اب میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تو فرح کو اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ وہ اس کے کاندھے سے لگ گئی۔ ''اچھا۔! اب مجھے کپڑے بدلنے دو۔ تم جاؤ اور اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔ پھر دونوں مل کر پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔''

''میں ابھی لے کر آتی ہوں۔'' وہ جلدی سے اٹھ گئی۔

''نہیں یہاں نہیں۔ اوپر چھت پر۔ آج چاندنی بہت زیادہ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر شرٹ بدلنے لگا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کچن کی جانب چل دی۔

☆☆☆

حویلی میں بھونچال آ گیا تھا۔ اماں بی سکتے میں تھی۔ زہرہ بی کی خاموشی طویل ہوگئی اور پیر سائیں کی تو جیسے دنیا ہی اندھیر ہوگئی تھی۔ نادیہ نے جب سنا تو ایک لمحے کے لیے اس کے من میں دکھ کی لہر اٹھی اور پھر وہ پہلے کی مانند وہی سکوت اس پر طاری ہوگئی۔ ظہیر شاہ نے نادیہ کے لیے طلاق بھجوا دی تھی۔

''یہ تم نے کیا کیا بے وقوف اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار لی۔۔'' پیر سائیں نے فون پر چیختے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اسے الگ کر دیں۔ حویلی نے نکال دیں۔۔تب میں آؤں گا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''وہ حویلی میں رہتی ہے یا نہیں رہتی۔ مگر اس کا طلاق سے کیا تعلق ہے۔'' اس پر اسے شدید غصہ آ گیا تھا۔

''وہ میری دنیا میں آئی ہی نہیں تھی۔ میرا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو پھر میں اسے باندھ کر کیوں رکھوں۔۔ جب تک وہ میرے نام سے بندھی رہتی، آپ اسے حویلی سے نکال ہی نہیں سکتے تھے۔ اب یہ آپ کا امتحان ہے، آپ نے مجھے اپنے پاس بلانا ہے تو اسے حویلی سے نکالنا ہو گا۔ ورنہ میں نہیں آؤں گا حویلی میں۔'' اس نے انتہائی سخت انداز میں کہا تو پیر سائیں کو ہوش آیا۔ ظہیر شاہ کی بات کو اس نے اہمیت ہی نہیں دی تھی محض اپنی ضد منوانے کے لیے اسے حکم پر حکم دیتا چلا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ اس کے سامنے آ گیا۔

''تو اتنا ہی کمزور ہے کہ ایک عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے سامنے نہیں جھکا سکا۔'' پیر سائیں دھاڑا۔

''میرا اس سے مقابلہ بنتا ہی نہیں ہے تو کیا جیت اور کیا ہار۔۔۔ مجھے اس سے کوئی اعتراض ہی نہیں ہے۔ اور پھر جس کے ساتھ میں نفرت کرتا ہوں۔ میں اسے اپنی زندگی میں نہیں رکھ سکتا۔'' اس نے واقعتاً نفرت انگیز انداز میں کہا۔

''یہ تو نے اچھا نہیں کیا ظہیر شاہ، تمہارے اس فیصلے کا نتیجہ، بہت غلط بھی ہو سکتا ہے تمہارے حق میں۔'' پیر سائیں نے اسے احساس دلایا۔

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے عاق بھی کر سکتے ہیں تو کر دیں۔ جب تک وہ حویلی میں ہے، میں وہاں قدم نہیں رکھوں گا۔ میں یہیں رہ جاؤں گا۔'' اس نے تحمل سے کہا۔

''تم صرف اپنے اکلوتے ہونے کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔ مت سمجھنا کہ میری حکم عدولی کر لو گے تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ اب تم چاہو بھی تو حویلی میں نہیں آ پاؤ گے۔ یہ میری حتمی فیصلہ ہے۔۔'' پیر سائیں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ بے جان سا ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ وہی خاص کمرہ جو اس کے لیے بہت پر سکون ہوا کرتا تھا، اس دن وہی اسے قید خانہ لگ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی بھر کی کمائی وہ لٹا چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے بڑے مان اور اعتماد کے ساتھ جس کے لیے سب کچھ کرنے کی کوشش کی تھی، وہی سے یوں دھوکا دے جائے گا۔ یہ تو اس نے سوچا نہیں تھا۔ پہلی بار اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور یہ شکست اس لیے بھی زیادہ دکھ دے رہی تھی وہ اسے اپنے بیٹے ہی کے ہاتھوں ملی تھی۔ جس کا سب کچھ چھین لینا چاہتا تھا۔ وہ اب بھی پورے وقار اور طمطراق کے ساتھ حویلی میں موجود تھی اور جس کے لیے چھین لینا چاہتا تھا، اس پر حویلی کے دروازے اس نے خود ہی بند کر دیے تھے۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ صیاد اپنے دام میں خود ہی آ گیا تھا۔ اس نے جو چاہا تھا اس کے برعکس ہو گیا تھا۔ اپنوں کے ہاتھوں سے لگا ہوا زخم کاری ہوتا ہے۔ جو بندے کو سلب کر دیتا۔ پھر ایسا وار جس سے بندہ تہی داماں ہو جائے۔ ہار جانے کا دکھ، اکلوتا

بیٹا کھو جانے کا دکھ اور پھر سب سے بڑی بات تھی داماں ہونے کا دکھ، اسے سانس نہیں لینے دے رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس سے اچھا تھا کہ نادیہ کو شعیب ہی کے ساتھ بیاہ دیتا، اس کی بیٹی تو بچ جاتی۔ اب وہ بھی اس نے زبیدہ کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ وہ جو چاہے اس سے انتقام لے۔ اب چاہے تو وہ بھی اسے چھوڑ دے۔ کیا ہو گا۔؟ یہ سوال اس کے لیے سوہانِ روح بن گیا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ حویلی سے بلاوا آ گیا۔ دیوان نے انتہائی ادب سے کہا۔

''اماں بی حویلی میں یاد کر رہی ہیں۔''

اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کہیں گی۔ اس سے یہی سوال ہو گا کہ ظہیر شاہ نے کیا کیا۔ بیٹے کے عمل کا جواب دہ وہ خود تھا۔ حالانکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور حویلی کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ واضح طور پر اس نے محسوس کیا کہ اس کے وجود میں جان نہیں رہی ہے۔ وہ جو ہر وقت خود کو زندگی سے بھرپور خیال کیا کرتا تھا، بیٹے کے ساتھ ایک فون کال کے بعد خود کو انتہائی ناتواں محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ حویلی کی جانب چل پڑا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہوئے وہ پہلی بار شرمندگی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ کیا منہ دکھائے گا وہ جا کر۔ جس کے لیے اتنا کچھ کیا، اس کا نتیجہ کیا نکلا۔؟

اماں بی صوفے پر بیٹھی ہوئیں تھیں۔ پیر سائیں خاموشی سے ان کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے یونہی گذر گئے۔ ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی جیسے وہ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہے ہوں۔ آخر اس خاموشی کو دادی اماں نے ہی توڑا۔

''یہ بہت ظلم ہوا نادیہ پر دلاور شاہ۔۔۔''

وہ دادی اماں کا لہجہ سن کر چونک گیا۔ اس میں آگ ہی آگ تھی۔ پہلی بار ایسا لہجہ جس میں آگ کے ساتھ تذلیل کر دینے والی انتہا تھی۔ اس نے پوری قوت صرف کرتے ہوئے جواباً کہا۔

''ہاں واقعی، ظلم ہوا۔۔۔''

''یہ ظلم تم نے کیا ہے دلاور شاہ۔۔۔ اس یتیم بچی کے ساتھ جو تم نے کیا۔ اس کا بدلہ وہ کمزور تو نہیں لے سکتی اس کا بدلہ تو تم سے خدا ہی لے گا۔ لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔۔۔ بالکل بھی نہیں کروں گی۔۔''

''اماں۔! میں نے تو ان کی بھلائی ہی چاہی تھی۔ آپ بھی سمجھتی ہیں کہ میری نیت ٹھیک تھی۔'' اس نے صفائی پیش کرنا چاہی تو دادی اماں نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

''غلط۔! بالکل غلط کہہ رہے ہو دلاور شاہ۔ تمہاری نیت ہی تو ٹھیک نہیں تھی۔ اس بچی کی جائیداد ہتھیانے کی خاطر تم نے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ کیا انجام ہوا اس کا۔۔۔ تمہارے ہی بیٹے نے طلاق بھیج دی۔ میں پوچھتی ہوں کیا جرم تھا اس بن ماں باپ کی بچی نے۔ آج اگر اس کا باپ زندہ ہوتا۔۔۔ تو میں دیکھتی تیری اور تیرے بیٹے کی جرات کیا ہوتی کہ تم لوگ ایسا کر سکتے۔۔۔''

''میں نے اسے سزا دے دی ہے۔ میں نے اسے حویلی میں داخل ہونے سے روک دیا ہے۔'' پیر سائیں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''تم نے نہیں، اس نے خود حویلی آنے سے انکار کر دیا ہے۔ ابھی اس نے اپنی ماں سے ساری بات کر لی ہے۔ یہ سب تیرے کیئے کا پھل

ہے۔ تیری اکلوتی اولاد تجھے چھوڑ گئی۔ ابھی تو تیرے ساتھ پتہ نہیں کیا کچھ ہونا ہے۔ تو دیکھتا جا۔۔''

''اماں آپ مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔ یہ ان دونوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کا نتیجہ ہے۔'' پیر سائیں چیخ پڑا۔

''اس جھگڑے کی بنیاد کون ہے۔ وہ بچی بے چاری چیختی رہی۔ چلاتی رہی۔ اس نے منع بھی کیا۔ لیکن۔۔۔ لیکن کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ تم نے ضد نہیں کی۔ تم نے اس شادی کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ تم نے ہر وہ جائز و ناجائز کوشش نہیں کی جو تم کر سکتے تھے۔۔ اب کیا ہوا۔ تیرا ہی لالچ تیرے منہ پر آن پڑا ہے۔'' اماں بی شعلہ جوالہ بن گئی تھیں۔

''اب کیا ہو سکتا ہے اماں۔۔ مجھے بتاؤ اس کا حل کیا ہے۔'' پیر سائیں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''حل۔! میں کیا بتا سکتی ہوں حل۔۔۔ اب تو فیصلہ ہو چکا۔۔ اب جو کچھ بھی کرے گی، نادیہ ہی کرے گی۔ میری طرف سے تو یہی سزا ہے تمہیں کہ تم فوراً سے پیشتر یہ حویلی خالی کر کے چلے جاؤ۔ میں تمہیں یہاں برداشت نہیں کر سکتی۔ یا پھر میں اپنی پوتی کو لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔'' اماں بی نے شعلہ برساتی ہوئی آواز میں جب حتمی لہجے میں کہا تو وہ چونک گیا۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ عتاب اس پر آ جائے گا۔ حویلی چھوڑنے کا مطلب کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کوئی بھی چھوڑتا، وہ خود اپنی بیوی کو لے کر جاتا تو سارے زمانے میں، مریدین میں، سیاست دانوں اور جاگیرداروں میں اس کی کیا وقعت رہ جاتی۔ اور اگر اس کی ماں، اماں بی اور بھتیجی جواب اس کی بہو بھی تھی۔ وہ اگر حویلی چھوڑ کر چلی جاتی ہیں تو پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک ایسی صورت حال میں پھنس گیا تھا کہ نہ نگلنے بنتی تھی اور نہ اگلتے۔ لمحہ بھر میں جو اس نے چشم تصور میں آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچا تو کانپ کر رہ گیا۔ اب تک کی بنی بنائی ساری عزت خاک میں مل جانے والی تھی۔ وہ جو ایک عقیدت مندی کا تصور اس کے ساتھ جڑ گیا تھا، اب کہاں رہتا۔ یہی وہ وقت تھا جسے سنبھالنا بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنے لہجے میں حد درجہ درد بھرتے ہوئے کہا۔

''اماں بی۔! ظہیر شاہ کی غلطی کی سزا آپ مجھے کیوں دے رہی ہیں۔ میں نے تو کبھی ایسا نہیں چاہا تھا اور نہ ہی چاہ سکتا ہوں۔''

''تم نے اگر اتنی ضد کر کے، اپنی انا کا مسئلہ بنا کے ظہیر کی شادی نادیہ سے کی تھی تو اس کے ذمہ دار تم ہو۔ وہ بے چاری ایک رات کی سہاگن نہیں اور اسے طلاق یافتہ بنا کر رکھ دیا۔ اس نے کیا جرم کیا تھا تیرا۔ کیا قصور ہے اس بچی کا، کیوں مسلسل اسے ظلم کا شکار کر رہے ہو۔'' اماں بی پھٹ پڑیں۔

''اماں۔! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے کیا معافی مانگنا ہے تم نے۔۔ اس یتیم سے معافی مانگو جس پر تم نے ظلم کیا۔۔۔ وہ اگر معاف کر دیتی ہے تو کر دے۔۔۔ لیکن اگر اس نے تمہیں معاف نہیں کیا تو میں ہر حال میں اس کے ساتھ کھڑی ہوں۔۔ یہ یاد رکھنا۔۔ جو میں کہا ہے۔۔ اب وہی ہونا ہے۔۔''

''آپ نادیہ کو بلائیں۔۔! میں آپ کے سامنے اس سے معافی مانگتا ہوں۔'' پیر سائیں نے انتہائی لجالت سے کہا۔

ایسا کہتے ہوئے اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی نوکرانی کو اشارہ کر دیا کہ وہ نادیہ کو بلا لائے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی۔ ان دونوں میں خاموشی چھا گئی۔ کسی نے ایک لفظ بھی کچھ نہ کہا جیسے کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس لفظ نہ ہوں۔ کتنا ہی وقت یونہی گذر گیا۔ تبھی سفید لباس اور سفید

آنچل میں ملبوس نادیہ وہاں آ گئی۔اس نے کافی حد تک اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔اس نے آتے ہی کہا۔

''جی پیر سائیں۔!''

''بیٹی۔!میں ظہیر شاہ کے رویے پر ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگتا ہوں۔۔۔اس نے جو کیا، غلط کیا۔میں نے اسے حویلی میں قدم رکھنے سے منع کر دیا ہے۔میں اب اسے عاق بھی کر دوں گا۔۔''پیر سائیں انتہائی دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ تو آپ کا فیصلہ ہے نا۔۔۔آپ جو چاہیں کریں۔۔''نادیہ نے سنتے ہوئے چہرے سے کسی بھی جذبے سے عاری لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب بیٹی۔!میں جو تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔۔''وہ تیزی سے بولا۔

''کیا اس طرح معافی مانگنے سے میرا طلاق یافتہ ہونے کا داغ مٹ جائے گا۔؟''اس نے پرسکون لہجے میں کہا تو ایک دم سے بھونچکا رہ گیا۔اسے امید نہیں تھی کہ نادیہ اس سے ایسا سوال کرے گی۔جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔وہ حیرت اور اذیت سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دھیمے سے شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔

''میں مانتا ہوں بیٹی کہ اس نے بڑا ظلم کیا۔۔اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔اسے یہ۔۔۔''

''نہیں چاہے تھا کہ حویلی کی روایات کو توڑتا۔۔۔اس نے ان روایات کو توڑا۔۔آپ کے بیٹے نے مجھے آزاد کر دیا۔۔۔اور خود بھی آزاد ہو گیا۔پیر سائیں۔!میں یہ جانتی ہوں کہ اسے آپ نے آنے سے منع کیا ہے یا نہیں کیا۔۔۔لیکن وہ اس وقت یہاں نہیں آنا چاہتا تھا جب تک میں یہاں پر ہوں۔۔۔کیا آپ اس سے انکار کرتے ہیں۔۔؟''اس بار نادیہ کے لہجے میں کافی حد تک غصہ اتر آیا تھا۔تب وہ بولا۔

''میں سمجھا شاید وہ صرف اپنی بات منوانے کے لیے ایسی بات کر رہا ہے۔۔''

''اس نے جو کر دیا۔یہ اس کا فیصلہ تھا اب جو میں کروں گی۔یہ میرا فیصلہ ہوگا۔یہ ٹھیک ہے کہ آپ میرے چاچا ہیں۔اس رشتے سے میں انکاری نہیں ہوں۔لیکن جو سلوک آپ نے اور آپ کے بیٹے نے میرے ساتھ کیا۔اب اس کے بعد آپ کو مجھ پر کوئی مان نہیں رہا۔اب آپ مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔اماں اگر جانا چاہتی ہے تو میرے ساتھ چلے، ورنہ میں نے تو یہاں سے جانا ہی ہے۔ایک طلاق یافتہ عورت اپنے سسرال کیسے رہ سکتی ہے۔''اس دفعہ نادیہ کے لہجے میں اعتماد تھا جیسے وہ انتہائی پختہ ارادہ کر چکی ہو۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی۔!تم اسی طرح حویلی کی بیٹی ہو۔جیسے پہلے تھی۔تم کیوں حویلی چھوڑ کر جاؤ گی۔''پیر سائیں نے سارے جہاں کی شفقت اپنے لہجے میں بھرتے ہوئے کہا۔

''وہ اس لیے پیر سائیں کہ مجھے اب اپنے والدین کا سوال بھی کرنا ہے۔۔۔مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ انہیں قتل کیوں کیا گیا۔۔۔؟''نادیہ کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔اس کا اتنا کہنا ہی تھا کہ پیر سائیں یوں چونکا جیسے اس نے اپنے سامنے زہریلا ناگ دیکھ لیا ہو۔

''تمہارے ذہن میں یہ زہر کس نے بھر دیا نادیہ۔!وہ تو ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔اور یہ ایک ایسا المیہ تھا کہ۔۔۔''

''جھوٹ بولتے ہیں آپ۔۔۔وہ حادثہ نہیں تھا، انہیں قتل کیا گیا ہے۔اگرچہ اس وقت میرے پاس ثبوت نہیں ہے۔لیکن بہت جلد میں

اپنے ماں باپ کے قاتل کے گلے میں پھندا ڈال دوں گی۔۔اور آپ مجھے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتے۔۔۔'' نادیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں کہہ رہا ہوں نا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' پیر سائیں نے چیخ کر کہا۔

''آپ کس ناطے سے مجھے یہ بات کہہ رہے ہیں؟'' اس نے انتہائی طنزیہ انداز میں پوچھا۔تو پیر سائیں کو چپ لگ گئی۔اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔چند لمحے خاموشی کے بعد وہ بولی۔''سنو پیر سائیں۔!میں نے اپنی عدت کے دن گذارنے ہیں۔وہ میں کہیں بھی گذار لوں گی۔اس کے بعد میں نے اپنے والدین کے قاتلوں کی تلاش میں لگ جانا ہے۔میں بڑی آسانی کے ساتھ شعیب سے شادی کر سکتی تھی۔میں لاہور ہی سے نہ آتی۔اور اگر میں لاہور زبیدہ پھوپھو کے پاس نہ پہنچ جاتی تو شاید مجھے معلوم ہی نہیں ہونا تھا کہ میرے والدین کو قتل کیا گیا ہے۔میں بھی اسے حادثہ ہی تصور کرتی رہتی۔میرا سوال یہ ہے کہ مجھے یتیم کیوں کیا گیا؟ کیا مجھے یہ سوال پوچھنے کا حق نہیں ہے؟ میں نے شعیب کو انکار ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہ کرے اور میں اپنے والدین کے قاتلوں کی تلاش کر سکوں۔یہ میرا حق ہے اور میرے اس حق سے مجھے کوئی بھی دستبردار نہیں کر سکتا۔'' نادیہ جس طرح لفظ کہتی چلی گئی تھی۔پیر سائیں کا رنگ فق ہوتا چلا گیا۔اسے یہ بالکل بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔ان کے درمیان خاموشی طاری ہوگئی تھی۔وہ جس سے معافی کا طلب گار تھا۔وہی اسے تعزیر سنا رہی تھی۔بڑی مشکل سے اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''نادیہ بیٹی۔!کیا تم یہ سب بھول نہیں سکتی۔تم جو چاہو۔میں ہی ماننے کو تیار ہوں۔دیکھو۔اب تک جو حویلی کی عزت و وقار بن چکا ہے۔خدا کے لیے اسے داؤ پر مت لگاؤ۔تمہیں اس میں کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔قاتل مل سکیں گے یا نہیں،اس سے ہٹ کر دشمن اسی تک میں ہیں کہ ذرا سی کمزوری ملے تو وہ اس کا فائدہ اٹھائیں۔بنا بنایا بھرم ختم ہو جائے گا۔۔۔ظہیر شاہ کی نادانی ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔۔اسے ہم خود ہی حل کر لیں گے۔۔حویلی کا بھرم مت توڑو۔۔۔''

''آپ نے اس حویلی کی روایات کو نہیں توڑنے دیا۔سانس تک سلب کر لیں۔میں نے آپ کے ہر فیصلے کو تسلیم کیا۔لیکن کیا میں اپنا حق مانگ سکتی۔۔کیا آپ میرا حق بھی اب سلب کر لیں گے۔میں قانون کی مدد تو لوں گی۔۔اب مجھے انصاف ملتا ہے یا نہیں ملتا۔۔یہ اللہ جانے۔۔کیا آپ شرماں مائی کے قتل سے انکار کرتے ہیں؟'' نادیہ نے کہا تو پیر سائیں کی جیسے جان ہی نکل گئی۔وہ کچھ نہ کہہ سکا اور اس قدر حیرت سے اپنی ماں کے چہرے پر دیکھا۔جیسے ایک آگ میں جلتا ہوا بچہ اپنی ماں سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے۔اماں بی نے ایک بار گی اس کی طرف دیکھا،اسی لمحے اس کی نگاہ حسرت و یاس کی تصویر بنی نادیہ پر پڑی۔تب اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔پیر سائیں اٹھا اور حویلی سے نکلتا چلا گیا۔وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔اسے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ حویلی میں بغاوت اس قدر ہو جائے گی کہ اس کا سب کچھ خس و خاشاک کی مانند بہہ جائے گا۔زندگی میں بہت سارے معاملات،انتہائی گھمبیر حالات اور نازک ترین،مسائل سے بھی اس کا واسطہ پڑا تھا۔لیکن یہ وقت اس پر آن پڑا تھا۔یہ اس کی اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔وہ بڑی مشکل سے اپنے کمرہ خاص میں آیا۔اور اس معاملے پر سوچنے لگا۔جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔!لیکن اب آنے والے وقت کو وہ کیسے اپنی دسترس میں کرے گا۔اس کا شعور اسے خوفناک ترین منظر دکھانے لگا تھا۔نادیہ اور دادی اماں اگر حویلی

سے چلی جاتی ہیں تو کیا ہوگا؟ انہوں نے اگر قانون کی مدد لے لی تو پھر رسوائی کس حد تک جائے گی۔ قتل کی تفتیش یا اگر حویلی تک آ گئے تو کیا ہوگا؟ مریدین کا ایک حلقہ جو اس کی عقیدت میں جان دینے کو تیار رہتا ہے، اس کا کیا ہوگا؟ حویلی کی شان و شوکت مٹی میں مل جائے گی۔ جس حویلی کی خواتین نے کبھی باہر قدم نہیں نکالا تھا، وہ اگر تھانے اور عدالتوں میں کھڑی ہو کر اسے کٹہرے میں لا کھڑا کریں گی تو وہ منظر کیا ہوگا؟ وہ نادیہ کو ہی نہیں جواب دہ نہیں ہو سکا تھا تو شرماں مائی کے لواحقین کے سامنے کیا جواب دہ ہوگا۔ وہ چشم تصور سے خود کو عدالت کے کٹہرے میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور نادیہ اس پر الزام لگا رہی تھی، اور اس کی ماں، وہ اس کے خلاف گواہ کے طور پر اسی عدالت میں بیٹھی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ سارے چہرے اس کی نگاہ میں آ گئے جن کی آواز دبانے کے لیے اس نے ظلم کیے تھے۔ اس حویلی کی آن بان شان بڑھانے کے لیے جو کچھ اس نے کیا تھا۔ وہی اس کے گلے کا پھندا بن کر اس کے سامنے جھول رہا تھا۔ اچانک اس کے بائیں پہلو میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ جس سے اس کا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ساری سوچیں بس ایک نقطے پر مرتکز ہو گئیں۔ زندگی کا رنگین پرندہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگا۔ ہوس سے بندھے سارے دھاگے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے۔ حیاتی کے منصوبہ پر موت کی لکیر پھرنے لگی۔ اس نے چاہا کہ دیوان کو آواز دے۔ پوری کوشش بھی کی۔ لیکن حسرت لفظ میں تبدیل نہ ہو سکی۔ لفظ منہ میں ہی سے نہ نکل سکا۔ بس سانس سرسرا کر رہ گئی۔ آنکھوں کے سامنے منظر دھندلانے لگے۔ پھر اسے یوں لگا کہ سارے منظر پگھل گئے ہیں۔ رنگوں کی شناخت ختم ہو گئی۔ سانس کی جو ڈوری تھی اس کو جھٹکے لگنے لگے۔ اس نے ہوا میں سہارا تلاش کرنے کی لاشعور کوشش کی مگر اس کا بے جان ہاتھ زمین پر آ رہا۔ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

☆☆☆

پیر سائیں کو درگاہ کے احاطہ ہی میں دفنا دیا گیا تھا۔ مریدین کے علاوہ شہر کے عمائدین، سیاست دان و جاگیر دار کی ایک کثیر تعداد وہاں موجود تھی۔ ظہیر شاہ نہیں پہنچ سکا تھا۔ ہجوم میں چہ میگوئیاں تو ہوئیں۔ لیکن ہر کسی نے اپنی سوچ کے مطابق خود ہی وجہ اخذ کر لی۔ کیونکہ ظہیر شاہ کی جگہ شعیب موجود تھا۔ تجہیز و تکفین اگرچہ دیوان ہی کر رہا تھا۔ لیکن تمام تر معاملات اسی کی زیر نگرانی ہو رہے تھے۔ جس کسی نے دیوان سے پوچھا کہ ظہیر شاہ کیوں نہیں پہنچا تو اس کے پاس ایک ہی بہانہ تھا۔ اس نے لوگوں کو یہی کہا کہ والد صاحب کی اچانک وفات کا سن کر صدمے سے انہیں دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ لندن ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ ڈاکٹروں نے اتنا طویل سفر کرنے سے منع کیا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ بات لوگوں میں پھیلتی چلی گئی۔ تاہم شعیب کو دیکھ کر کسی نے بھی اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ سب لوگ اسی سے افسوس کرتے ہوئے چلے گئے تھے۔ زہرہ بی جہاں عدت کے لیے بیٹھ گئی وہاں اسے بیٹے کے بچھڑے کا بھی غم شدت سے تھا۔ اس نے اپنے بیٹے سے بہت کہا کہ تم آ جاؤ، لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔

''بابا سائیں نے اپنی زندگی میں میری جگہ اس عورت کو ترجیح دی، جس سے میں شدت سے نفرت کرتا ہوں۔ وہ اب بھی حویلی میں ہے اور بقول آپ کے بابا سائیں نے اس سے معافی بھی مانگی۔ مگر اس بدذات عورت نے معافی نہیں دی۔ میں اب بھی اس کے ہوتے ہوئے حویلی میں آ جاؤں۔ یہ ناممکن ہے اماں جی۔۔۔ ناممکن۔۔۔''

''میں بیٹا یہاں اکیلی۔ ! کس کے سہارے پر رہوں'' زہرہ بی نے کمزور سی دلیل کا سہارا لیا۔

''آپ کو اپنے عدت کے دن تو وہیں گذارنا پڑیں گے۔ پھر اس کے بعد میں دیکھ لوں گا کہ کیا کرنا ہے۔'' اس نے حتمی انداز میں جواب دیا تھا۔ اور زہرہ بی خاموش ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے تک سمٹ گئی تھی۔ باہر کیا ہو رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ حویلی میں آنے والی خواتین سے وہ نہیں ملی، وہ ان سے بات چیت کرنے کی ہمت ہی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس نے سب کچھ دادی اماں پر چھوڑ دیا اور وہ افسوس کے لیے آنے والی عورتوں سے ملتی رہیں۔

پیر سائیں کو فوت ہوئے دو دن گذر گئے۔ اگلی صبح سوئم کی رسم تھی۔ یہ وہ موقعہ ہوتا تھا جب نئے پیر سائیں کا اعلان کیا جاتا تھا۔ درمیان میں فقط ایک رات تھی۔ بڑے کمرے میں دادی اماں اپنی ہی سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی کہ ملازمہ نے دیوان کے آنے کی بابت اطلاع دی۔ اماں نے اسے آنے کی اجازت دے دی۔ وہ بڑے مودب انداز میں ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''بولو دیوان۔ ! کیا کہتے ہو؟'' اماں بی نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

''کل صبح سوئم کی رسم کے لیے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ مریدین کی ایک کثیر تعداد آئے گی۔ اس کے علاوہ بہت زیادہ لوگ ہوں گے۔''

''اگر انتظامات ہو گئے ہیں تو اچھی بات ہے۔ اب تم کیا چاہتے ہو'' انہوں نے پوچھا۔

''میں معلوم کرنے آیا تھا دادی اماں کہ کل ظہیر شاہ تو ہیں نہیں، دستار بندی کے بارے میں کیا جواب دیں گے۔ پہلے تو جھوٹ سچ چل گیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟'' دیوان نے خاصی تشویش سے پوچھا۔

''تم نے کیا سوچا ہے؟'' وہ بولیں۔

''یہ جھوٹ وقتی طور پر تو چل جائے گا کہ ابھی انہیں ہسپتال سے فارغ نہیں کیا گیا۔ یا ڈاکٹرز نے سفر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ لیکن یہ بھی تو کوئی امید نہیں ہے کہ وہ کب تک یہاں پہنچ پائیں گے یا آئیں گے ہی نہیں۔ اگر ہم چہلم تک کا اعلان کر دیتے ہیں تو کیا اس وقت وہ آ پائیں گے۔ کوئی امید ہے؟'' دیوان نے کسی موہوم امید کا سہارا لینا چاہا۔ تو اماں سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر سر اٹھا کر بولیں۔

''دیوان جو کچھ ظہیر شاہ نے کیا، کیا اب بھی وہ اس قابل ہے کہ اسے اس حویلی میں داخل بھی ہونے دیا جائے۔ اسے اگر اپنی بیوی سے کوئی مطلب نہیں تھا تو اپنے باپ کی وفات پر آ جاتا۔ آخر وہ کس برتے ضد کر رہا تھا۔ کم از کم میں اپنی زندگی میں اسے حویلی میں داخل نہیں ہونے دوں گی۔'' انہوں نے حتمی لہجے میں کہا تو دیوان ایک دم سے مایوس ہو گیا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

''پھر تو سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو جائے گا۔ کیا جواب دیں گے لوگوں کو۔ پیر سائیں کا جانشین ضروری ہے۔ میرا تو خیال ہے، اعلان کر دیتے ہیں۔ یہ بعد کی بات ہے کہ ظہیر شاہ کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔'' دیوان نے صلاح دی۔

''ظہیر شاہ گدی نشین نہیں ہوگا۔ یہ حتمی فیصلہ ہے۔'' اماں بی نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔

''تو پھر دادی اماں، میرے لیے کیا حکم ہے؟'' دیوان نے انتہائی احترام سے کہا۔

''میں صبح تمہیں بتا دوں گی کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی تم جاؤ'' اماں بی نے کہا تو وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ پھر واپس پلٹ گیا۔

اماں بی کے ذہن میں بھی کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس مسئلہ سے آنکھ چرائی جا سکتیں۔ دستار بندی تو ہوتا تھی اور ظہیر شاہ کے بارے میں وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ تبھی اس کے ذہن میں شعیب کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو اس خاندان کا فرد تھا۔ کیوں نا اسے گدی نشین بنا دیا جائے؟ یہ خیال آتے ہی اس نے ملازمہ سے کہا کہ زبیدہ شعیب اور زہرہ کو بڑے کمرے میں لے آؤ۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی ایک ایک کر کے بڑے کمرے میں جمع ہو گئے۔ صرف نادیہ اپنے کمرے میں تھی۔ اماں بی کو معلوم تھا کہ وہ شعیب کے سامنے نہیں آئے گی۔

''اماں کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا۔'' زبیدہ نے پوچھا تو انہوں نے دیوان کے آنے اور اس کی گفتگو بارے سب کو بتا دیا۔

''ہاں۔ یہ مسئلہ تو کل ہوگا؟'' زبیدہ نے تشویش سے کہا۔

''نہیں ہوگا، کیونکہ اب ظہیر شاہ کی تو کوئی گنجائش نہیں، اب اس خاندان میں شعیب ہی ہے جو اب اس ذمہ داری کو نبھائے۔'' یہ کہتے ہوئے دادی اماں نے شعیب کی طرف دیکھا تو سبھی چونک گئے۔ تبھی وہ نہایت تحمل سے بولا۔

''اماں بی۔! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں اس ذمے داری کا اہل نہیں ہوں، میں گنہ گار بندہ اتنے زیادہ لوگوں کے جذبات و احساسات کے ساتھ نہیں کھیل سکتا۔''

''لیکن بیٹا۔! یہ دنیا داری تو بھی چلانا ہے۔ تم سمجھاؤ اپنے بیٹے کو۔'' اماں بی نے ایک ہی وقت میں شعیب اور زبیدہ سے کہا۔

''میں مانتا ہوں اماں کہ یہ دنیا داری ہے مگر میں اپنے ضمیر کے سامنے بھی جواب دہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مال و دولت کی فراوانی ہو

گی۔مگر کیا کروں گا ایسی دولت کا جس سے میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے۔ میں بہر حال اس کا اہل نہیں ہوں۔''

''شعیب۔!'' کمرے کے باہر سے نادیہ کی آواز گونجی تو سبھی نے ادھر دیکھا۔وہ اگرچہ کمرے میں نہیں تھی لیکن اس کے باہر ہونے کا انہیں یقین ہوگیا تھا۔''شعیب آپ دادی اماں کی بات مان لیں۔''

''کیوں مان لوں میں۔!صرف اسی وجہ سے کہ میں اس خاندان کا فرد ہوں۔تم بھی جانتی ہو کہ گدی نشین ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔جیسے خود ہاتھ اٹھانا نہیں آتے۔وہ کسی کے لیے کیا دعا کر سکے گا۔صرف مال و دولت اکٹھا ہی تو مقصد نہیں ہے نا۔''اس نے بڑے دھیمے مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ مال و دولت اکٹھا نہ کریں۔مگر لوگوں کی پریشانیاں دور کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''نادیہ نے دلیل دی۔

''وہ الحمدللہ میں کر رہا ہوں۔مزید کی مجھے ضرورت نہیں۔''

''دیکھو شعیب،یہ مرد کی دنیا ہے۔ہم حویلی کی عورتیں،وہ کچھ نہیں کر سکتیں جو آپ کر سکتے ہو۔جب ہم آپ سے درخواست کر رہی ہیں تو آپ کو ہماری بات ماننا چاہیے۔قدرت کی طرف سے جب یہ رتبہ آپ کو تفویض کیئے جانے کے حالات بن گئے ہیں تو آپ کیوں منع کر رہے ہیں۔اور جہاں تک صلاحیت یا اہلیت کی بات ہے تو یہ اتنی بڑی بات نہیں،اللہ تعالیٰ خلوص نیت دیکھتا ہے،آپ دردِ دل کے ساتھ انسانیت کی خدمت کریں۔رب تعالیٰ برکت دے گا۔''نادیہ نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں سکون سے کہا تو وہ بولا۔

''دیکھو نادیہ ضد نہیں کرتے،یہ حق ظہیر شاہ کا ہے،اس کا انتظار کر لیا جائے تو میرے خیال میں زیادہ بہتر ہے۔کل اعلان ہی کرنا ہے تو وہ میں کر دوں گا کہ جب تک وہ یہاں نہیں آجاتے،اس وقت تک دستار بندی نہیں ہو سکتی۔ویری سمپل۔''شعیب نے ایک دوسری طرح سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''پوچھ لیں زہرہ بی سے،کیا انہیں امید بھی ہے کہ ظہیر شاہ یہاں آئے گا؟''نادیہ نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو شعیب نے زہرہ بی کی جانب دیکھا جو سر جھکائے حسبِ معمول خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔وہ کافی دیر یونہی بیٹھی رہی تو اس نے پوچھا۔

''آپ جواب دیں نادیہ کی بات کا۔۔۔''

''نہیں،وہ یہاں نہیں آئے گا۔اس نے کہا ہے کہ جب تک نادیہ اس حویلی میں ہے،وہ یہاں قدم نہیں رکھے گا۔''زہرہ بی نے دکھتے ہوئے لہجے میں کہا۔اس پر وہ چند لمحے خاموش رہا،پھر بولا۔

''چلیں۔!آپ اس سے پوچھ لیں،بلکہ اسے بتا دیں کہ دادی اماں اور نادیہ اس حویلی میں نہیں رہیں گیں۔وہ آجائے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔میں خود اسے یہاں آنے کی اجازت نہیں دوں گی۔''اماں بی نے سخت لہجے میں کہا۔

''اماں بی۔!اب کسی مسئلے کا حل تو نکالنا ہے نا۔۔اس کی چیز ہے،اسے دے دی جائے،ایک ہی سال میں ایسی حویلی کھڑی ہو جائے گی،آپ فکر مند کیوں ہوتی ہیں۔''شعیب نے اسے سمجھایا تو ایک دم سے نرم ہوتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا۔! وقت اور حالات نے تمہیں ہمارے خاندان کا سربراہ بنا دیا ہے۔ میں تمہاری ہر بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔ مگر میں ظہیر شاہ کو معاف کر دوں یہ ناممکن ہے۔''

''میں ساری بات سمجھتا ہوں دادی اماں، آئندہ کیا ہوگا۔ میں نے وہ بھی سوچ لیا ہے، ایک بار آپ زہرہ بی کو فون تو کر لینے دیں۔'' اس نے انتہائی تحمل سے کہا تو دادی اماں نے اجازت دے دی۔

''ٹھیک ہے کر لے فون۔''

فون منگوایا گیا اور زہرہ بی نے اپنے بیٹے سے رابطہ کیا۔ سبھی سن رہے تھے۔ کچھ دیر تمہیدی باتوں کے بعد جب زہرہ بی نے یہاں کی ساری صورت حال بارے بتا کر پوچھا تو وہ بولا۔

''ٹھیک ہے، اگر وہ حویلی سے چلے جاتے ہیں۔ تو میں آجاؤں گا۔''

''لیکن پھر تمہاری بہن حویلی میں آجائے گی۔ پوری زندگی کے لیے۔'' فرح نے ایک دم سے چیختے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی، تم اپنے گھر میں خوش ہو۔'' وہ بولا۔

''نادیہ کی یہ شرط اس لیے تھی کہ تمہاری بہن کا گھر بس جائے، جس کو یہ امید نہیں تھی کہ اس کی کبھی شادی بھی ہوگی۔ اس نے میری اتنی عزت کی، میرا مان رکھا اور میں اس کی تذلیل ہونے دوں۔ ظہیر شاہ، تم نہیں آتے تو نہ آؤ، اگر آنا ہے تو انہی کی موجودگی میں آنا ہوگا۔ ورنہ میں شعیب کا گھر چھوڑ کر حویلی میں آجاؤں گی۔ کیا صرف تم ہی ضد کرنا جانتے ہو۔ بابا سائیں کی موت تمہاری وجہ سے ہوئی اور اس کا الزام تم نادیہ پر ڈال رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اسے طلاق بھیجتے ہوئے تمہیں اپنی بہن کا ذرا بھی خیال نہیں آیا۔''

''ٹھیک ہے، میں کبھی حویلی نہیں آؤں گا۔ تم لوگ یہ سمجھ لو، میں تم لوگوں کے لیے مر گیا ہوں۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔

''تو پھر تمہیں مر ہی جانا چاہئے۔'' فرح نے انتہائی تلخی سے کہا تو دوسری طرف سے لائن کٹ گئی۔ فرح چند لمحے تیز تیز سانس لیتی رہی، پھر شعیب کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''اس وقت یہ خاندان انتہائی نازک حالات سے گذر رہا ہے۔ اس وقت اس کی عزت و وقار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح آپ کو اپنی نوکری چھوڑنا ہوگی۔ لیکن میں لکھ کر دیتی ہوں کہ میری تمام جائیداد آپ کے نام، امی بھی ابھی دے دیں گی۔''

''اور فرح میں بھی اپنی جائیداد شعیب کے نام کر دوں گی۔'' نادیہ نے کمرے کے باہر سے کہا۔ چند لمحے بعد بولی۔ ''فی الحال آپ چھٹیاں لے لیں۔ جب آپ کے نام یہ سب ہو جائے تو آپ نوکری چھوڑ دیں۔''

شعیب سر جھکائے چند لمحے سوچتا رہا، جیسے کسی فیصلے پر پہنچ جانا چاہتا ہو۔ پھر ایک دم سر اٹھا کر بولا۔

''نادیہ۔ کچھ وقت پہلے تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا، وہ تمہیں یاد ہے؟''

''ہاں یاد ہے۔۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''تم نے مجھ سے کہا تھا کہ کیا مجھے تم سے محبت ہے؟ آج میں تم سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟'' شعیب نے بڑے

گھمبیر لہجے میں پوچھا۔ تو چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

''ہاں۔! ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ختم تو نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر آج میں تمہیں اس ناطے ایک درخواست کرتا ہوں۔۔ مجھے گدی نشین ہو جانے کا حکم مت دو۔ بلکہ یہ ذمہ داری تم سنبھالو۔''

ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ یوں جیسے وہاں موجود ہر ذی روح کی سانس رک گئی ہو۔ انہوں نے انتہائی حیرت سے شعیب کی دیکھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔؟'' نادیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے، کیا تم انسان نہیں ہو۔ کیا تمہارے اندر جذبات و احسات نہیں ہیں۔ کیا تم لوگوں کے کام نہیں آسکتی۔ تم باپردہ رہ کر بھی انسانیت کی خدمت کر سکتی ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے جتنے بھی باہر کے معاملات ہوں گے، میں انہیں دیکھوں گا۔ تمہیں جہاں بھی مشکل پیش آئے گی، میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ بولو، کیا تم میری بات مانتی ہو؟'' شعیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سنجیدگی سے کہا۔ دوسری طرف خاصی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''جی، میں آپ کا حکم مانتی ہوں۔'' اس کی آواز آتے ہی سب چونک گئے۔

''تم نے میرا مان رکھ لیا۔'' شعیب نے خوشدلی سے کہا۔

''لیکن۔! یہ کیسے ہوگا۔ کیونکر ہوگا۔۔ یہ سب آپ نے دیکھنا ہے۔'' نادیہ نے کہا۔

''میں دیکھ لوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے سب کے چہروں پر دیکھا کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ سو وہ بولا۔ ''کیا آپ اس فیصلے پر مطمئن ہیں۔''

''اب تو جو تم چاہو گے۔ وہی ہوگا بیٹا۔!'' دادی اماں نے کہا اور اپنا سر جھکا لیا۔

اس صبح حویلی کے اندر اور باہر لوگوں کا جم غفیر تھا۔ دیوان کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ دادی اماں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ منتظر تھا کہ حویلی سے اس کے لیے کیا پیغام آتا ہے۔ ایصال ثواب کی خصوصی دعا ہو چکی تو ایک بے چینی پھیل گئی۔ ظہیر شاہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب نیا پیر سائیں کون ہوگا؟ ایسے ہی لمحات میں شعیب نے آگے بڑھ کر اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا، ان میں مریدین خاص بھی تھے۔ عمائدین شہر اور سیاست کی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے۔ وہ سب شعیب کی بات سننے کے لیے متوجہ ہو گئے۔ اس نے چند تمہیدی باتوں کے بعد کہا۔

''رسم کے مطابق اس وقت پیر سائیں کی دستار بندی ہونا چاہیے تھی۔ لیکن کچھ ضروری وجوہات کی بناء پر دلاور شاہ صاحب کے بیٹے ظہیر شاہ تشریف نہیں لا سکے۔ کچھ عرصہ تک امکان بھی نہیں ہے کہ وہ تشریف لا سکیں۔ لندن میں ان کے ساتھ مسلسل رابطہ ہے اور انہی کی خواہش ہے اس فیصلے میں پوری طرح شامل ہے جو میں آپ کے علم میں لانا چاہ رہا ہوں۔'' اس نے اتنا کہا تو ایک دم ہر طرف سکوت چھا گیا۔ ہر ایک کو تجسس تھا۔ سب متوجہ تھے۔ تبھی اس نے کہا۔ ''فیصلہ یہ ہوا ہے کہ ظہیر شاہ صاحب کی دستار بندی نہیں ہوگی۔ بلکہ دلاور شاہ صاحب کے بڑے بھائی صاحب کی بیٹی کے سر آنچل دے دیا جائے گا۔ اب وہ گدی نشین ہوں گی۔''

اس فیصلے نے پورے ہجوم میں بے چینی بھر دی۔ لیکن سوال کرنے کی جرات کسی میں بھی نہیں ہوئی۔ ایسے ہی لمحات میں دیوان نے حق

نمک ادا کیا اور شعیب کے بیٹھتے ہی آگے بڑھا اور ہجوم کی توجہ اپنی طرف کرتا ہوا بولا۔

''جس طرح پیر سائیں کی زندگی میں سلسلے چلتے تھے، اسی طرح اب بی بی سائیں کی زندگی میں بھی چلیں گے۔ کسی بھی نئی بیعت کی ضرورت نہیں۔ جو عقیدت رکھتا ہے، اس کی بیعت ہے، باقی چاہیں تو آزاد ہیں۔ دستار کی بجائے آنچل انہیں بھجوایا جا رہا ہے۔ کیا آپ سب کو قبول ہے۔'' ہجوم سے قبول ہے کی صدا بلند ہوئی۔ تو چند مریدین کے سامنے بڑے سے تھال میں سفید آنچل لایا گیا۔ انہوں نے وہ اٹھایا اور اندر موجود خواتین کی طرف بھجوا دیا گیا۔ تب ہجوم میں لنگر کھول دیا گیا۔ لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ لنگر کھانے کے دوران لوگ تبصرہ آرائی کرتے رہے۔ جن لوگوں کو اس فیصلے پر اختلاف تھا بھی، وہ دب گیا۔ دوپہر ہونے سے پہلے تک ہجوم کم ہوتا ہوا ختم ہو گیا۔ وہاں فقط ملازمین رہ گئے۔ یا پھر وہ لوگ جنہوں نے کئے گئے انتظام کو سمیٹنا تھا۔ بہت پہلے شعیب مردان خانے بیٹھا۔ لوگوں سے میل ملاقات کر رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس فیصلے کا ردِ عمل فوری طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ آئندہ آنے والے حالات میں کیا ہوتا ہے یہ وقت پر منحصر تھا۔ مگر وہ مطمئن تھا۔ کہ لوگوں نے فیصلہ مان لیا ہے۔

☆☆☆

نادیہ کو پہلی بار کھڑکی میں کھڑا ہونا اچھا نہیں لگا۔ وہ ہجوم میں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی تنہائی میں آئی تھی۔ وہ سارا وقت خاموش رہی تھی۔ حویلی میں آنے والی خواتین کے تبصرے وہ سنتی رہی تھی۔ لیکن کسی ایک پر بھی اپنی زبان نہیں کھولی۔ اس وقت جبکہ وہ کمرے کی تنہائی میں آئی تو سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ لیکن دماغ میں مختلف خیالات کا ہجوم تھا۔ بلاشبہ یہ اس کا ردِ عمل تھا جو وہ لوگوں کی باتیں سن آئی تھی۔ اس نے ایک نگاہ سے باہر ڈالی۔ سورج مغربی افق کی جانب جھک چکا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ یہ تو وہ کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ اس میں جو الہڑ پن ہے، وہ تو کب کا ختم ہو چکا ہے اور سنجیدگی نے آ کر ڈیرے جما لیے ہیں۔ اس تبدیلی نے اس میں اعتماد بھر دیا تھا۔ وہ اعتماد جو اس کی اپنی ذات پر تھا۔ اگرچہ گذری رات شعیب نے بی بی سائیں ہو جانے کی ذمہ داری اس پر ڈال دی تھی۔ لیکن اسے کچھ دن پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری اس پر پڑنے والی تھی۔ حیران کر دینے والا خواب۔ جیسے وہ الہام ہی کہتی تھی اس میں اپنے والدین کو دیکھا اور اپنے آباؤ کے اس بزرگ کو جو صاحب مزار تھا۔ اس وقت وہ اس خواب کو سمجھ نہ سکی تھی۔ لیکن آج اس خواب کو وہ پوری طرح جان گئی۔ اس خواب میں یہی دکھائی دیا تھا کہ وہ اسی سفید محل کے باہر کھڑی ہے۔ دور دور تک کوئی ذی روح نہیں ہے۔ رنگوں اور خوشبوؤں کے اس جزیرے میں وہ تنہا ہے۔ تبھی محل کے برجوں میں سے اڑتا ہوا ایک سفید آنچل اس کے سر پر آ پڑتا ہے۔ جب وہ اپنا آنچل ہٹاتی ہے تو خواب ٹوٹ گیا تھا۔ وہ جاگ گئی تھی۔ رات اسے وہ خواب یاد نہیں آتا تھا لیکن جب خواتین نے ایک بڑا سا سفید آنچل جس کے کناروں پر سنہری گوٹا لگا ہوا تھا، اس پر اوڑھا دیا تو وہ خواب اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن اس طرح وہ بی بی سائیں بن جائے گی۔ وہ جو اسے حویلی سے نکال رہے تھے۔ وہ خود اس حویلی میں آنے کے لیے اس کی اجازت کے مرہونِ منت تھے۔ یہ خیال آتے ہی وہ چونک گئی۔ اب اس کا رویہ دوسروں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ اس سوال کے جواب میں اس کے اندر سے آواز ابھری۔

''ظاہر ہے اپنی محرومیوں کا ازالہ کرو، قدرت نے تمہیں موقعہ دیا ہے کہ اپنی گذشتہ زندگی میں جو تم سسکتی رہی ہو، وہ ساری خواہشیں پوری

کرو جن کے لیے تم ترستی رہی ہو۔"

"وہ تو سب کچھ مجھے ویسے ہی مل گیا ہے۔ اب میرا حکم ہی یہاں سب سے مقدم ہوگا۔ بلکہ میری خواہش ہی میرا حکم ہے۔ اور وہ وقت گذر چکا۔ وہ اپنے ساتھ میری محرومیاں اور تشنگی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اب تو میرے سامنے وہ آنے والا وقت ہے، جس کو میں جیسے چاہوں، ویسا ہوگا۔"

"کیا خود پر ہونے والے ظلم اور زیادتیوں کو بھول جاؤ گی۔ کیا تم ظہیر شاہ کو معاف کر پاؤ گی۔"

"کس سے بدلہ لوگی۔ وہ پیر سائیں جو حالات کا سامنا ہی نہ کر سکا اور خود اپنے ہی خوف سے موت کی وادی میں جا پہنچا۔ اس نے جس منصب کے لیے یہ ساری تگ و دو کی تھی۔ وہ قدرت نے میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرا انتقام بھی دفن ہو گیا۔ رہی ظہیر شاہ کی بات، حقیقت یہ ہے کہ میں خود اس سے فرار چاہتی تھی، میں نے کون سا اس کے سامنے اپنا آپ جھکا دیا تھا۔ فطری طور پر مرد کی ایک انا ہوتی ہے۔ میرے ساتھ شادی بھی تو اس نے جبر سے کی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ اس نے وقت سے پہلے ہی مجھے آزاد کر دیا۔ ورنہ وہ کوئی ایسا زور رنج بندہ ہوتا تو مجھے سسک سسک جانے پر مجبور کر دیتا۔ وہ اگر ضد نہ کرتا تو آج وہ پیر سائیں ہوتا۔ میں پھر کہاں ہوتی۔ اگر قدرت نے مجھے یہ موقعہ دے ہی دیا ہے تو مجھے سارے بغض، کینے انتقام اور بدلے بھول جانا چاہئے اور وہ کچھ کرنا چاہیے جو اس منصب و مقام کا حق ہے۔"

"اس منصب و مقام کا ایک تقاضا یہ بھی ہے نا دیہ کہ جب تک تم خود میں مضبوط اور سخت نہ رہو گی۔ یہ لوگ تمہیں، تمہاری ذات سمیت بہا کر لے جائیں گے۔ پھر نہ تم رہو گی ار نہ تمہارا یہ منصب و مقام، وہ لوگ جو پیر سائیں کے دور میں عیاشیوں میں اپنا وقت گذارتے تھے، وہ تمہیں کیسے قبول کر لیں گے۔"

"مجھے تو اپنے ڈگر پر چلنا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں راہ پر کامیاب رہوں گی۔ اگر نہ بھی رہی تو میں نے کون سا اسی منصب و مقام کے لیے تگ و دو کی ہے، چھنتا ہے تو چھن جائے۔ مجھے کیا لینا دینا۔ اس منصب سے اور لوگوں سے، جب تک میرا رب چاہے گا، میں بی بی سائیں رہوں گی۔ جب نہیں چاہے گا تو نہیں رہوں گی۔"

"تو بس پھر اپنی خواہشوں، تمناؤں اور امیدوں کا گلا گھونٹ کر بی بی سائیں بنی رہو۔ ویسے بھی تمہارے لیے زندگی میں کچھ نہیں بچا۔ تمہیں اب تو گوشہ نشین ہو جانا چاہیے۔"

"نہیں میں گوشہ نشین نہیں رہوں گی۔ میری زندگی کا ایک مقصد تھا، وہ پیر سائیں کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ختم ہو گیا۔ لیکن اب میں ان روایات کو ختم کر دوں گی جس نے انسانوں کو باندھا ہوا ہے۔ بلکہ خود انسان اس سے بندھے ہوئے ہیں۔"

"کیسے کرو گی یہ سب۔ کیسے ممکن ہو پائے گا یہ سب۔ کہیں یہ مقصد بھی ادھورا نہ رہ جائے۔"

"زندگی ہے اور کچھ کرنے کی لگن ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ میں نہ رہی اور میرے اندر امیدوں کے چراغ بجھ گئے تو پھر کیا، حالات اپنے اندر کیا کچھ رکھتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اپنے من میں موجود امیدوں کو تو ٹٹول سکتی ہوں۔ ممکن ہے میں ان لوگوں میں ہوں جن اپنی زندگی ان کے کام نہیں آتی۔ وہ پیدا ہی دوسروں کے لیے ہوتے ہیں۔ زندگی تو بتاتی ہے، جیسے بیت جائے۔"

''ہاں زندگی گذارنا تو مجبوری ہوتی ہے۔ یہ تو گذر ہی جاتی ہے۔ انسان کا ہونا تو تبھی ہوتا ہے نا کہ وہ زندگی کو اپنے مطابق گذارے۔ کیا اس کے اندر خواہشیں نہیں ہیں۔ جنہیں پورا ہونا چاہیے۔ کیا امیدیں نہیں ہیں جنہیں بر آنا چاہیے۔ کیا وہ خواب نہیں دیکھتا جو حقیقت کا روپ دھار سکیں۔ کیا حالات کے جبر تلے زندگی گذارنا ہی جیون ہے۔ اصل زندگی تو یہ ہے کہ اس کے لمحے لمحے سے خوشیاں کشید کر لی جائیں۔ حالات تو دکھ ہی دیتے ہیں۔ ہم دوسروں کی امیدوں پر پورا اترنا چاہیں تو بکھر کر رہ جائیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ یہ زندگی تو نہیں ہے نادیہ۔۔ کیا ہم ہی نے دوسروں کے لیے جینا ہے۔ کیا ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم چاہے جائیں۔ کوئی ہمارے لیے جیئے۔ تم مان لو نادیہ کہ تم ہار گئی ہو۔ مایوس ہو اور اپنے آپ کو حالات کی دسترس میں دے دیا ہے۔ حالات تو وہ بہاؤ ہے، جس میں ہر شے خس و خاشاک کی مانند بہہ جاتی ہے''

''ہم انسان ہی ہیں جو خوشیوں کی چاہ میں غم کو گلے لگا بیٹھتے ہیں۔ کبھی سوچا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب ہم خود سے ناامید ہو جاتے ہیں ہماری یہی ناامیدی ہماری ذات کے اندر یقین کو دیمک کی طرح کھا جاتی ہے۔ اور ہم شکستگی کی اس انتہا پر جا پہنچتے ہیں جہاں زندگی سے آنکھیں ملانے کی جرات نہیں ہوتی۔ کیا پتے گرنے سے شجر مرجھا جاتا ہے۔ نہیں، وہ یونہی منتظر ہوتا ہے۔ اسے امید ہوتی ہے۔ اور پھر یہی امید اسے پھل دیتی ہے۔''

''سوال تو یہ ہے کہ نا نادیہ۔! تمہیں اب کس کی امید ہے۔ تمہیں اگر شعیب کے کھو جانے کا ملال ہے تو کیا تم اب بھی اس کی امید رکھتی ہو۔ کیا تم فرح کو اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن بنا کر بھی امید رکھتی ہو کہ وہ تمہارا ہو جائے۔''

''نہیں۔! خدا کے لیے میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں تو ایسا سوچوں گی بھی نہیں۔ ایسا سوچنا بھی بہت بڑا گناہ، یہ تو نری خود غرضی ہے۔'' اس نے کانپتے ہوئے سوچا۔ اس سوچ نے اسے خود اپنے آپ سے ڈرا دیا تھا۔ سوال ہی نہیں وہ الزام بھی تھی جس سے وہ ہر صورت بچنا چاہتی تھی۔ اسے ہی نہیں، سب کو یہ معلوم تھا کہ وہ شعیب سے محبت کرتی ہے۔ سبھی کے ذہن میں سوال تھا کہ اس نے اپنی محبت کو فرح کی جھولی میں کیوں ڈال دیا؟ اس کا جواب وہ نہ کسی کو بتا سکتی تھی اور نہ ہی بتانا چاہتی تھی۔ تاہم لوگوں کا تجسس اس کے ایک ایک رویے پر ہوگا۔ خاص طور شعیب کے معاملے میں۔ اس کے کسی بھی طرز عمل سے اگر یہ شائبہ بھی ہو گیا کہ وہ اب بھی شعیب کی امید رکھتی ہے تو اس کی ساری ریاضت مٹی میں مل جائے گی۔ وہ جو اس نے قربانی دی تھی رائیگاں چلی جائے گی۔

''یہ سارا کچھ تم لوگوں کے خوف سے محسوس کر رہی ہو، تم اپنے من کی بات کہو، کیا تم اب بھی شعیب کو نہیں چاہتی ہو۔ کیا تم اب بھی اس کی امید نہیں رکھتی ہو؟''

''میں شعیب کو چاہتی ہوں اور پورے دل سے چاہتی ہوں۔ اس سے محبت کرتی ہوں۔ اختر رومانوی نے مجھے جس شخصیت سے پیار کرنے کا الہام بخشا، وہ شعیب ہی تو ہے۔ لیکن اب اس کی آس رکھوں یا اس کی امید کروں تو یہ مسلک محبت سے سراسر ناجائز ہے۔ محبت کا مطلب پانا تو نہیں ہے نا۔''

''تو پھر امید کے نام پر وہی سامنے کیوں آجاتا ہے؟''

''حالات پر تو میری کوئی دسترس نہیں۔ اختر رومانوی میرے لیے ایک ان دیکھا ہیولا تھا۔ جسے میں نے چاہا اور اس کو اپنی دسترس میں کرنے

کے لیے ایک طویل سفر کیا۔اس کو پانے کی بہت ساری وجوہات میں میری بغاوت بھی شامل تھی۔ میں نے اسے پانے کی تمنا کی تو وہ میری زندگی سے یوں نکل گیا جیسے وہ کبھی میر زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔اور پھر جب میں نے اسے پانے کی تمنا چھوڑ دی تو میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔میں چاہتی تو ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی دسترس میں کر سکتی تھی، لیکن نہیں، وہ میری دسترس کے لیے میری چاہت کے لیے بنا ہے۔بس میں چاہتی رہوں گی۔اسے اپنانے کی خواہش نہیں کروں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ جس دن میں نے اسے اپنا بنانے کی خواہش کی، اسی دن وہ میری زندگی سے چلا جائے گا۔‘‘

’’آنے والے حالات میں تم چاہو بھی تو اسے نظر انداز نہیں کر پاؤ گی۔وہ اس حویلی کا حصہ نہیں، بلکہ وہ واحد مرد ہے جیسے تم نے بھی خود پر حاکم تصور کر لیا تھا۔اس لیے تو اسے گدی نشین ہو جانے کی درخواست کی تھی۔یہ اسی کا تحفہ ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔وہ ہر پل تمہاری نگاہوں کے سامنے رہے گا۔تم اس کے احساس سے کہاں تک بچ پاؤں گی۔کیا کبھی تمہارے اندر اس کے لیے ہوک نہیں اٹھے گی؟‘‘

’’میں انسان ہوں اور انسان تو ویسے ہی جذبات سے گندھا ہوا ہوتا ہے۔اس کی محبت میں اب احترام شامل ہو گیا ہے۔تو اس کی حیثیت ہی بدل گئی ہے۔اب میری محبت کے رنگ گہرے ہیں۔کیا یہ میری خواہش کے لیے اپنا آپ وار دیتا ہے۔میں کچھ نہ بھی کہوں تو وہ مجھے اہمیت دیتا ہے۔کیا صرف جسمانی تعلق ہی سب کچھ ہوتا ہے۔اس نے تو مجھے دیکھا تک نہیں ہے۔ مجھے دیکھے بغیر میری چاہت رکھتا ہے۔اور پھر یہ سارے سوال قبل از وقت ہیں۔وہ فرح کا ہے اور میں کسی بھی بددیانتی کے بغیر اس کی محبت دم بھرتی ہوئی۔جس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔اب تو میں خود آپ اپنے کو بھی روک سکتی۔شاید میری محبت ایسے ہی ہے۔‘‘

’’صحرا بھی عبور کرنا چاہتی ہو اور نخلستان بھی تمہارے ساتھ محوِ سفر ہو، کیا یہ ممکن ہو پائے گا۔محبت میں اپنے آپ کو وار کر زندگی کی خواہش مندی بھی ہو۔قربانی دے کر اس کا صلہ بھی مانگ رہی ہو۔رنگوں کو وار کر اپنی زندگی بھی رنگین کر لینا چاہتی ہو۔یہ سب کیا ہے؟‘‘

’’یہ سب زندگی کا عطیہ ہے میں نے تحفے سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔پالینے کے بعد پھر کھو جانے کا خوف بے حال رکھتا ہے۔میں نے اسے پایا بھی نہیں مگر ہو میرا ہو گیا۔یہی انہونی ہو گئی ہے۔میں اگر چاہوں بھی خود کو نہیں آزما سکتی۔وقت مجھے آزما رہا ہے۔اور میں اس کی ہر آزمائش پر پورا اتروں گی،اس میں کوئی میری خواہش شامل نہیں ہے۔میں نے تو اپنی خواہشوں کو گرہ دے کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔اور اسی کی چاہ کرنی ہے جو لازوال ہے۔جیسے میں چاہوں تو وہ ستر قدم آگے بڑھ کر مجھے چاہتا ہے۔وہ جو چاہے گا مجھے مقصود دے گا۔وہ جہاں چاہے گا میں اس کے سامنے سر جھکا دینے ہی میں اپنی فتح محسوس کرتی رہوں۔اب یہی میری چاہ کی مسافت ہے۔اب یہی میرا فیصلہ ہے۔بندگی کے مقدس ریشمی کپڑے میں جب بندہ اپنا آپ باندھ لیتا ہے تو پھر زندگی خود بخود زم ہو جاتی ہے۔‘‘

’’کیا تمہیں بندگی کا دعویٰ ہے؟‘‘

’’انسانی بندگی نہ بھی کرے تو وہ بندہ ہی ہے۔اس کی دی ہوئی نعمتوں کو قبول کرنا بندگی ہی تو ہے۔اب یہ بندے پر منحصر ہے کہ وہ شکر ادا کرتا ہے یا ناشکروں کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ان حالات میں دعویٰ کیا وقعت رکھتا ہے۔‘‘

اس جواب کے ساتھ ہی اس کے اندر سے اٹھنے والے سوال بند ہو گئے۔کافی دیر تک یہ خلا جیسی کیفیت میں رہی۔اسے لگا کہ یہ خود کلامی

اسے بہت ساری ڈھارس دے گئی ہے۔اک حوصلہ اس کے من جاگزیں ہو گیا ہے۔وہ اعتماد مزید پختہ ہو گیا کہ وہ اب نادیہ نہیں بی بی سائیں ہے۔یہ سوچ آتے ہی اس نے ایک نگاہ دوڑائی۔مریدین کا دور ونزدیک حلقہ، جاگیرداری کے درپیش مسائل اور پھر معاملات دنیا، کیا وہ نبھا پائے گی؟ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔جس نے یہ سب دیا ہے، اس نے ان سے نبرد آزمائی کی طاقت وہمت بھی دی ہے۔وہ کر لے گی۔۔۔۔یہ سوچ کر اس نے طویل سانس لی اور پھر بیڈ سے اٹھ گئی۔کھڑکی کے باہر اندھیرا اتر آیا تھا۔اب اس کی تنہائی، تنہائی نہیں رہی تھی۔بہت کچھ ایسا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ پاتی تھی۔وہ کمرہ جو کبھی سُونا ہوا کرتا تھا، اب وہی اتنا بھرپور لگتا تھا کہ وہ خود میں سمٹ جاتی، یہی اس کے من کی تبدیلی تھی۔

☆☆☆

شعیب ایک دم سے سلامت نگر میں اس طرح معروف ہوا کہ لوگ اس کا احترام کہیں زیادہ کرنے لگے۔پہلے وہ فقط ایک انتظامی آفیسر تھا لیکن اب اس کا تعلق پیر سائیں کے گھرانے سے مشہور ہوا تو وہ عقیدت اس کے ساتھ بھی شامل ہو گئی۔جہاں لوگوں کی کثیر تعداد اس کا احترام کرتی تھی، اسے عزت کی نگاہ دے دیکھتی تھی، وہیں ایسے حاسدین بھی پیدا ہو گئے، جن کے بہت سارے کام رک گئے۔چوہدری ثنا اللہ اس کے قریبی مشیروں میں شامل ہو گیا۔اور زندگی ایک خاموش ڈگر پر چل پڑی۔حویلی وہ انہی دنوں میں گیا تھا جب پیر سائیں کا انتقال ہوا تھا۔پھر وہ پلٹ کر وہاں نہیں گیا۔ایک شام وہ لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملازم چائے کی ٹرالی رکھ گیا۔اس کے ساتھ ہی وہاں فرح آ گئی۔اس نے آتے ہی چائے بنانا شروع کر دی تو شعیب نے پوچھا۔

''امی، کہاں ہیں؟ وہ ٹھیک تو ہیں؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہیں اور ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی ہیں۔انہوں نے کہا مجھے وہیں چائے دے دو تو میں نے دے دی۔'' فرح نے دھیمے سے لہجے میں کہا اور پیالی اس کی جانب بڑھا دی۔اس نے پیالی پکڑتے ہوئے فرح کی طرف دیکھا۔وہ اب اپنی ہیت میں تھوڑی سی تبدیل ہو گئی تھی۔وہ اس کی جانب دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔تبھی وہ بولی۔

''آج میں اور پھوپھو حویلی گئی تھیں۔اماں نے بلایا تھا۔''

''اچھا، کیسے ہیں وہ سب ٹھیک ہیں۔کس لیے بلایا تھا؟'' اس نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہیں۔اماں نے ایک صلاح دی ہے۔'' وہ سپ لیتے ہوئے بولی۔

''کیا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا تو وہ دبے ہوئے انداز میں بولی۔

''وہی پرانی بات۔۔۔۔کہہ رہی تھیں کہ ہم تینوں وہیں حویلی ہی میں آ جائیں۔''

''تم کیا کہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا تو خیال یہ ہے کہ ہمیں وہاں چلے جانا چاہئے۔اس میں میری کوئی ذاتی خواہش نہیں ہے۔میں یہاں آپ کے ساتھ بہت خوش ہوں۔یہاں میں خود کو کھلی فضا میں محسوس کرتی ہوں۔حویلی میں جانے کا مطلب، وہاں کی روایات کی پابند ہو جانا ہے۔میں وہاں سے زیادہ یہاں

خود کو پرسکون محسوس کرتی ہوں۔ لیکن اس وقت حویلی کو ایک مرد کی ضرورت ہے۔ جو وہاں کے تمام تر معاملات کو دیکھے، عورتیں جتنی مرضی ہوں۔ لیکن ان کے ساتھ ایک مرد بچے کا بھی سہارا ہوتا تو وہ تحفظ محسوس کرتی ہیں۔ آپ کا وہاں ہونا ہی حویلی کو اعتماد بخش دے گا۔''

''ہوں۔!'' شعیب نے ہنکارا بھرا اور پھر سپ لینے کے بعد چند لمحے خاموش رہا۔ پھر فوراً بولا'' فرح۔! میری طرف سے دادی اماں کو یہ کہہ دینا اور تم بھی سمجھ لو کہ حویلی مجھ سے اوجھل نہیں ہے۔ میری اس پر پوری نگاہ ہے۔ میں جس طرح چاہتا ہوں۔ حویلی کا نظام اسی طرح چل رہا ہے۔ اس طرف سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ وہاں کے معاملات کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن وہاں جا کر رہنا پسند نہیں کرتے۔ یہ کیوں، کیا رکاوٹ ہے۔'' فرح نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو۔! ایک ہی چھت تلے رہنے کے باوجود تم مجھے پوری طرح سمجھ نہیں پائی ہو۔ میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی میری وجہ سے تنگ نہ ہو۔ پریشان نہ ہو۔ نادیہ میرے سامنے نہیں آتی۔ اور میں جب وہاں رہوں گا تو لازماً اس کے ذہن میں میرا خیال ہر دم رہے گا۔ وہ اس سے ڈسٹرب ہو گی۔ اس لیے میں اسے ذراسی بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میری مخالفت پیر سائیں کے ساتھ تھی۔ وہ اب نہیں رہا تو معاملہ ہی ختم ہو گیا۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''تو صرف نادیہ کے لیے آپ وہاں نہیں جا رہے ہیں۔'' فرح نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔! بالکل، میں نہیں چاہتا کہ اسے ذرا سی بھی تنگی ہو۔ وہ پوری آزادی سے اپنے معاملات میں مصروف رہے۔ اور جس مقصد کے لیے دادی اماں مجھے حویلی میں بلانا چاہتی ہیں۔ وہ مقصد میرا حویلی میں جائے بغیر بھی پورا ہو رہا ہے۔ حویلی کے کچن سے لے کر تمام تر جاگیر کے معاملات تک میری نگاہ میں ہیں۔ ظہیر شاہ کا جو حق ہے، وہ اسی طرح پڑا ہے۔ اور اس میں اسی طرح اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اماں بی سے کہنا مت گھبرائیں۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کو نادیہ ہی وہاں رہنے۔۔۔۔''

''تو میں پھر بھی نہیں جاؤں گا۔ اب اگر وہ میرے سامنے بھی آنا چاہے تو میں نہیں چاہوں گا۔'' اس نے یوں کہا جیسے دور کہیں خواب میں کوئی بول رہا ہو۔ اس پر فرح چند لمحے خاموش رہی، پھر گہرے لہجے میں پوچھا۔

''آپ نادیہ سے بہت محبت کرتے ہیں؟''

''فرح تم میری بیوی ہو، اور تم یہ جانتی ہو کہ میں نے تمہارے معاملے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ تمہیں بھرپور پیار دیا ہے۔ اتنا کہ جتنا میں دے سکتا تھا۔ اور جتنا میں دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر اس کے رویے پر غور کرو، حالات کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھو تو وہ ہے ہی محبت کرنے کے لائق۔'' وہ بڑی محبت سے بولا۔

''ہاں۔! میں نے بہت سوچا ہے، وہ ہے محبت کرنے کے لائق۔۔۔ بلکہ ہو تو میری محسن ہے۔ لیکن ہمیں بھی تو چاہیے نا کہ ہم اس کے کام آ سکیں۔'' وہ بولی۔

''وہ مجھے جو بھی حکم دے گی، میں بجالاؤں گا۔لیکن ہمیں یہ بھی تو خیال رکھنا چاہئے کہ وہ پرسکون کیسے رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کیسے پر سکون رہ سکتی ہے۔''

''مجھے کبھی کبھی تو اس پر بڑا ترس آتا ہے۔وہ زندگی۔۔۔۔''فرح نے کہنا چاہا تو اس کی بات ٹوک کر جلدی سے بولا۔

''نہ۔۔۔فرح نہ۔۔۔کبھی ایسا مت سوچنا۔۔۔اس پر ترس مت کھانا۔۔۔نہ اس سے کبھی ہمدردی جتانا۔۔۔وہ کچھ اور ہی چیز ہے ۔۔۔اس نے اپنے مادی وجود کو اپنے قابو میں کرلیا ہے۔۔۔اس کی روح بہت توانا ہے۔وہ ایک مظلوم لڑکی نہیں، بلکہ معصوم پیکر ہے۔کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ جو بھی اس سے دعا کرانے آتا ہے، وہ اپنی مراد پاتا ہے۔یہ اس کی وجود کا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی عنائتیں ہیں۔یاد رکھو ۔!جو جتنا اپنے وجود کو منفی خیالات سے پاک کرلیتا ہے، وہ اتنی ہی تیزی سے رب تعالیٰ کی قربت حاصل کرلیتا ہے۔جو دل دنیا اور اس کی آلائشات سے پاک ہوجاتا ہے، رب تعالیٰ وہاں بسیرا کرلیتا ہے۔اور پھر جس دل میں رب تعالیٰ بس جاتا ہے، اس وجود کی لاج بھی اللہ سائیں خود رکھتا ہے۔اس میں بندے کا کوئی کمال نہیں ہوتا۔''

''ہاں۔!نادیہ کی کوئی ریاضت نہیں، لیکن پھر بھی مریدین کا اس پر اعتقاد بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔''فرح نے سوچتے ہوئے کہا۔

''عبادت و ریاضت سے پارسائی تو مل جاتی ہے، نیکی نہیں، بلکہ بندہ نیکی کے لیے تیار ہوتا ہے۔جس بندے کی سوچ ہی دوسروں کو فائدہ دینے کے لیے ہو اور وہ اپنی ذات کے بارے میں سوچے ہی نا، وہاں برکت ہی برکت ہوتی ہے۔یہ رب تعالیٰ کا انعام ہے بندے کے لیے۔'' شعیب نے عقیدت سے کہا تو فرح اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔کچھ ہی دیر بعد ملازم برتن اٹھا کر لے گیا۔

☆☆☆

نادیہ نے سفید سوتی ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا تھا۔اس پر سیاہ چادر لیے وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی، جہاں کبھی پیر سائیں بیٹھا کرتا تھا۔مگر اب کمرے کی حالت ویسی نہیں تھی۔اس میں بہت ساری تبدیلیاں آگئی ہوئیں تھیں۔وہ خواتین سے بالمشافہ مل لیا کرتی تھی۔ان کی روداد بہت دھیان سے سنتی اور پھر جو اس سے ہوسکتا وہ کرتی۔اسی طرح مرد حضرات بھی اپنی بپتا لے کر اس کے پاس آتے، مگر وہ ان کے سامنے کبھی نہیں آئی تھی۔شیشے کی مضبوط دیوار حائل دیتی تھی۔وہ تو دیکھ سکتی تھی لیکن اندر کوئی نہیں جھانک سکتا تھا۔ان کے درمیان ایک مائیک ہوتا، جس سے وہ آواز سن لیتی۔پھر اس کی بات سن لینے کے جواب میں کوئی نہ کوئی شے باہر کھسکا دیتی ان میں کوئی بھی میٹھی چیز ہوسکتی تھی۔سائل سمجھ جاتا کہ اس کی بات سن لی گئی ہے۔وہ دن میں ایک خاص وقت کے لیے وہاں آتی اور پھر اس کا ٹھکانہ وہی اپنا کمرہ ہوتا۔عدت ختم ہونے کے بعد سے اس کا یہی معمول بن گیا ہوا تھا۔

اس دن جب وہ وہاں سے واپس آئی تو اس کے ذہن میں بہت کچھ آنے لگا تھا۔وہ اپنے کمرے میں آئی تو آتے ہی تاجاں مائی کو بلوایا۔وہ آگئی تو اس نے بڑے ہی نرم اور جذبات بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

''تاجاں۔!تم آج ہی خود شعیب کے پاس جاؤ، اور اسے میری طرف سے عرض کرنا کہ وہ حویلی میں آئے، مجھے ان سے کچھ کام ہے۔اگر وہ آجائیں تو ٹھیک ہے، نہ آنا چاہیں تو خاموشی سے واپس آجانا۔''

''جی بی بی سائیں۔ !کیا میں ابھی جاؤں۔؟''اس نے پوچھا۔

''ہاں ابھی۔ !اور مجھے آ کر بتاؤ۔''بی بی سائیں نے کہا تو تاجاں پلٹ گئی۔ تمہید ادی اماں اس کے پاس آ گئی اور اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ لرزتے ہوئے لہجے میں دھیرے سے بولیں۔

''ظہیر شاہ نے زہرہ کو اپنے پاس لندن بلوایا ہے۔۔ وہ وہاں شادی کرنا چاہ رہا ہے۔''

''وہ اس کا حق ہے کرے۔۔۔ اور جہاں تک زہرہ بی کے جانے یا نہ جانے کا تعلق ہے۔ وہ ان کی مرضی، ہم اس میں کوئی دخل تو نہیں دے سکتے نا۔۔''بی بی سائیں نے انتہائی تحمل سے کہا۔

''بیٹی۔ !میں جب تمہیں دیکھتی ہوں نا۔۔۔ تو خود ہی کو بڑا قصوروار سمجھتی ہوں۔ تیری ویران زندگی۔۔''

''نہیں اماں بی۔۔ آپ سے کس نے کہا میری زندگی ویران ہے۔۔ میں تو اس قدر مصروف ہوں کہ میرے پاس خود اپنے لیے وقت نہیں ہوتا۔۔ آپ قطعاً خود کو قصوروار مت سمجھیں۔ میرے لیے زندگی ایسے ہی تھی اور میں اس زندگی پر بہت خوش ہوں۔''

''تم لاکھ دلیلیں دو میری بیٹی۔ !جو فطری تقاضے ہوتے ہیں نا۔۔۔ انہیں پورا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اللہ نے اگر تمہیں یہ عزت و مقام دے دیا ہے تو یہ اس کی نعمت ہے۔ لیکن بہت ساری نعمتوں سے خود کو الگ رکھنا یہ بھی تو کفرانِ نعمت ہے نا۔۔۔''اماں بی نے آہستگی سے کہا تو اس نے چونک کو دادی اماں کی طرف دیکھا۔ پھر دھیمے سے لہجے میں بولی۔

''اماں بی۔ !آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ صاف لفظوں میں کہیں، تاکہ مجھے آپ کی بات سمجھ میں آ سکے۔''

''دیکھ بیٹی۔ !انسان اپنے آپ سے جتنا فرار حاصل کرنا چاہے، کر تو سکتا ہے۔ لیکن تب تک وقت بیت جاتا ہے۔ پھر پچھتاوے انسان کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وقت کو سنبھال لے اور پھر اس کے مطابق چلے۔۔''

''اماں بی۔ میں اب بھی نہیں سمجھ سکی ہوں کہ آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ آپ کھل کر کہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔''نادیہ نے یہ بھانپ لیا تھا کہ جو بات دادی اماں اس سے کہنا چاہ رہی ہے، ضرور ایسی ہے کہ جو اہم ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی ہے کہ جس سے کسی کے دل کو ٹھیس پہنچنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ ورنہ وہ اس قدر محتاط انداز میں بات نہ کرتیں۔ وہ دادی اماں کے چہرے پر دیکھتی رہیں۔ جبکہ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ اس کی بات سن کر اپنا سر اٹھایا اور نہایت آزردہ لہجے میں بولیں۔

''نادیہ۔ !میرے ذہن میں چند دن سے ایک خیال آ رہا ہے۔ اگر تم اس خیال بارے اپنی رائے فوراً نہیں کچھ دن سوچ سمجھ کر دو تو میں تم سے کہوں۔۔۔''

''آپ کہیں۔۔۔ میں سوچ سمجھ کر ہی آپ کو اس پر اپنی رائے بتاؤں گی۔''نادیہ نے بڑے تحمل سے کہا۔ تبدادی اماں نے قدرے گہری سانس لی اور بڑے مان سے کہا۔

''میں مانتی ہوں کہ انسان اپنے بدن پر جیسا چاہے کنٹرول کر سکتا ہے۔ اسے پھولوں کی سیج پر رکھے یا کانٹوں میں گھسیٹتا رہے۔ اس کی اپنی

مرضی ہے کہ وہ خود پر ظلم کرے یا اسے بنا سنوار لے۔ مگر بعض اوقات حالات اس طرح کے بن جاتے ہیں کہ اپنی خواہش کے مطابق وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے وہ کرنا پڑتا ہے، جو حالات اس سے چاہتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے میری بیٹی کہ تم چاہتی تو اپنے حصے کی خوشیاں بڑی آسانی سے حاصل کر سکتی تھی۔ پھر اپنی خوشیوں کی راہ میں خود ہی رکاوٹ بن بیٹھی ہو۔ خیر۔! وہ جو بھی حالات تھے، جیسا بھی وقت تھا، وہ گذر گیا۔ لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کر لو۔''

اماں بی نے اپنی بات کہی تھی جو اس کے من میں اس وقت کھٹکنے لگی تھی جب انہوں نے تمہید ہی باندھی تھی۔ اس لیے نادیہ نے بڑے تحمل سے کہا۔

''اماں۔! اب اگر میں بی بی سائیں بن گئی ہوں تو اب میرا بنتا ہی نہیں کہ میں شادی کروں اور ایک ازدواجی زندگی بسر کروں۔۔۔ میرا اب سارا وقت اپنے مریدین کے لیے ہے۔ اور دوسری بات اب اگر میں شادی کرنا بھی چاہوں تو کس سے کروں، کیا ایسا کوئی لڑکا ہے خاندان میں جس سے میں شادی کروں گی۔؟ بالفرض محال اگر لڑکا مل بھی جاتا ہے تو میں پھر بھی شادی نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بی بی سائیں بن جانے کے بعد کیا اب میں اپنی حویلی کی روایات کی امین نہیں ہوں؟''

''تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے، میں مانتی ہوں اس کو۔۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ اب ان روایات کو زندہ رکھا جائے جو اس حویلی میں موجود عورتوں کا سانس تک بند کر دے، اب اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم چاہو تو ان روایات کو بدل سکتی ہو۔ اگر تم ان روایات کو نہ بھی بدلنا چاہو تو میرے پاس ایک راستہ ہے۔'' اماں بی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''کیسا راستہ۔؟'' اس نے تحمل ہی سے پوچھا۔

''یہی کہ تم شعیب سے شادی کر لو۔۔۔'' اماں بی نے ایک مختصر سا فقرہ کیا کہا کہ دھماکا کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دادی اماں اس نہج پر سوچ رہی ہے۔ تب اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے اماں۔۔ وہ فرح سے۔۔۔''

''وہ چار شادیاں کر سکتا ہے۔ تم فرح کی سگی بہن تو نہیں ہو کہ اس نکاح میں کوئی رکاوٹ ہو۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر شعیب اس حویلی میں آ کر رہے گا۔ چاہے تو سب کچھ اس کے سپرد کر دینا اور چاہے تو اس سلسلے کو بڑھائے رکھنا۔ اس وقت حویلی کو ایک مرد کی ضرورت ہے۔ اگر زہرہ لندن چلی جاتی ہے اپنے بیٹے کے پاس تو پھر حویلی میں تم اور میں۔۔۔ اور پھر میرے دن بھی کتنے ہیں۔۔ کسی وقت بھی بلاوا آ سکتا ہے۔'' اماں نے اسے سوچ کیا دی کہ وہ لاجواب ہو گئی۔ اس کے پاس کوئی بھی ایسی دلیل نہیں تھی جسے وہ جھٹلا سکتی۔ انہوں نے جو کہا تھا وہ بالکل سچ تھا۔ اس وقت حویلی کو ایک مرد کی بلاشبہ ضرورت تھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ شعیب سے شادی کر لے۔ اگر اس نے شعیب سے شادی کرنا ہی ہوتی تو وہ اس وقت کر لیتی، جب وہ اسے لینے کے لیے حویلی آن پہنچا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دادی اماں نے کہا۔'' میری باتوں پر خوب سوچ لینا، اور پھر جواب دینا، اس کے علاوہ اگر تجھے کوئی راستہ سوجھے تو مجھے بتانا، میں وہی مان لوں گی۔''

''اماں بی۔! آپ نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ میں آپ کی کسی بات کو جھٹلا نہیں سکتی اور نہ ہی انکار کر سکتی ہوں۔لیکن۔! یہ غلط ہے کہ میں شعیب سے شادی کرلوں، میں فرح کی زندگی میں کوئی ایسا بھونچال نہیں لاسکتی کہ جس سے وہ اپنی ہی ذات میں ڈوب کر رہ جائے۔آپ لوگوں کی زبان نہیں پکڑسکتیں۔لیکن یہ سوچ لیں کہ میرا یہ عمل صرف اور صرف انتقام ہی سمجھا جائے گا۔اب شعیب فقط ایک نہیں جسے منانا پڑے گا۔بلکہ اس کی زندگی میں فرح کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے فرد کا بھی اضافہ ہونے والا ہے۔ایسے وقت میں دادی اماں۔۔کچھ نہیں ہو سکتا۔ہاں،حویلی کی روایات کو توڑتے ہوئے،خاندانی روایات کو توڑتے ہوئے۔۔آپ جس سے چاہیں میری شادی کر دیں۔مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔۔لیکن جب میں شادی کرلوں گی،تو یہ بی بی سائیں والا معاملہ مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔میں پھر اپنی خواہشوں کے مطابق مزید آزادیاں چاہوں گی جو میرا حق بنتا ہے۔''

''دیکھو بیٹی۔!میں نے ساری صورت حال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔اس پر اب فیصلہ تو تمہارا ہی بنتا ہے نا۔۔تم ہی کہوگی۔۔''اماں بی نے مرجھائے ہوئے انداز میں کہا۔

''اماں بی،آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ حویلی کو کسی مرد کی ضرورت ہے،اگر وہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو پھر میری شادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔۔۔شعیب آج آرہا ہے۔اگر آ گیا تو میں خود اس سے درخواست کروں گی کہ وہ یہاں رہے۔''

''اور تم۔!تم کیا پھر ادھر ہی رہوگی۔؟''اماں بی نے کہا تو وہ خاموش رہی۔تبھی وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔''جہاں تک میرا خیال ہے،وہ ایسا انا پرست ہے کہ کبھی حویلی میں نہیں آئے گا۔اگر آنا ہوتا نا تو وہ پہلے دن ہی آجاتا۔پیر سائیں بن جانے کا موقعہ اس کے لیے بہت بڑا تھا۔وہ اس نے قبول نہیں کیا۔''

''اماں بی۔!میرے خیال میں آپ کے ذہن میں جو سوچ ہے نا،وہ کبھی بھی حقیقت نہیں بن پائے گی،جیسے میں نے خود فرح کی جھولی میں ڈالا،اب اس میں حصے دار کیسے بن جاؤں؟ آپ کو حویلی کے لیے مرد چاہیے نا،تو وہ میں کہہ رہی ہوں،شعیب سے میں درخواست کروں گی۔''

''میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ میری بات کا فوراً جواب نہیں دینا۔سے سوچنا،اچھی طرح سوچ کر جواب دینا،تا کہ ہاتھ آئے وقت کو ہم پھر نہ گنوا دیں۔''اماں بی نے اسے سمجھایا۔جس پر نادیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ سمجھ گئیں کہ نادیہ۔اب اس موضوع پر مزید بات نہیں کرے گی۔اس لیے وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے اٹھ گئی۔جبکہ نادیہ کے لیے سوچنے کا ایک نیا بہانہ چھوڑ گئی۔مگر اس نے زیادہ نہیں سوچا،بس اتنا ہی کہ یہ ناممکن ہے۔اب ایسا نہیں ہو سکتا۔اور اس خیال کو ذہن سے جھٹک دی۔

اس وقت شام کے سائے ڈھل چکے تھے،جب اسے اطلاع ملی کہ مردان خانے میں شعیب آیا ہوا ہے اور اس کا انتظار کر رہا ہے۔ایک لمحے کے لیے اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔کیا اس نے خود کو عام مریدین کی سطح پر رکھا ہوا ہے یا دوسرے ملاقاتی لوگوں کی طرح،جس طرح بھی تھا۔اس نے خود کو حویلی کا حصہ ظاہر نہیں کیا۔اجنبیوں کی مانند ہی یہاں آیا ہے۔دکھ کی ایک شدید لہر اس کے سینے میں اتر گئی۔اسے دادی اماں کے خیال پر بھی تاسف ہوا۔وہ جو سوچ رہی ہیں،اس پر اگر وہ چاہے بھی تو اب ناممکن ہے۔اس کا جو رویہ ہے وہ خود ہی واضح کر رہا ہے۔اس سے پہلے کہ دادی اماں

کوئی بات کریں، اظہار کریں تو فرح کا دل دکھے۔انہیں منہ سے بات نکالنے ہی سے روک دیا جائے۔انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں، وہ اپنے لیے مخصوص کمرے میں چلی گئی۔

ان دونوں کے درمیاں شیشے کی دیوار تھی۔نادیہ جو اس وقت بی بی سائیں کے مقام پر فائز تھیں۔وہ اسے ایک ٹک دیکھے چلے جا رہی تھی۔جبکہ دوسری طرف شعیب پر اشتیاق انداز میں منتظر تھا کہ بی بی سائیں اس سے بات کرے۔نادیہ کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ اس سے بات کرے۔کیا نادیہ کو اس سے شکوہ یا شکایت کرنی چاہیے کہ اس نے خود کو عام لوگوں کی سطح پر کیوں رکھا، یہاں کیوں آئے، بلکہ براہ راست حویلی کیوں نہیں آیا۔ممکن ہے وہ اس کے سامنے آ کر اپنا آپ کھول دیتی۔خاندان کا فرد سمجھ کر اور حویلی کا ایک حصہ جان کر یا پھر لب بستہ خاموش رہے۔جس طرح کا رویہ شعیب اپنائے ہوئے ہے۔اسی کی رضا میں خوش رہ کر اپنا ردعمل دے، کیا کرے۔؟ یہی سوچ کر لرز رہی تھی اور وہ اس کا منتظر بیٹھا ہوا تھا۔پھر اس نے زیادہ دیر تک انتظار کروانا مناسب خیال نہیں کیا۔انٹر کام کے بزر پر اس نے ریسور اٹھا لیا۔

''جی بی بی سائیں فرمائیں۔''شعیب کی آواز اس کے کانوں میں رس گھول گئی۔دور کہیں اختر رومانوی انگڑائی لے کر بیدا ہو گیا۔لحہ بھر وہ ماضی کی پھسلن میں پھسل چلی تھی کہ ڈگمگاتے ہوئے اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔اور بڑے نرم لہجے میں بولی۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔فرمائیں؟''اس نے جواب دیتے ہوئے، بلانے کے مقصد میں اپنی بے تابی دکھائی۔تب اس نے بھی تمہید وغیرہ میں اپنا وقت ضائع کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔اس لیے براہ راست بولی۔

''شعیب۔! آپ یہاں سلامت نگر میں آفیسر ہیں۔اور آپ کو یہاں کے اداروں کے بارے میں پوری معلومات ہوگی۔خاص طور پر تعلیم اور صحت کے معاملے میں۔''

''جی، جانتا ہوں۔ان کی حالت کچھ اتنی اچھی نہیں رہی۔''وہ اختصار سے بولا۔

''اس کی وجہ جو بھی رہی ہو۔میں چاہتی ہوں کہ ان کی حالت بہتر ہو جائے۔اور اس کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر بچیوں کے لیے کوئی تعلیمی ادارہ بنا لیا جائے۔جہاں وہ دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کر سکیں۔اس کے فنڈز یہاں حویلی سے جائیں گے۔کیا ایسا ادارہ بنانے میں آپ میری مدد کریں گے۔''

''آپ یہ حکم دیں کہ مجھے کرنا کیا ہے۔''وہ پھر اسی اختصار سے بولا

''سارا کچھ کرنا ہی آپ نے ہے۔پیپر ورک سے لے کر ادارہ بنانے تک۔۔میرا خیال ہے کہ اس کے بعد ایک ہسپتال بھی بناؤں۔۔دونوں پراجیکٹ اگر اکٹھے چلا سکتے ہیں تو۔۔یہ کیسے ہوگا۔کس طرح ہوگا۔یہ سب آپ نے کرنا ہے۔''

''میری صرف ایک شرط۔نہیں۔بلکہ استدعا ہے۔۔۔''وہ بولا۔

''جی، وہ کیا ہے؟''اس نے تیزی سے پوچھا۔

''میں سارا کام کروں گا۔ ایک ہی وقت میں ایک پراجیکٹ زیادہ اچھے انداز میں ممکن ہوگا۔ استدعا میری یہ ہے کہ مجھے مالی معاملات میں نہ لایا جائے۔ وہ کسی اور کے ذمے ہو۔ باقی میں سب دیکھ لوں گا۔'' اس نے کہا تو نادیہ کے دل پر یوں چوٹ لگی جیسے کسی نے تیر مار دیا ہو۔ تبھی اس نے دل گرفتہ سے انداز میں کہا۔

''شعیب یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے اگر آپ سے یہ استدعا کی ہے تو نہ صرف اپنا سمجھ کر بلکہ مجھے سب سے زیادہ اعتماد آپ پر ہی ہے۔ آپ ایسا اجنبیوں والا رویہ کیوں رکھے ہوئے ہیں۔؟'' شاید لفظوں سے زیادہ لہجہ اثر کر گیا تھا۔ شعیب کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گذر گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''بی بی سائیں۔! آپ یہ مت سمجھیں کہ میں نے یہ اجنبیوں والا رویہ رکھا ہے۔ دراصل یہ جو دولت ہوتی ہے نا۔ یہ خونی رشتوں میں بھی شک کا زہر گھول دیتی ہے۔ پھر مالیات کا یہ معاملہ میرے ذہن کو بانٹ دے گا۔۔۔ اور۔۔۔''

''تو پھر بتائیں۔ کس پر اعتماد کروں، کون سنبھالے گا یہ پیسوں کا معاملہ۔۔۔ میں اس کے سپرد کر دیتی ہوں؟'' نادیہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

''دیوان ہیں، بہت بھروسے کے آدمی ہیں۔'' اس نے کہا تو نادیہ تیزی سے بولی۔

''تو یہ کام ہی اس کے ذمے ہی لگا دیتی ہوں۔ آپ بہر حال مصروف ہیں۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے آپ سے یہ مشورہ کیا۔ مجھے تو آپ سے مشورہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ میں یہ سارا معاملہ دیکھ لوں گی۔''

''آپ تو ناراض ہوگئیں۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا، میں تو چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو نادیہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''شاید آپ مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کوئی ایسا شخص نہیں جو میرے اعتبار کے قابل ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اپنی اہمیت جتانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ آپ ہمارے لیے اہم ہیں۔ مگر شاید آپ اپنے ذہن میں کچھ اور لیے بیٹھے ہیں۔ آپ شاید سمجھتے ہیں کہ میں عورت ذات ہوں، حویلی کی روایات کی پاسداری کرنے والی ایک مجبور عورت تو میں یہ مجبوری بھری روایات والی زنجیر بھی ختم کر دوں گی۔ آپ کا مشورہ صاب ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک پراجیکٹ پر کام کرنا چاہیے۔ میں تو آپ کی بات مانوں گی۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے وقت دیا۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔۔۔'' نادیہ نے یہ ساری بات بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہی اور انٹر کام کا ریسور رکھ دیا۔ شیشے کے پار شعیب کا چہرہ اس کی نگاہ کے سامنے تھا۔ جبکہ اس نے اپنے گلے میں کڑواہٹ بھرنے لگی تھی۔ اگر وہ فقط نادیہ ہوتی تو شاید اب تک آہ بھرتے ہوئے چیخ پڑتی۔ لیکن اب وہ بی بی سائیں تھی، اس لیے، اپنے دکھ کو اندر ہی اندر رکھنے پر مجبور تھی۔ شکوہ شکایت تو دور کی بات وہ اپنا ردعمل بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے شعیب کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ جہاں ندامت یا شرمندگی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہی سپاٹ، جذبات سے عاری چہرہ، جس سے کسی بھی تاثر کا اندازہ تک نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ چند لمحے دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر چل دی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ وہ اس پر کچھ کہنا بھی چاہتا ہے یا نہیں۔ وہ صرف اور فقط ادی اماں کو باور کرانے جا رہی تھی کہ آپ کا خیال غلط ہو گیا ہے۔

☆☆☆

بعض اوقات زندگی میں انا پرستی بھی دکھ دے جاتی ہے۔ایسی کیفیات سے اس وقت شعیب گذر رہا تھا۔وہ دل سے نادیہ کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی انا آڑے آ گئی تھی۔اس انا کی رکاوٹ بن جانا بھی ایک طرح سے اس کے لیے بہتر ہی تھا۔اس کی نگاہ حویلی اور حویلی کے معاملات پر پوری طرح تھی۔وہ جانتا تھا کہ وہاں پر کیا ہو رہا ہے۔وہ انہی سوچوں میں گھرا ہوا بیٹھا تھا۔اسے اپنی حالت کا اس وقت اندازہ ہوا جب اس کی امی اور فرح دونوں ڈرائنگ روم میں آئیں اور اسے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔تبھی اس کی امی نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔

''خیریت تو ہے پتر۔!حویلی سے ہو کر آئے ہو تو یوں بیٹھے ہو، جیسے ارد گرد کا ہوش ہی نہیں۔ایسی کیا بات ہوئی وہاں پر؟''

''میں۔۔میں ہوش وحواس میں نہیں؟ میں ٹھیک ہوں۔''اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''خاک ٹھیک ہو، ابھی فرح تمہیں دیکھ کر گئی ہے،اس نے تو مجھے جا کر تیرے بارے میں بتایا۔۔۔اب سیدھے بات کرو، کیا ہوا ہے وہاں پر؟''امی نے ذرا سخت لہجے میں تشویش سے پوچھا تو اس نے من وعن ساری بات بتا دی۔جسے سن کر زبیدہ بولی۔

''اب مجھے تیری بھی تو سمجھ نہیں آتی۔اب اگر اس نے تم سے کہہ دیا تھا تو کسی مان ہی سے کہا تھا۔اس پر تمہارا انکار بنتا ہی نہیں تھا۔''

''میں نے انکار تھوڑی کیا تھا، بس میں اس کے مالی معاملات نہیں۔۔۔''

''ارے وہی تو اصل معاملات ہوتے ہیں۔''زبیدہ نے حیرت سے کہا۔

''نہیں امی، آپ نہیں جانتی، اس وقت وہی لوگ اس کے ارد گرد ہیں جو کبھی پیر سائیں کے ارد گرد تھے۔ان کے دور میں وہ جو کرتے رہے ہیں وہ سب میرے علم میں ہے۔عنقریب نادیہ ان کے جال میں پھنس جانے والی ہے۔یا پھر وہ انہی کی مرضی کے مطابق چلے گی۔ایسی اگر کوئی صورت حال بنی، تب وہ کون ہو گا جو اسے ایسی صورت حال سے نکالے گا۔وہی نا۔۔۔جس پر اسے اعتماد ہو گا۔میں نہیں چاہتا اماں کہ میں کسی سازش کا شکار ہو کر اپنا اعتماد بھی کھو بیٹھوں۔''

''اگر ایسی صورت حال ہے تو پھر تمہیں وہاں کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ایک تو وہ ابھی نا سمجھ ہے، نا تجربہ کار ہے۔دوسرا وہ لاکھ سمجھدار بھی ہو۔عورت تو ہے نا۔۔ایسی عورت جو حویلی سے باہر قدم نکالتے ہوئے سو بار سوچتی ہے۔''اماں نے کہا تو فرح نے منمناتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کے خیال میں دیوان یہ سب کر رہا ہے؟ یا کر سکتا ہے؟''

''ہاں۔!کیونکہ اس کے میرے پاس اب تک کئی ثبوت آ چکے ہیں۔میں نے اگر مالی معاملات اپنے ہاتھ میں لیے نہیں، ان کا وار چل جانا ہے۔اور میں اس پوزیشن میں نہیں کہ دیوان کو الگ کر دوں۔۔۔اس وقت وہ مریدین میں اپنے ہم خیال لوگوں کا حلقہ بنا چکا ہے۔اور کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی ہی پیری مریدی شروع کر دے۔''اس نے سمجھایا تو فرح نے تیزی سے کہا۔

''اس طرح تو وہ دن بدن مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔یہی وہ حالات ہیں، جب ہمیں حویلی میں ہونا چاہئے۔یہی وہ وقت ہے، جیسے ہم نے فرح کا ساتھ دینا ہے۔کل وہ تجربہ کار ہو گئی یا لٹ گئی، پھر ہم اس کے کس کام آئے۔''

''فرح۔!میں سب سمجھتا ہوں اور واقف بھی ہوں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ظہیر شاہ نے بہت بڑی بے وقوفی کر کے سب کچھ تلپٹ کر

دیا ہے۔اب تو وہ اپنی والدہ کو بھی اپنے پاس بلا رہا ہے کہ وہاں پر شادی کر لے۔مطلب تمہاری والدہ،تمہارے بھائی کے پاس جا رہی ہے۔کیا انہوں نے تمہیں مشورے میں لیا؟فرح مان جاؤ،چاہے نادیہ ہے یا پھر تمہاری والدہ۔۔وہ لوگ ہمیں اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ ہمیں کوئی بات ہی بتا دیں اور تم مالی معاملات کی بات کرتی ہو۔''شعیب نے کافی حد تک تلخ لہجے میں کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں،میں نادیہ کی بات کر۔۔۔۔۔''فرح نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''نہیں کرونا بات اس کی۔کم از کم میرے لیے نہیں۔ہاں،تمہیں ہمدردی ہے،تو تم حویلی میں جا سکتی ہو۔اماں بھی جا سکتی ہے۔۔''

اس کے لہجے میں تلخی بتا رہی تھی کہ وہ اس موضوع پر بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔زبیدہ نے آنکھوں کے اشارے سے فرح کو منع کر دیا کہ وہ مزید بات نہ کرے۔چند لمحوں بعد وہ اٹھ گئی تو زبیدہ بھی چلی گئی۔شعیب یوں تنہا رہ گیا۔وہ پھر سے اپنی کیفیات کا تجزیہ کرنے لگا کہ وہ دل سے اس کی مدد تو کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے انکار کیوں کر دیا۔کیا وہ کوئی ایسا انتقامی جذبہ لیے ہوئے ہے یا کچھ اور۔۔۔اس نے سو طرح سے سوچا،مگر کہیں بھی کچھ ایسا نہیں تھا۔مگر اس کا سکون غارت ہو گیا تھا۔

نادیہ کی پہلی کال سے لے کر آخری بار انٹر کام پر بات ہونے تک نجانے کتنی یادیں لمحوں میں آ کر گذر گئیں۔ایک عام سے لڑکی سے بی بی سائیں کے مقام تک آ جانے میں اس کا سارا اسفر وہ جانتا تھا۔کہیں بھی اس کی اپنی جدوجہد نہیں تھی۔حالات و واقعات ایسے ہی بنتے چلے گئے اور وہ بی بی سائیں بن گئی۔لیکن۔۔!جو چیز اس کے ذہن کو بار بار متوجہ کر رہی تھی،وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔بی بی سائیں کے مقام پر فائز ہوئے اسے تقریباً چار ماہ ہو چلے تھے اس دوران وہ بہت بااعتماد ہو گئی تھی۔اس کے اس مقام تک پہنچ جانے میں وہ حالات و واقعات ہی کا اتفاق قرار دے دیتا۔لیکن حیرت بھری الجھن یہ تھی کہ اس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جس کے لیے دعا کرتی ہے،وہ پوری ہو جاتی ہے۔اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ حالات و واقعات کا اتفاق نہیں ہے،بلکہ یہ قدرت کی طرف سے کوئی عطیہ ہے،جس نے نہ صرف اسے بی بی سائیں کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے بلکہ اس کی دعائیں بھی قبول ہو رہی ہیں۔ایسا کیوں ہو گیا؟یہ بات اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔یہ گتھی وہ کھول سکے گا یا نہیں لیکن اس کے لیے مقام حیرت ہے۔اسے سوچنا ہو گا کہ ان کا ایک نہ ہونا قدرت ہی کی منشا تھی۔اور اس نے جو مدد چاہی تھی وہ یونہی نہیں تھی۔یہ تو ہو سکتا تھا کہ ایک عام سی لڑکی کے دل میں اس کی محبت ہو اور اب جبکہ اسے موقعہ ملا تو وہ اس کی قربت کی خواہاں ہو۔تبھی اسے کسی نہ کسی طرح قریب رکھنے کے بہانے یہ پراجیکٹ بنایا ہو۔یہ بات نہ اس کا دل قبول کر رہا تھا اور نہ ہی ذہن۔اب جو نادیہ کا مقام ہے،اس کے ہوتے ہوئے،اسے خود نادیہ سے دور ہو جانا چاہیے۔وہ جو محبت ان کے دلوں میں موجود ہے۔کہیں کوئی ہلکی سے چلنے والی ہوا پھر سے سلگ جانے پر مجبور کر دے۔شاید وہ اسی لیے خوف کھا گیا تھا۔تبھی اچانک اس کے من میں یہ خیال آیا کہ کچھ بھی ہے تم دلیلیں مت گھڑو،یہ مان جاؤ کہ تم سے غلطی ہوئی۔تم نے اسے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔تمہارے اندر کا کوئی خوف ہے جو تمہیں ایسا کرنے سے روک رہا ہے۔ممکن ہے نادیہ کے دل میں محبت کی وہ آگ سرد پڑ چکی ہو۔جس کی چنگاری تم اب بھی اپنے دل میں لیے پھرتے ہو۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''اس نے خود سے سوال کیا۔

''یہی کہ اب جبکہ تم نے اسے انکار کر دیا ہے تو بس کر دیا۔ جب تک وہ تمہیں دوبارہ نہیں کہے گی۔ تم اپنی بات پر قائم رہو۔ غلطی ہوگئی تو بس ہوگئی۔''

''تو گویا میں اپنی غلطی تسلیم کر لوں''

''تو یہ ہٹ دھرمی ہوگئی، نہ کرو تسلیم، غلطی تو پھر بھی غلطی رہے گی۔''

''ٹھیک، مجھے اب انتظار کرنا ہوگا۔ وقت اور حالات مجھے یہ موقع دیں گے تو میں کر لوں گا۔''

''اب ہوئی نا بات۔۔۔''

اس کے اندر سے آواز آئی تو وہ پر سکون ہو گیا۔

اصل میں ہوتا یہی ہے کہ جب ہمارے ذہن یا دل میں کوئی منفی جذبہ، یا سوچ پروان چڑھنے لگے تو وہ بدبو کی مانند ہوتا ہے۔ اور بدبو کبھی بھی سکون نہیں لینے دیتی۔ وہ بے چین رکھتی ہے۔ جیسے ہی اس جذبے یا سوچ کو ہم نکال باہر پھینکتے ہیں تو پرسکون ہو جاتے ہیں۔ شعیب بھی اسی حالت میں تھا۔

☆☆☆

دن ایک کے بعد ایک کر کے گذرتے چلے گئے۔ ایک موسم گذر گیا تو دوسرا آگیا۔ اس کے ساتھ ہی حویلی کا سناٹا مزید بڑھتا چلا گیا۔ بہت پہلے زہرہ بی لندن چلی گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد یہ خبر آگئی کہ ظہیر شاہ نے ایک پاکستانی نژاد برطانوی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ جو اس کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ پھر پلٹ کر کوئی خبر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی جائیداد کے حصول کے لیے بھی کبھی کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی اس نے اپنی جاگیر سے ہونے والی آمدنی میں سے کبھی کوئی مطالبہ کیا تھا۔ بی بی سائیں کے کہنے پر دیوان نے ظہیر شاہ سے رابطہ کیا تھا۔ تب اس نے دیوان سے یہی کہا تھا کہ جب تک وہ عورت اس حویلی میں ہے۔ میں پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ رہی جائیداد اور آمدنی کی بات تو وہ کسی بھی وقت آکر لے لے گا۔ تب سے ہی دیوان کو کہہ دیا تھا کہ اس کی آمدنی کا حساب کتاب درست طریقے سے رکھا جائے اور وہ جب بھی مطالبہ کرے اسے فوراً ادا کر دیا جائے۔ دیوان پوری پابندی کے ساتھ اس حکم کو نبھا رہا تھا۔

اب حویلی میں دادی اماں ہوتی یا پھر بی بی سائیں۔ چند ملازم عورتوں کے ساتھ حویلی میں رونقیں تو کیا ہونی تھیں۔ سناٹے مزید بڑھ گئے۔ دن رات کے کچھ حصے میں وہ دونوں مل پائیں۔ چند عام سی باتوں کے بعد وہ اپنی تنہا دنیا میں لوٹ جاتیں۔ اماں بی اب اپنے آپ میں سمٹ گئی تھیں۔ جبکہ بی بی سائیں کا وقت مریدین کے ساتھ گذر جاتا۔ جب سے شعیب نے انکار کیا تھا اس نے پلٹ کر دوبارہ اسے نہیں کہا۔ بلکہ اپنے چند مریدین کے ذمے لگایا کہ وہ ایک شاندار ادارہ بنائیں۔ اس کی بنیاد ڈال دی گئی تھی۔ اور وہ زور شور سے تعمیر ہو رہا تھا۔ وہ دن میں ایک بار اس ادارہ میں ہونے والے کام کے متعلق بات کرتی، کبھی کبھی زبیدہ پھوپھو آجاتی تو حویلی میں ذرا سی ہلچل ہوتی، پہلے پہلے فرح بھی آجاتی تھی۔ لیکن اب وہ اس حال میں تھی کہ ایک دو دن ہی میں اس کے ہاں مہمان کی آمد تھی۔ اماں بی کو اس کی بڑی فکر تھی۔ اس دن بھی جب وہ مل بیٹھیں تو دادی اماں نے ذکر چھیڑ دیا۔

''آج کل میں کوئی خبر آنے والی ہے۔ پتہ نہیں فرح بے چاری کس حال میں ہوگی۔ بس اتنی ڈھارس ہے کہ زبیدہ اس کے پاس ہے۔ سنبھال لے گی۔ مگر دل تو پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا نا۔۔''

''اماں بی۔! آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں، اسے یہاں لے آئیں۔ یا پھر آپ چلی جائیں اس کے پاس۔'' نادیہ نے اس قدر خلوص سے کہا کہ دادی اماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک وہ اس کے لہجے میں کسی دوسرے جذبے کو تلاش کرتی رہی لیکن نہ کر سکیں۔ بلکہ اس کے لہجے میں دردمندی کے ساتھ اپنوں کے لیے تڑپ بھی چھلک پڑی تھی۔

''میں تمہیں اکیلی چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ بس ایک شعیب ہی تو ہے جو نہیں مانتا۔ ورنہ اس حویلی میں بھی زندگی سانس لینے لگے۔'' ذرا سی ٹیس لگی تو دادی اماں کا پرانا زخم پھر سے تازہ ہو گیا۔

''اماں بی۔! اب میں اس پر تو کچھ نہیں کہہ پاؤں گی۔ آپ کم از کم فون کر کے ہی اس کے بارے میں معلومات لیتی رہیں۔ انہیں احساس تو ہو کہ ہم ان کے لیے فکر مند ہیں۔''

''چند دن پہلے فون کیا تھا، آج پھر کرتی ہوں۔ بلکہ میں کوشش کرتی ہوں کہ زبیدہ کو منا لوں کہ وہ فرح کو لے کر یہاں آ جائے۔ شعیب نہ بھی مانا تو میں خود اسے لینے چلی جاؤں گی۔'' اماں نے شدت جذب سے کہا۔ ان کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ جیسے دردمندی میں ابھی رو دیں گی۔

''اماں بی۔! آپ ان کا بہت خیال رکھیں۔۔'' بی بی سائیں نے کہا تو دادی اماں نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔ اس کے لہجے میں ہمدردی کے چراغ روشن تھے۔ اماں بی نے فون منگوایا اور فرح کے نمبر پش کر دیئے۔ کافی دیر تک بیل بجتی رہی لیکن فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ وہ پریشان ہو گئی کہ وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہی۔ اس نے چند لمحوں بعد کرنے کا سوچ کر بی بی سائیں سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''وہ فون ہی نہیں اٹھا رہی۔۔ اللہ خیر کرے۔۔'' لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے فون آ گیا۔ اماں بی نے فون ریسو کرتے ہوئے پوچھا۔

''فرح بیٹی، کیسی ہو۔۔۔؟''

''میں فرح نہیں۔ زبیدہ بات کر رہی ہوں۔ آپ دعا کریں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہم اسے لے کر یہاں ہسپتال میں آئے ہیں۔'' وہ گہرے غم زدہ لہجے میں بولی۔

''کیا ہوا اسے۔۔۔؟'' دادی اماں نے حیرت سے پوچھا۔

''طبیعت خاصی بگڑ گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے یہی تجویز کیا ہے کہ اسے آپریشن کے مرحلے سے گذرنا پڑے گا۔ اب آپ دعا کریں۔۔۔''

''کیا اسے آپریشن کے لیے لے کر چلے گئے ہیں۔۔۔'' اماں بی نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ آپریشن ضروری ہے لیکن فرح کی حالت ایسی نہیں ہے۔ بہت عجیب صورت حال کا سامنا ہے۔۔ اسے بہت زیادہ بلڈ پریشر ہو رہا ہے۔''

''اللہ خیر کرے۔۔'' اماں بی کے منہ سے نکلا پھر پوچھا۔ ''فرح سے بات تو کراؤ۔۔''

''اماں، اس کی حالت ایسی نہیں کہ بات کر سکے۔ اگر ٹھیک ہوگئی تو کرے گی۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے زبیدہ کا لہجہ بھرا گیا اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور فون بند کر دیا۔

بی بی سائیں کے چہرے پر تشویش ابھر آئی۔ صورت حال تو خاصی مخدوش تھی۔ اسے خود پر افسوس ہونے لگا کہ وہ رابطہ کیوں نہ کر رکھ سکی۔ یہ رابطہ ہی کی کوتاہی تھی کہ اسے فرح کی طبیعت بارے معلوم ہی نہ ہو سکا۔ اسے خود پر افسوس ہونے لگا۔ پھر کچھ دیر سوچ کر بولی۔

''اماں بی۔! آپ جائیں ہسپتال۔۔ اسے دیکھیں اور حوصلہ دیں۔۔ تاجاں مائی آپ کے ساتھ جاتی ہے۔ وہ مجھے صورت حال سے آگاہ کرتی رہے گی۔'' بی بی سائیں نے کہا اور اٹھ گئی۔ اماں بی تو جیسے اسی انتظار میں تھی۔ فوراً ہی تیار ہوگئی۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ وہ ہسپتال پہنچ گئی ہے۔

وہ جائے نماز پر بیٹھی فرح کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے جو اس کے بارے میں معلوم ہوا تو کتنا دکھ ہوا تھا اسے۔ ایک طرح سے وہ بھی اب اس جیسی ہوگئی ہوئی تھی، نہ باپ تھا اور نہ ماں۔۔۔

''لیکن اس کا ایک شوہر ہے اور محبت کرنے والی ماں کے جیسی ساس بھی۔۔۔ لیکن۔ تیرے پاس نہیں ہے۔ تم اسے اپنے ساتھ مت جوڑو۔۔ بلکہ رشک کرو اس کی قسمت پر اس کے چاہنے والے اس کے سر پر ہیں۔۔۔''

''ہاں۔! یہ اس کی قسمت ہے اور جو میری قسمت ہے۔۔ وہ مجھے مل گئی ہے۔۔۔ اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں''

''اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔!''

''یہ بھی تو اللہ کی مرضی ہے نا۔''

''اس کا بچہ کیا کرے گا۔ کون سنبھالے گا۔''

اس سوچ کے آتے ہی ایک ایسی سوچ اس کے دماغ میں سرسرائی کہ وہ بے چین ہوگئی۔

''کیا یہ قدرت کی طرف سے ایسے حالات بن رہے ہیں کہ فرح درمیان میں نہ رہے اور۔۔ میں۔۔۔'' یہ سوچتے ہی وہ لرز گئی۔

''نہیں۔! کسی کی زندگی۔۔ اور میری خوشی کے شادیانے۔۔ نہیں میرے مولا میں ایسا نہیں چاہتی۔۔۔ مجھے کس امتحان میں نہ ڈال میرے مولا۔۔۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ زار و قطار رونے لگی۔ پتہ نہیں کتنی دیر یونہی گذر گئی۔ تبھی تاجاں مائی کا فون آگیا۔

''ہاں تاجاں۔۔ بتاؤ۔ کیسی ہے فرح۔۔''

''اس کا تو پتہ نہیں۔ لیکن آپریشن کے بعد اللہ نے اسے بہت پیارا سا بیٹا دیا ہے۔۔''

''اچھا اور کیسا ہے۔۔'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بہت پیارا۔۔۔''

''اور فرح۔۔؟''

''ڈاکٹر اس کی زندگی سے اتنی امید نہیں رکھتے۔۔ اسے اب تک ہوش آجانا چاہئے تھا۔ لیکن نہیں آیا۔ ڈاکٹر بھی پریشان ہیں۔۔۔''

''جو کچھ بھی ہونا ہے۔۔میرے اللہ سائیں نے کرنا ہے۔تم پریشان نہ ہو۔تم وہیں رہنا۔جب تک اسے ہوش نہ آجائے۔۔۔اماں بی کو چاہے واپس بھیج دینا۔''

''جی۔۔!بی بی سائیں۔جیسا آپ کا حکم۔''

بی بی سائیں نے فون بند کر دیا۔ایک عجیب ہلچل سی اس کے من میں پھیل گئی تھی۔وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے جا لگی۔باہر کے منظر اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔وہاں اس کا دل نہیں لگا۔وہ پھر سے جائے نماز پر آن بیٹھی۔اور صدق دل سے دعا مانگنے لگی۔

ساری رات اسی طرح گذر گئی۔اماں بی واپس نہیں لوٹی تھی۔فرح کی حالت واقعتاً کچھ زیادہ ہی تشویش ناک ہوگئی تھی۔تاجاں مائی گاہے بگاہے اسے آگاہ کرتی رہی۔اس وقت صبح نور ہونے والی تھی کہ تاجاں مائی کا فون ملا فرح کی حالت خاصی بگڑ گئی تھی۔

''بی بی سائیں۔!فرح کا کوئی پتہ نہیں۔میرے خیال میں آپ ایک دفعہ ہسپتال کا چکر ضرور لگا جائیں۔ورنہ ساری زندگی۔۔۔''

''میں آتی ہوں۔۔''اس نے کہا اور فون رکھ دیا۔وہ سمجھ چکی تھی کہ تاجاں کیا کہنا چاہتی ہے۔کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے لیے مخصوص گاڑی میں اپنی ملازمہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہسپتال کی طرف جا رہی تھی۔ڈرائیور اور ان کے درمیان پردہ حائل تھا۔نجانے کن کن راستوں سے ہوتے ہوئے وہ کب ہسپتال جا پہنچے۔جس وقت وہ فرح کے کمرے میں گئی تو وہ نیم وا آنکھوں سے اس کی راہ تک رہی تھی۔۔ایک طرف بیڈ پر دادی اماں اور دوسری طرف زبیدہ پھوپھو تھیں۔قریب ہی کارٹ میں وہ ننھا مہمان تھا۔جس کے پاس تاجاں بیٹھی ہوئی تھی۔شعیب کہیں دکھائی نہیں دیا۔وہ فرح کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''حوصلہ کرو فرح۔۔تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔۔۔''

''نہیں۔۔ایسا نہیں ہے۔اچھا کیا تم آ گئیں۔۔۔میری بعد میرے بیٹے کی پرورش کرنا۔یہ تمہاری ذمے داری ہے۔۔۔اور شعیب۔۔۔''

''مایوسی کی باتیں مت کرو۔۔۔اچھا اچھا سوچو۔۔۔''

''ڈاکٹر ناامید ہو چکے ہیں۔۔چند سانسیں۔۔ہیں۔۔۔''

''اللہ کی رحمت سے انسان کو کبھی بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔۔۔''بی بی سائیں نے جیسے ہی یہ لفظ کہے،انہی لمحات میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔اجنبی نمبر تھے۔چند لوگوں کے علاوہ تو کسی کے پاس اس کا نمبر نہیں تھا۔اس نے اسکرین پر دیکھا اور پھر فون ریسو کر لیا۔

''میں شعیب بات کر رہا ہوں۔''شعیب نے آواز تو وہ لاکھوں آوازوں میں سے پہچان سکتی تھی۔

''جی۔!''اس نے انتہائی اختصار سے کہا۔

''میں اس وقت ہسپتال ہی میں ہوں۔۔اور کاریڈور میں اس لیے کھڑا ہوں کہ تم نے آنا ہے۔۔اب دیکھ لو اس کی حالت۔۔۔میں نے سنا ہے کہ تم جو بھی دعا کرتی ہو۔۔وہ پوری ہوتی ہے۔۔میں اپنے بیٹے کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا۔۔دعا کرو۔۔میری بیوی بچ

جائے۔۔۔''شعیب نے کہا تو نادیہ نے اگلے ہی لمحے کہا۔

''ایک شرط پر۔۔!''

''بولو۔!میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔''اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سنجیدگی سے کہا۔

''تمہارا بیٹا حویلی میں رہے گا۔اپنی ماں کے ساتھ۔۔''

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔۔''شعیب نے تڑپ کر کہا۔

''ابھی آپ نے کہا کہ آپ ہر شرط ماننے کو تیار ہیں اور اتنی سی بات پر تڑپ اٹھے۔۔۔دیکھو۔!زندگی اور موت تو اللہ سائیں نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے نا۔۔کیا کوئی ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔آپ نے اپنی انا پر ذرا سی ٹھیس نہیں آنے دی۔تو کیا رب تعالیٰ اپنے نظام میں مداخلت برداشت کر سکتا ہے۔میں پورے خلوص سے دعا گو ہوں۔۔کہ اللہ تعالیٰ فرح کو صحت دے۔۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔میرا بیٹا حویلی میں پرورش پائے گا۔میں مان لیتا ہوں۔لیکن فرح کے ساتھ۔۔یہی تم نے شرط عائد کی ہے نا۔۔۔میں اپنے گھر جا رہا ہوں تم ان سب کو حویلی لے جانا۔۔چاہے جیسی بھی حالت ہو۔۔''شعیب نے کہا۔

ایک بہت بڑا امتحان بی بی سائیں کے سر آ گیا تھا۔رات کے پہلے پہر جو خیال اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اگر فرح نہ رہے تو شعیب اس کا ہو سکتا ہے۔کس قدر خود غرضی تھی۔اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی کہ اب وہ یہ سوچ سکتی ہے۔لیکن انسان اپنی سوچ پر دسترس تو نہیں رکھ سکتا۔کوئی بھی خیال آ سکتا ہے۔اگرچہ اس نے اس خیال کو فوراً ہی جھٹک دیا تھا۔لیکن یقین کے آئینے پر ایک خراش ضرور ڈال گیا تھا۔اگر فرح اس دنیا میں نہ رہی تو وہ کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر پائے گی کہ وہ تو چاہتی ہی فرح کی موت تھی کہ وہ ہی ان کے درمیان رکاوٹ تھی۔اس نے ایک نگاہ فرح کی طرف دیکھا جو نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔فون کی سائیں سائیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''نہیں۔!آپ مت جاؤ۔۔بلکہ اللہ نے چاہا تو شام سے پہلے تندرست ہو جائے گی اگرچہ آپریشن کا زخم تو رہے گا۔وہ تو جاتے جاتے جائے گا۔لیکن فرح بھی خطرے سے باہر آ جائے گی۔تب آپ خود ہی انہیں لے کر حویلی آ جانا۔۔میں جا رہی ہوں۔۔۔''یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔پھر چند لمحے بیٹھ کر جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس پلٹ گئی۔اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا۔جب وہ حویلی میں داخل ہوئی۔

☆☆☆

شعیب کو یہ احساس تو تھا کہ جیسا وہ کہے گی،ویسا ہو جائے گا۔بی بی سائیں کی بات پر اسی رات اسے یقین ہو گیا۔شام ہونے سے پہلے ہی فرح کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی اور پھر رات جب لیڈی ڈاکٹر نے خصوصی طور پر آ کر اسے دیکھا تو اسے کسی بھی خطرے سے باہر قرار دیا۔اماں بی نے اسی وقت ڈاکٹر سے فرح کو ڈسچارج کر دینے کے لیے کہا۔

''اچھا ہے اگر ایک دو دن مزید یہاں رہیں،لیکن آپ کہتے ہیں تو لے جائیں۔ڈاکٹر نے اپنی رائے دی۔

''آپ کو دو وقت گاڑی لے آیا کرے گی،آپ ہی نے اسے دیکھنا ہے۔''زبیدہ نے کہا تو ڈاکٹر فوراً ہی مان گئی۔اسے معلوم تھا کہ یہ کس

فیملی سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سب حویلی کی طرف چل دیئے تھے۔ شعیب انہیں خود لے کر گیا تھا۔

فرح کے لیے جو کمرہ مختص کیا گیا تھا۔ اس میں جہاں فرح کے لیے ہر طرح کی سہولیات کا خیال تھا، وہاں ننھے مہمان کے لیے بھی پورا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک دن کے بچے نے کھلونوں سے کیا کھیلنا تھا لیکن وہاں پر ایک کونا پوری طرح سجا ہوا تھا۔ اس کمرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہی شعیب کو یوں لگا جیسے نادیہ کو پورا یقین ہو کہ وہ یہیں آئیں گے۔ وہ کچھ دیر وہاں رہا۔ پھر واپس پلٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

''اب تم کہاں جاؤ گے۔ یہیں رہو'' اماں بی نے حیرت سے کہا۔

''نہیں، میرا بی بی سائیں سے وعدہ تھا کہ انہیں خود لے کر آؤں گا، وہ میں لے آیا۔ اب میں اپنے گھر جاتا ہوں۔ روزانہ انہیں دیکھنے کے لیے آجایا کروں گا۔''

''یہاں رہنے میں آخر تمہیں رکاوٹ کیا ہے۔۔۔ کیوں نہیں ٹھہرتے تم یہاں۔۔'' اماں بی نے پھر پوچھا۔ ان کے لہجے میں غصہ ملی حیرت جھلک رہی تھی۔ تبھی اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''رکاوٹ۔۔۔ بی بی سائیں ہیں۔۔ ایک ہی چھت تلے دو نامحرم نہیں رہ سکتے۔۔'' شعیب نے کہا اور جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اس نے ایک نگاہ فرح پر ڈالی جو اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اپنے بیٹے کو پیار کیا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ ایک بہت بڑا بوجھ اس کے ذہن سے اتر گیا تھا۔ وہ ایک پرسکون نیند لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ پہنچا، فریش ہوا اور کھانا کھا کر سو گیا۔ بہت دنوں بعد وہ ایسی پرسکون نیند ہو یا تھا۔

☆☆☆
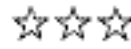
بی بی سائیں کے لیے وہ رات کسی امتحان سے کم نہیں تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ شعیب چلا گیا ہے تو وہ فرح کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں دادی اماں اور زبیدہ پھوپھو موجود تھیں۔ وہ کچھ دیر فرح کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ تبھی تاجاں مائی نے بچے کو اچھی طرح لپیٹ کر اس کی گود میں دے دیا۔ جیسے ہی وہ اس کی گود میں آیا تو بی بی سائیں نے اندر سے کہیں ایک لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ وہ لہر نجانے کیا تھی۔ اس کی اسے بھی سمجھ نہیں آئی۔ لیکن بے چین کر دینے والی اس لہر نے اس کے عورت پن کو یوں چھوا کہ پوری جان سے لرزا کر رکھ دیا۔ اسے بچے پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس کے پھول جیسے گالوں کو جب اسنے اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا تو اسے یوں لگا جیسے وہ زندگی کو چھو رہی ہے۔ ایک انجانی حرارت اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی۔ جس نے اسے بے حال کر کے رکھ دیا۔ انہی لمحات میں دادی اماں نے کہا۔

''شعیب نے اپنی بات پوری کی اور یہاں تک انہیں چھوڑ گیا۔ کہہ گیا ہے کہ وہ روزانہ آجایا کرے گا۔''

''اگر یہیں رہ لیتے تو زیادہ اچھا تھا'' بی بی سائیں نے ہولے سے کہا۔

''جاتے جاتے وہ ایک بات کہہ گیا ہے۔۔۔ کہ وہ کیوں یہاں نہیں رہنا چاہتا'' اماں بی نے یوں کہا جیسے وہ اس سے کوئی حتمی بات کہنے جا رہی ہو۔

''کیا بات کہہ گئے ہیں وہ۔۔ کس وجہ سے وہ یہاں نہیں رہنا چاہتے۔'' اس نے یوں پوچھا جیسے وہ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ رہی ہو کہ چلو

برف تو پگھلی، دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائے گا۔

''وہ وجہ تم ہو بی بی سائیں۔۔اس نے کہا ہے کہ شریعت ایک ہی چھت تلے رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔''

یہ ایک دھماکہ تھا جو اس کے اندر ہوا۔مگر اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔وہ کچھ نہ بولی،سمجھ گئی کہ اگر وہ اس سے پردہ کرتی ہے،اس کے سامنے نہیں آتی تو اسے بھی ایسی بات کہنے کا پورا پورا حق ہے اور وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

''میرے خیال میں اس نے غلط نہیں کہا۔''زبیدہ پھوپھو نے تیزی سے شعیب کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔!اس نے غلط نہیں کہا۔وہ درست ہے۔۔ہمیں یہ بات پہلے ہی سمجھ جانی چاہیے تھی۔''بی بی سائیں نے اپنی پوروں سے بچے کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔تمہید ادی اماں نے کہا۔

''اگر تم چاہو۔!تو شعیب آزادی سے یہاں رہ سکتا ہے۔۔''

اماں کے یوں کہنے پر بی بی سائیں نے تیزی سے فرح کے چہرے پر دیکھا۔اس کے خیال میں یہی تھا کہ وہاں ملال اور دکھ کی پرچھائیاں ہوں گی۔لیکن وہ مسکرا کر بڑے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔فرح نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''انکار مت کرنا۔۔تمہارے ہاں مجھے حوصلہ دے گی اور میں اپنے شوہر کو منانے میں پورے اعتماد سے بات کر سکوں گی۔۔حویلی کی ضرورت اپنی جگہ،لیکن نکاح سنت بھی تو ہے نا۔۔۔اسے اپنا لو۔۔''

''کیا مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیا جائے گا۔۔۔''بی بی سائیں نے آہستگی سے کہا۔

''صرف آج کی رات۔۔۔''اماں بی نے یوں کہا جیسے حکم دے رہی ہو۔

''ٹھیک ہے۔۔''اس نے بچے کو تاجاں کی طرف بڑھایا اور خود اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی۔۔رات بھر وہ سوچتی رہی۔زندگی ایک بار پھر اس کے لیے خوشیاں لے کر آ گئی تھی۔اس یہ اس کے ہاتھ میں تھا کہ بڑھ کر خوشیاں سمیٹ لے یا پھر ان سے منہ موڑ لے۔۔اور شاید یہ آخری موقع تھا۔اور شاید زندگی پھر اسے کبھی ایسا موقعہ نہ دے۔۔ایسا کڑا امتحان جب بھی اس پر آیا۔وہ سوچتی تو تھی لیکن اپنا فیصلہ رب کے سپرد بھی کیا کرتی تھی۔رات کے پچھلے پہر جب وہ تہجد کے لیے اٹھی تو اسے فیصلے کا جواب مل چکا تھا۔یہ اس کا اپنا فیصلہ نہیں تھا،بلکہ اس پر انہوں نے بھی صاد کر دیا تھا ،جہاں سے اسے ہر طرح کی قوت میسر تھی۔صبح جب سورج طلوع ہوا تو اس نے اپنے فیصلے سے دادی اماں کو آگاہ کر دیا۔

☆☆☆

حویلی میں شعیب کے لیے ایک شاندار کمرہ مختص کر دیا گیا تھا۔جس کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کا انگ انگ خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ایک طرف جہاں بہت سارے معاملات سلجھ جانے کی خوشی تھی تو دوسری جانب اس آواز کو مجسم دیکھنے کا تجسس اپنے پورے عروج پر تھا۔جس نے اس کے اندر محبت کی جوت جگائی تھی۔دوپہر کے بعد اس کا نکاح نادیہ سے ہو گیا تھا۔اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح مریدین میں پھیل گئی تھی۔دوپہر سے لے کر اب سے تھوڑی دیر قبل تک وہ بہت مصروف رہا تھا۔کچھ دیر پہلے اسے تنہائی میسر آئی تھی۔اس تھوڑے سے وقت میں پہلی کال سے لے کر اب

تک کے سارے واقعات اس کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ زندگی نے اسے سب کچھ دے دیا تھا۔لیکن ایک طویل صبر کے بعد۔اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی بیڈ پر نادیہ سرخ عروسی جوڑے میں گٹھڑی ہی بیٹھی تھی۔اسے خیال آیا،فرح بی بی بھی ایسے ہی بیٹھی تھی۔اسے بھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔لیکن تب اس کے جذبات کچھ اور تھے اور یہاں کچھ اور۔۔ایک اشتیاق تھا جو اسے دھیرے دھیرے لرزائے ہوئے تھا۔وہ اس کے پاس جا بیٹھا تو نادیہ کچھ مزید سمٹ گئی۔اس نے چند لمحے اسے دیکھا اور پھر جیب میں سے کنگن نکال کر اپنے گورے ہاتھ میں پکڑ لیا۔کنگن پہناتے ہوئے اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ نادیہ بھی لرز رہی ہے۔پھر وہ لمحہ بھی آ گیا اس نے دھیرے سے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو چند لمحے کے لیے مبہوت ہو کر رہ گیا۔اس قدر خوبصورت ہے نادیہ۔۔۔؟ وہ تو اس کی سوچوں سے بھی زیادہ حسین نکلی۔۔۔وہ آنکھیں بند کیئے ہوئے تھی۔اور اس کے پپوٹے ہلکے ہلکے لرز رہے تھے۔تبھی اس نے آہستگی سے کہا

''آج آواز میرے سامنے مجسم ہو گئی۔۔بلاشبہ تم آواز سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔۔''اس کے یوں کہنے پر نادیہ نے آنکھیں کھول دیں۔اسے بس ایک لمحہ کو دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

''آواز سے مجسم ہو جانے کا سفر بہت صبر آزما رہا۔۔۔تم کیسا محسوس کر رہی ہو۔۔؟''

''وہی جو ایک عورت محسوس کرتی ہے۔۔۔''اس نے ہولے سے کہا۔

''نادیہ!زندگی نے جس طرح طویل راستے طے کرنے کے بعد ہمیں آپس میں ملایا ہے۔بلاشبہ اس مسافت نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ہم نے کھویا کچھ نہیں۔تمہارا بی بی سائیں کا اسٹیٹس ویسا ہی رہے گا۔۔میں اس میں قطعاً مداخلت نہیں کروں گا۔''

''آپ کا بہت شکریہ۔۔آپ نے میرا اعتماد بڑھا دیا۔میری تمام تر سپردگی آپ کے لیے ہے۔میرا بی بی سائیں ہونا اپنی جگہ۔۔۔میں آپ کی بیوی بھی ہوں۔۔آپ کا ہر حکم ماننا میرا فرض ہے۔''

''آؤ!دو رکعت نماز شکرانہ ادا کریں۔باقی زندگی تو اب ہماری دسترس میں آ ہی چکی ہے۔۔''شعیب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو نادیہ کو یوں لگا جیسے واقعتاً زندگی اب اس کی دسترس میں آ چکی ہے۔اس کی چاہ میں جو مسافتیں تھی۔اب نجانے کہاں تھیں۔منزل مل جانے کا سکون وہ محسوس کر رہی تھی۔۔یہ محبت ہی تو تھی جس نے آخر انہیں جیت لیا۔

ختم شد